کتابیں ہیں چمن اپنا

بشکریہ جناب خلیل احمد رانا صاحب

پیشکش:۔ محمد احمد ترازی

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس
کراچی

کتابیں ہیں چمن اپنا

عبدالمجید قریشی

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس
ناظم آباد، کراچی

نام کتاب ——— کتابیں ہیں چمن اپنا
مصنّف ——— عبد المجید قریشی
ناشر ——— ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ناظم آباد، کراچی
طابع ——— فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، کراچی
اشاعت ——— اوّل
کتابت ——— ظہور تابش ملتان
سالِ اشاعت ——— ۱۹۹۲ء
تعدادِ اشاعت ——— ایک ہزار
صفحات ——— ۲۷۲
قیمت ———

اِنتساب

خُدائے قدوس و کریم کی عظیم و جلیل کتاب

القرآنُ الحکیمُ کے نام

اِس کتاب میں

اِنتساب صفحہ ۳

پیش لفظ صفحہ ۵

ایک خوب صورت شعر صفحہ ۷

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	کتابیں ہیں چمن اپنا	۸
۲	کتاب اور مَیں	۲۸
۳	کتابوں کے تعاقب میں	۳۹
۴	داستان اِک بے وفا کی	۵۰
۵	مَیں اور میرا کتب خانہ	۷۰
۶	بِن کِھلے مُرجھا گئے	۹۰
۷	کتابیں اور قید خانے	۱۰۸
۸	جلوہ ہائے رنگ رنگ	۱۲۶
۹	مَن آنم کہ مَن دانم	۱۵۵
۱۰	ذکرِ علی گڑھ اُردو ادب میں	۱۸۷
۱۱	کتب خانوں کی سیر	۲۲۱
۱۲	تحریکِ پاکستان کتابوں کی دُنیا میں	۲۳۹

پیش لفظ

"کتابیں ہیں چمن اپنا" میرے اُن بارہ مضامین کا مجموعہ ہے جو ماضیٔ قریب میں ہمارے ملک کے بعض مقتدر رسائل میں شائع ہوئے اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھے گئے۔ اب اِن تمام مضامین کو مناسب ترامیم اور اضافوں کے بعد اِس مجموعے کی شکل میں دوبارہ پیش کیا جا رہا ہے۔ جیسا کہ اِس مجموعے کے عنوان سے ظاہر ہے، اِن تمام مضامین کا موضوع صرف اور صرف کتابیں ہیں جن کا مختلف حیثیتوں سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ موضوع نسبتاً خشک ہے تاہم مَیں نے پوری پوری کوشش کی ہے کہ یہ محض خشک ہی نہ رہے، بلکہ اِس میں "تری" کی بھی خاطر خواہ آمیزش ہو جائے اور قاری اسے باآسانی "ہضم" کر سکے۔ میرا یہ نسخہ خاصا کامیاب رہا، کیوں کہ ان میں سے بعض مضامین نے نہ صرف ڈائجسٹوں میں جگہ پائی، بلکہ وہاں دل چسپی کے ساتھ پڑھے بھی گئے۔

"کتابیں ہیں چمن اپنا" کا پہلا مضمون اسی عنوان سے ہے جس میں کتابوں کے متعلق برِصغیر کے مشاہیر علما، ادبا اور دیگر اہلِ قلم حضرات کے پُرلطف تاثرات و احساسات پر گفتگو کی گئی ہے۔ دوسرے مضمون "کتاب اور مَیں" میں کتابوں سے اپنے تعلقِ خاطر کو ظاہر کیا گیا ہے۔ تیسرا مضمون "کتابوں کے تعاقب میں" ہے جو دو اہم کتابوں کی تلاش و کاوش اور اُن کی اشاعت کی داستانِ شوق پر مبنی ہے۔ اس مجموعے کا چوتھا مضمون ہے "داستان اک بے وفا کی" جو میری نہایت محبوب کتاب "دربارِ دربار" کے مصنف اور ہندستان کے مشہور شاعر حضرت صدق جائسی سے میری طویل مراسلت پر مشتمل ہے۔ دیکھیے، مَیں نے اُن کو بے وفا غلط تو نہیں کہا۔ میرا اگلا مضمون "میں اور میرا کتب خانہ" ہے جس میں اپنے ذوقِ کتب اندوزی کی جھلکیاں پیش کی گئی ہیں۔ مضمون "بن کھلے مرجھا گئے" کا موضوع وہ پچاس، ساٹھ کتابیں ہیں، جن کے متعلق مَیں

نے کبھی پڑھا یا کہیں سُنا کہ وہ جلد ہی شائع ہو رہی ہیں، لیکن پھر زمانے کی رفتار بیس بیس اور تیس تیس برسوں پر محیط ہوتی چلی گئی اور وہ شائع نہ ہو سکیں۔" کتابیں اور قید خانے" میں اُن کتابوں کا مفصل تذکرہ موجود ہے جو ہمارے قید خانوں میں لکھی گئیں یا قید خانوں کے بارے میں تحریر کی گئیں۔" جلوہ ہائے رنگ رنگ" میں اُردو زبان میں سفرناموں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے اور چند دل چسپ سفرناموں کے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں۔" من آنم کہ من دانم" اُردو آپ بیتیوں کے متعلق ہے۔ آپ بیتیوں کے تفصیلی جائزے کے ساتھ ساتھ آپ اس میں چند مشہور آپ بیتیوں کے پُرلطف حصے بھی ملاحظہ فرما سکیں گے۔" ذکرِ علی گڑھ اردو ادب میں" کا موضوع عنوان سے ظاہر ہے۔ اس مضمون میں بابائے علی گڑھ سر سیّد احمد خاں، جسٹس سیّد محمود، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک اور بہت سے دوسرے علیگ مشاہیر پر شائع ہونے والی کتابوں پر نظر ڈالی گئی ہے۔" کتب خانوں کی سیر" میں برِصغیر، انگلستان اور امریکا کے چند اہم کتب خانوں کا دل چسپ انداز میں تعارف کرایا گیا ہے۔ اس مجموعے کا آخری مضمون "تحریکِ پاکستان کتابوں کی دُنیا میں" ہے جس میں تحریکِ پاکستان کے پس منظر کے ساتھ ساتھ کوئی دو سو، سوا دو سو کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے جو تحریکِ پاکستان کے متعلق اُردو اور انگریزی زبانوں میں پاکستان، ہندستان اور انگلستان میں موقع بہ موقع شائع ہوئیں۔

میں محترم حکیم محمد سعید صاحب کا بے حد ممنون ہوں کہ موصوف نے بھی میرے ان مضامین کو پسند فرمایا اور اپنے موقر ادارے" ہمدرد فاونڈیشن پریس" کے زیرِ اہتمام انھیں کتابی شکل دے کر میری حوصلہ افزائی فرمائی۔

طارق آباد کالونی۔ ملتان

عبد المجید قریشی

ایک خوب صُورت شعر

سیاحت کا جنھیں ہے شوق پھرتے ہیں وہ شہروں میں
کُتُب بینی ہے سَیر اپنی، کتابیں ہَیں چمن اپنا

کتابیں ہیں چمن اپنا

کتابوں کے متعلق عُلما، اُدبا اور دیگر اہلِ قلم حضرات کے تاثّرات

صاحبِ خانہ معزز مہمان کو اپنی نوتعمیر قیام گاہ کے مختلف حصّوں کی سیر کراتے ہوئے اب کتب خانے میں پہنچتے ہیں اور فرماتے ہیں' یہ میرا کتب خانہ ہے'۔

"خوب! معلوم ہوتا ہے آپ کو مطالعۂ کتب سے خاص دل چسپی ہے" مہمان نے کتابوں کی الماریوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں! کچھ ایسا ہی سمجھیے" میزبان نے جواب دیا" مگر یہ تمام کتابیں جو آپ کے سامنے اِن الماریوں میں بند ہیں دراصل میرے احباب کی ملکیت ہیں جنھیں مَیں مطالعے کی غرض سے اُن سے گاہ بگاہ مستعار لاتا رہا اور پھر انھیں لوٹنا نصیب نہ ہوا"۔

" اوہ مَیں سمجھا، مگر آپ نے اپنے مذاق کے مطابق کچھ کتابیں تو ضرور خریدی ہوں گی"۔ مہمان نے پوچھا۔

" یقیناً" ! مگر وہ سب اب میرے دوستوں کے کتب خانوں کی زینت ہیں"۔ میزبان نے کہا اور مہمان مسکرا دیا۔

کتابوں کی چوری جائز ہے!

ہر چند کہ یہ لطیفہ غیر ملکی ہے تاہم اس لطیفے میں چھپے ہوئے طنز کے پیشِ نظر اگر ہمارے ملک کے کتب خانوں کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو نتیجہ یہی برآمد ہوگا کہ کتب خانے چاہے کہیں بھی ہوں اُن کے حالات کم و بیش یکساں ہی ہوتے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہیئے کہ کتابوں کی دانستہ یا نادانستہ چوری کا مسئلہ کسی خاص ملک یا خاص زمانے سے متعلق نہیں، بلکہ شائقین کتب ہر ملک اور ہر زمانے میں یہ "کارِ خیر" انجام دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ عام شکایت ہے کہ ملک کے مختلف کتب خانوں اور لائبریوں سے کڑی نگہداشت کے باوجود ہر سال سینکڑوں کی تعداد میں کتابیں چرالی جاتی ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے معاشرے میں اور چیزوں کی چوری کو تو چوری سمجھا جاتا ہے لیکن کتابوں کی چوری کو چوری نہیں سمجھا جاتا اور بڑے بڑے ثقہ حضرات اس معاملے میں سینہ زوری پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی کتابیں دیکھتے دیکھتے اُچک لیتے ہیں اور پھر کمال ڈھٹائی سے اُنھیں ہڑپ کر جاتے ہیں۔ ہمارے موجودہ معاشرے کی اخلاقی حالت لاکھ بُری سہی، اور دیانت اور امانت کے فقدان کی جس قدر شکایت کی جائے بجا، لیکن آج سے پچاس، ساٹھ یا سو سال پہلے کا زمانہ جسے آج اخلاقی لحاظ سے ایک مثالی دور کہا جاتا ہے اس قسم کی خامیوں اور کوتاہیوں سے مبرّا نظر نہیں آتا۔ چناں چہ اس قسم کی روایات اب پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے دورِ ابتلا میں اُمرا اور عُلما کے بڑے بڑے کتب خانوں کو لُوٹنے والوں میں وہ طالب علم حضرات بھی شامل تھے جو اس زمانے میں تعلیم و تدریس کی راہیں طے کر رہے تھے۔

بابائے کتب خانہ مولوی خدا بخش

خان بہادر مولوی خدا بخش مرحوم نے پٹنے میں "خدا بخش اورینٹل لائبریری" جیسے عظیم الشان کتب خانے کی بنا ڈالی جس کا شمار برِّصغیر پاک و ہند کے تین اہم ترین کتب خانوں میں ہوتا ہے۔ اُنھوں نے اپنی تمام زندگی ایک متقی اور راست باز انسان کی حیثیت سے گزاری، وکالت بھی کی اور جج بھی رہے، ہمیشہ دیانت، امانت اور صداقت کو اپنا شعار بنائے رکھا، لیکن جہاں تک کتابیں حاصل کرنے کا تعلق ہے، اُنھوں نے ہر طریقہ خواہ وہ اخلاقاً کتنا ہی معیوب کیوں نہ تھا اپنے لیے روا رکھا۔ چناں چہ یہ مشہور واقعہ ہے کہ اِنھی مولوی خدا بخش کو ایک نایاب

قلمی کتاب کی شدید ضرورت لاحق تھی۔ اُن کے ملنے والوں میں ایک صاحب کے پاس مطلوبہ کتاب موجود تھی لیکن وہ اس کی قدر و منزلت سے واقف نہ تھے۔ صرف اس لیے کہ یہ ایک بہت پُرانا خاندانی قلمی نسخہ ہے اور اس کی جلد خوب صورت ہے، وہ کسی قیمت پر بھی اسے فروخت کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے۔ مولوی صاحب بھی اس کتاب کے خریداروں میں تھے لیکن ناکام رہے۔ کوئی چارۂ کار نہ پاکر آخر کار انھوں نے اِن صاحب سے کتاب مستعار دینے پر اصرار کیا اور کتاب حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اب اُنھوں نے یہ کیا کہ اس نسخے کو جلد سے علاحدہ کرکے اپنے پاس رکھ لیا اور کچھ دنوں بعد اسی تقطیع اور ضخامت کا ایک معمولی مخطوطہ اس کی جلد میں بندھوا کر اُن صاحب کے حوالے کر دیا۔ اُن صاحب کو مولوی صاحب کی اس حرکت کی بالکل خبر نہ ہوئی اور اُن کی کتاب بڑے مزے سے مولوی خدا بخش صاحب کے کتب خانے میں داخل ہوگئی۔

خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ کے متعلق انگریزی کتاب **AN EASTERN LIBRARY** (ایک مشرقی کتب خانہ) کے مصنف مسٹر اسکاٹ او کنز اپنی اس کتاب میں مولوی خدا بخش مرحوم سے اپنی ملاقات کا حال یوں تحریر فرماتے ہیں:

"ایک بار جب میں نے ہچکچاتے ہوئے اُن ذرائع کے متعلق اُن سے دریافت کیا جن سے اُنھوں نے یہ کتابیں حاصل کی تھیں تو وہ مسکرا کر میری طرف دیکھنے لگے۔ اس وقت اُن کی آنکھوں میں ایک دل فریب چمک پیدا ہوگئی۔ اُنھوں نے فرمایا کہ نادر و نایاب چیزوں کے جمع کرنے کا فن ہر پابندی سے مستثنیٰ اور فوج داری قانون سے بالا ہے۔ اُنھوں نے اپنی گفتگو کو یہ کہہ کر ختم کیا کہ "اندھے تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کی بصارت زائل ہوجاتی ہے۔ دوسرے وہ جو آنکھیں رکھنے کے باوجود اپنی کوئی بیش قیمت کتاب کسی دوست یا واقفِ کار کو مطالعے کے لیے مستعار دے دیتے ہیں اور تیسرے اندھے وہ لوگ ہیں جو ایک بار ایسی کتابوں پر قبضہ پالینے کے بعد اُنھیں واپس بھی کر دیتے ہیں۔"

مولوی خدا بخش کو اپنی کتابوں سے بڑی گہری محبت تھی۔ ایک بار برٹش میوزیم نے ان کتابوں کو خریدنے کے لیے ایک بیش بہا رقم مولوی خدا بخش کو پیش کی، لیکن انھوں نے بہ کمال استغنیٰ اس پیش کش کو ٹھکرا دیا اور فرمایا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں ایک غریب آدمی ہوں، لیکن کیا میں صرف دولت کی خاطر اپنے اس علمی سرمائے سے دست بردار ہو جاؤں۔ جب وہ یہ باتیں کر رہے تھے تو اُن کا چہرہ طمانیت و مسرّت کے وفور سے تمتما رہا تھا۔

مولوی خدا بخش نے ایک رات خواب دیکھا کہ اُن کے کتب خانے کے برابر والی گلی میں لوگوں کا ہجوم ہے۔ لوگوں نے اُنھیں دیکھا تو چلانے لگے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم تمہارے کتب خانے کی سیر کے لیے تشریف لائے ہیں، تم کہاں ہو؟" یہ سُن کر وہ اس کمرے کی طرف دوڑے جہاں قلمی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ اُس وقت تک رسول اللہ تشریف لے جا چکے تھے، لیکن یہاں حدیث کی دو کتابیں میز پر کھلی رکھی تھیں لوگوں نے بتایا کہ اِن دونوں قلمی نسخوں کو حضورؐ ملاحظہ فرما رہے تھے۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کا کتب خانہ

خان بہادر مولوی خدا بخش کے برعکس نوّاب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی مرحوم و مغفور اپنے مضمون "کتب خانۂ حبیب گنج کیسے جمع ہوا" میں رقم طراز ہیں کہ "میرا یہ مختصر کتب خانہ نصف صدی سے زیادہ عرصے کی تلاش کا سرمایہ ہے۔ الحمدللہ اس میں ایک بھی نسخہ سرقے یا ناجائز ذریعے کا حاصل کیا ہوا نہیں ہے، بلکہ ایسا ہوا ہے کہ کسی تاجرِ کتب نے ناواقفیت سے کم قیمت مانگی اور میں نے زیادہ دام دے دیے۔ نوّاب صدر یار جنگ کے کتب خانے کی مہر دورِ عباسی کے مشہور عربی شاعر متنبّی کے مصرعے "وَخَیْرُ جَلِیْسٍ فِی الزَّمانِ کِتابٌ" (اور کتاب زمانے میں انسان کا بہترین رفیق ہے) پر مشتمل تھی۔ متنبّی کتابوں کا عاشق زار تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ کتاب میری محبوبہ ہے۔ کیا کوئی شخص اپنی محبوبہ کسی کو مستعار دے سکتا ہے؟

پھر میں اپنی محبوبہ کسی کو مستعار کیوں دوں ؟

مولانا حسرت موہانی کے کتب خانے کا نیلام

۱۹۰۸ء میں مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی پر بغاوت کے جرم میں مقدمہ چلا اور دو سال قید با مشقت اور پانچ سو روپے جرمانے کی سزا ملی۔ حسرت جیسے درویش کے پاس اتنی رقم کہاں تھی کہ وہ پانچ سو روپے جرمانہ ادا کرتے۔ چناں چہ ان کی بیش بہا اور نادر و نایاب کتابوں کو جنھیں انھوں نے بڑی محنت اور کاوش سے جمع کیا تھا صرف ساٹھ روپے میں حکومت کی جانب سے نیلام کر دیا گیا۔ اس رنج دہ واقعے پر مولانا حسرت نے لکھا کہ "اس جرمانے کی بدولت کتب خانہ اردوئے معلیٰ کی جو حالت ہوئی اس کا بیان نہایت دردناک ہے۔ جن کتابوں کو راقم الحروف نے معلوم نہیں کن کن کوششوں اور دقتوں سے بہم پہنچایا تھا جن کتابوں میں بہت سے ایسے نایاب قلمی نسخے دواوین قدیم شعرا وغیرہ کے تھے کہ جن کی نقل بھی کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتی تھی ان سب کو پولیس کے جاہل جوان ٹھیلوں میں اس طرح بھر کر لے گئے جس طرح لوگ لکڑی اور بھس لے جاتے ہیں۔ ان کی فہرست بنانا تو درکنار کسی نے ان کو شمار تک نہ کیا۔ اس کے بعد ان کتابوں پر کیا گزری اس کا ذکر کرتے ہوئے ہمارا دل دکھتا ہے اس لیے اس سے قطع نظر ہی مناسب ہے۔ اس جبر و ظلم کا انصاف خدا کے ہاتھ ہے"۔

مسیح الملک حکیم اجمل خاں: ایک طالبِ علم

حکیم ذکی احمد دہلوی مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب کے متعلق اپنے مضمون میں رقم طراز ہیں کہ "تمام عمر ان کی زندگی ایک طالب علم کی زندگی رہی۔ اگر دنیا میں کسی چیز کو ان کا قلبی اور فطری ذوق کہا جا سکتا ہے تو وہ کتب بینی تھی۔ رام پور کا ریاستی کتب خانہ، پٹنے کی خدابخش لائبریری اور اپنے خاندانی کتب خانے کو انھوں نے کھنگال ڈالا تھا۔ برٹش میوزیم لندن اور قسطنطنیہ کے کتب خانوں سے بعض نادر

کتابیں فوٹو کرا کر اُنھوں نے حاصل کی تھیں پھر کتابوں کو وہ پڑھتے ہی نہیں تھے۔ بلکہ اُن میں خود جذب ہوتے اور اُنھیں اپنے اندر جذب کرتے۔ بہت سی کتابیں جو اُنھوں نے پڑھی تھیں اُن کے حاشیوں پر اُن کے لکھے ہوئے نوٹ نظر آتے ہیں بعض مصنّفوں سے کسی بات میں اختلاف ہوتا تو اُسے بھی آزادی سے ظاہر کر دیا کرتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا ذوقِ مطالعہ

مولانا ابوالکلام آزاد اپنی زندگی کے ابتدائی ایام میں سرسید سے بڑے متاثر تھے۔ وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ "ہر وہ چیز جو اُن (سرسید) کی طرف منسوب ہو میرے قلب و ذہن کے لئے بمنزلہ معبود کے تھی"۔ انھی ایام میں سرسید کی سوانح حیات "حیاتِ جاوید" چھپ رہی تھی اور مولانا اس کے حصول کے لیے بہت بے تاب تھے۔ اُن کی اس بے تابی اور بے چینی کا اندازہ لگانے کے لیے یہ سطریں ملاحظہ فرمائیے۔

"رحمت اللہ رعد (مالک نامی پریس کان پور) کی جنتری میں "حیاتِ جاوید" کے قریب الاختتام ہونے کا ذکر چھپا تھا یہ غالباً ۱۹۰۰ء کی بات ہے میں کہہ نہیں سکتا کہ اس کتاب کی اشاعت کا کیسا سخت اور جان کاہ انتظار مجھ میں پیدا ہو گیا تھا کم سے کم دو تین جوابی خط ہر مہینے "نامی پریس" کان پور کو لکھتا تھا کہ کس قدر حصّہ باقی ہے اس سے پہلے "الفاروق" کے لئے بھی میں نے اسی پریس کو خطوط لکھے تھے اور مجھے بڑی ہنسی آئی جب برسوں کے بعد منشی رحمت اللہ نے ان خطوط کی عبارت یاد دلائی۔ اُدھر کتاب کے ناشر ڈیوٹی شاپ علی گڑھ کو میں نے پیشتر سے خط لکھ دیا تھا کہ کتاب شائع ہوتے ہی میرے نام وی پی بھیج دیں۔ پھر کھٹکا ہوا کہ کہیں وہ تاجرانہ اصول پر احتیاطاً منظوری کی تجدید نہ کرنا چاہیں اس طرح ایک ہفتے کی دیر اور ہو جائے گی۔ پھر اُنھیں ایک اور خط لکھا اور اُس میں صراحت کر دی کہ بلا کسی اطلاع کے وی پی بھیجیں لیکن باایں ہم معلوم ہوتا ہے کہ اس کے منیجر کو بھی میرا شوق دیکھ کر ستم ظریفی سوجھی تھی ایک دن اُن کا کارڈ ملا کہ "حیاتِ جاوید" چھپ کر آ گئی ہے۔ آپ کی درخواست درج رجسٹر ہے۔

اگر مطلوب ہو تو بھیج دی جائے۔" میں اس غم و غصہ کو کیوں کر بیان کروں جو اُس
دن مجھ پر طاری ہوا۔ اگر کوئی ذریعہ بھی ایسا ہوتا کہ مجھے دن کی تاخیر کی جگہ ایک دن
کے اندر علی گڑھ سے کتاب مجھے پہنچا دی جائے تو میں اپنے آپ کو بیچ کر بھی اسے
حاصل کرتا۔ بہرحال یہ سوچ کر کہ تاخیر میں کم از کم تین دن کی تو تخفیف ہو جائے،
تار لکھوایا اور بھیج دیا۔ آخر کار چار دن کے بعد پارسل آیا۔ پوسٹ مین کی صورت، اُس
کے کاندھے کا بوجھل تھیلا اور اس کے ہاتھ میں لٹکے ہوئے پارسل اُس زمانے میں
میری آنکھوں کے لیے دنیا کے سب سے زیادہ حسین منظر تھے۔ کلکتے میں چٹھی رسانوں
کی یونی فارم خاکی رنگ کی ہوتی ہے۔ سر پر خاکی پگڑی ہوتی ہے۔ یہ مجھے خواب میں
بھی نظر آتا اور اس پوشش میں کچھ عجیب کشش میرے لیے پیدا ہو گئی تھی۔ ڈاک عموماً صبح
کو ملتی جس میں پارسل کی روانگی کی اطلاع ہوتی تھی۔ پارسل یا تو اسی دوپہر کو آجاتا یا
دوسرے دن، میں اپنا مطالعہ لے کر دوپہر کے وقت نیچے کے کمرے میں یا باہر ایک
تخت پر بیٹھا کرتا محض اس انتظار میں کہ پوسٹ مین کے آنے پر بلا کسی ایک لمحے
کی تاخیر کے اس کا استقبال کر سکوں۔ خوش قسمتی سے "حیاتِ جاوید" کے لیے دوسرے
دن کا انتظار نہ کرنا پڑا۔ پارسل جب ہاتھ میں آیا تو وہ وقفہ جو اس کی بندش کھولنے
میں لگا اور وہ لمحہ مضطرب جو اس کی لوح کے دیکھنے کے وقت طاری ہوا مجھے اب تک
نہ صرف یاد ہے بلکہ محسوس ہو رہا ہے۔ میں نے پوسٹ مین کو روپیہ دیا اور پارسل لے کر
اوپر بھاگا۔ "حیاتِ جاوید" جس کی ضخامت ایک ہزار صفحات ہے، میں نے دو شب میں ختم
کر ڈالی تھی۔ یہ بھی مجھے یاد ہے کہ اپنے اس معمول کے مطابق کہ کسی نئی کتاب کے حصول
پر کم از کم ایک وقت کا کھانا ضرور فراموش کر دیتا تھا اُس دن بھی میں نے شام
کا کھانا نہیں کھایا، اِس خوف سے کہ اتنی دیر تک مطالعے سے محروم رہ جاؤں گا۔"

مولانا غلام رسول مہر اور "الہلال"

مولانا غلام رسول مہر مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار "الہلال" سے عجب والہانہ

شیفتگی کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "میں نے اخبار کھولا تو وہ "الہلال" تھا جو ٹائپ
میں تھا۔ ٹائپ کی تحریر پڑھنے کی اس وقت عادت نہ تھی۔ ادھر اُدھر سرسری نظر ڈال
کر رکھ دیا اور افسوس کرنے لگا کہ آٹھ روپے پانی میں ڈوب گئے۔ اس کے بعد دوسرا
شمارہ آیا، پھر تیسرا، میں اُلٹ پلٹ کر دیکھتا اور ردّی میں ڈال دیتا۔ چوتھا پرچہ
آیا تو اس میں "حزب اللہ" کے اغراض و مقاصد کی سُرخی نظر آئی۔ "حزب اللہ" کے نام
سے مولانا نے ایک جماعت قائم کی تھی۔ کچھ عرصے پہلے میں بھی اس جماعت کا رکن بن
چکا تھا اس لئے میں نے خاص طور پر اس مضمون کو پڑھنا شروع کیا۔ چند ہی سطروں
کے بعد ٹائپ کی دقت کا مطلق احساس باقی نہ رہا اور میں بڑے شوق سے مضمون کو پڑھتا
چلا گیا۔ اِسے ختم کر کے پرانے پرچے اٹھا لایا اور انھیں یکے بعد دیگرے اسی ذوق و شوق
سے پڑھا۔ پھر تو یہ حالت ہو گئی کہ "الہلال" کے انتظار میں ایک ایک دن گننے لگا۔ جس
روز گاؤں میں ڈاکیے کی آمد ہوتی، میں اس کے راستے میں میل ڈیڑھ میل دور نکل جایا کرتا
اور اخبار لے کر وہیں سے پڑھتا ہوا چلا آتا۔"

مولانا حکیم محمد عبداللہ: کتابوں کے عاشقِ زار

نام ور طبی مصنف مولانا حکیم محمد عبداللہ کو بھی کتابوں سے عشق تھا۔ قصبہ روڑی
ضلع حصار (مشرقی پنجاب) میں واقع اُن کے ذاتی کتب خانے میں دس ہزار کے
لگ بھگ کتابیں موجود تھیں۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں یہ تمام تر ذخیرہ وہیں چھوڑ
دینا پڑا۔ وہ جہانیاں ضلع ملتان میں آباد ہو گئے اور باوجود نامساعد حالات کے اس
کتب خانے کو دوبارہ زندگی بخشنے میں کامیاب ہو گئے اور آج کل اس کتب خانے
میں کتابوں کی تعداد پانچ ہزار سے زائد ہے۔ کچھ عرصہ ہوا مجھے خالدہ ادیب خانم
کے مشہور سفر نامے INSIDE INDIA کے اردو ترجمے "اندرونِ ہند" کی ضرورت
محسوس ہوئی۔ موصوفہ ۱۹۳۵ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دلی کی دعوت پر برِ صغیر تشریف
لائیں اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی مہمان ہوئیں۔ اُنھوں نے اپنے اس سفر کے

دل چسپ تاثرات اس کتاب کی صورت میں تحریر فرمائے تھے۔ اس کتاب کا ترجمہ مولوی سید ہاشمی فرید آبادی نے کیا اور انجمن ترقیٔ اُردو دِلّی نے شائع کیا تھا۔ آج کل یہ نایاب ہے۔ مَیں نے اس کتاب کی تلاش میں پاک و ہند کے تمام مشہور و معروف کتب خانوں کو خطوط ارسال کیے مگر ہر طرف سے جواب نفی میں ملا البتہ کتب خانہ انجمن ترقی اُردو ہند جامع مسجد دلّی نے مجھے لکھا کہ اُن کے ہاں صرف ایک نسخہ اس کتاب کا موجود ہے جسے دُگنی قیمت پر طلب کیا جاسکتا ہے۔ مَیں نے کتاب منگالی۔ پیکٹ کھولا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کتاب کے سرِ ورق پر حکیم صاحب کے دستخط موجود تھے۔ عجیب اتّفاق تھا حکیم صاحب کی یہ عادت تھی کہ وہ کتاب خریدتے ہی اس کے سرِ ورق پر اپنے دستخط ثبت فرما دیتے تھے۔ یہ کتاب اُن کے کتب خانے کی تھی جو ۱۹۴۷ء کے فسادات میں کتب خانے کے تباہ و برباد ہو جانے پر اِدھر اُدھر ہوتی ہوئی دلّی پہنچ گئی۔ مَیں نے یہ کتاب انھیں دکھائی تو اُن پر اس واقعے کا بڑا اثر ہوا۔ وہ کچھ دیر کتاب دیکھتے رہے پھر فرمانے لگے کہ قریشی صاحب! یہ کتاب اب آپ کی ملکیّت ہے لیکن کبھی یہ میری تھی"۔ یہ کہتے ہوئے فرطِ رقّت سے اُن کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ مجھے اس کتاب کی اشد ضرورت لاحق تھی اور مَیں نے اسے بڑے ارمانوں کے ساتھ خریدا تھا، لیکن مَیں اُن کو مایوس نہ کر سکا۔ مَیں نے کتاب مطالعے کے بعد اُن کے حوالے کر دی۔

کتابوں سے اُن کے غیر معمولی تعلّق اور دِل چسپی کا یہ عالم تھا کہ کسی نئی یا نایاب کتاب کا ذکر سنتے ہی وہ بے چین ہو جاتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ وہ کتاب جلد سے جلد اُن کے کتب خانے میں پہنچ جائے۔ کچھ عرصہ ہوا اخبار "الاعتصام" لاہور میں "مکتبہ سلفیہ" لاہور کی جانب سے یہ اشتہار دیا گیا تھا کہ اُن کے ہاں مشہور اہلِ حدیث عالم نوّاب صدّیق حسن خاں مرحوم کی نایاب خود نوشت سیرت "ابقا المنن" کا ایک نسخہ براہِ فروخت موجود ہے۔ مَیں نے حکیم صاحب سے اس کا ذکر کیا۔ فرمایا "فوراً تار دے دیجیے ورنہ کتاب ہاتھ سے نکل جائے گی"۔ مَیں نے تار دے دیا۔ دوسرے روز کتاب موصول ہو گئی اور اس کے ہمراہ مکتبے کی جانب سے یہ اطلاع بھی کہ آپ کا تار

مل گیا۔ کتاب پیشِ خدمت ہے ورنہ ہمارے پاس اس سلسلے میں کئی فرمائشیں آچکی تھیں۔
اُن کے اِس دعوے کو میں نے استعجاب و مسرت کے ملے جُلے جذبات کے ساتھ سنا کہ نو دس ہزار کتب پر مشتمل اپنے کتب خانے کی ایک ایک کتاب کے متعلق انھیں ذاتی طور پر یہ علم تھا کہ وہ کہاں رکھی ہے۔ جب کبھی رات کو انھیں کسی کتاب کی ضرورت محسوس ہوتی وہ روشنی کی مدد کے بغیر اُسے متعلقہ الماری سے نکال لینے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔

وہ کتابوں کے لین دین کے معاملے میں غیر معمولی طور پر فراخ دل واقع ہوئے تھے۔ میں نے اُن سے بارہا عرض کیا کہ وہ کتاب حوالے کرنے سے پیشتر سائل کی شخصیت کا جائزہ تو لے لیا کریں کہ آیا وہ مطلوبہ کتاب کے پڑھنے اور اُسے سمجھنے کا اہل بھی ہے یا نہیں، مگر وہ کسی کو مایوس کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ ایک مرتبہ مسکراتے ہوئے انھوں نے مجھے ایک کتاب دکھلائی جسے ایک صاحب اُن سے مستعار لے گئے تھے۔ اس کتاب کے سرِورق پر ان صاحب نے اپنا کچھ گھریلو حساب کتاب لکھا ہوا تھا اور ایک دوسرے مقام پر ان کے صاحبزادے نے اپنے خامۂ رنگین رقم سے جا بجا گُل بُوٹے بنا کر اپنے فن کار ہونے کا ثبوت پیش کیا تھا۔

مولانا شبلی نعمانی: کتابوں کے شیدائی

اس موقع پر مجھے علامہ شبلی نعمانی کا بھی ایک واقعہ یاد آگیا۔ بات اُس زمانے کی ہے کہ جب شبلی صاحب نہ مولانا تھے نہ علامہ۔ وہ ایک کتاب کی تلاش میں میر محفوظ علی بدایونی کے ہمراہ لکھنؤ کے ایک مجتہد سید ناصر حسین صاحب کے ہاں گئے۔ سید صاحب بڑے عزت و احترام کے ساتھ پیش آئے۔ میر صاحب نے علامہ شبلی کا تعارف کرایا اور ان کی آمد کا مقصد بیان کیا جسے سُنتے ہی سید صاحب بالکل بدل گئے اور شبلی صاحب سے فرمانے لگے کہ آپ وہ کتاب دیکھنا چاہتے ہیں، پہلے ذرا یہ کتاب تو دیکھیے۔ یہ کہہ کر قریب ہی پڑی ہوئی ایک کتاب کھول کر شبلی صاحب کے سامنے رکھ دی۔ مولانا شبلی چوں کہ حقیقت میں علم و فضل کی دولت سے مالا مال تھے فوراً کتاب پڑھ کر اس کے مطالب و معانی

بیان کرنے لگے۔ چند سطریں سننے کے بعد سید صاحب نے انھیں روک دیا اور فرمایا کہ بس یہی کافی ہے۔ آپ اس کتاب کے واقعی مستحق ہیں۔ پھر وہ اٹھے اور مطلوبہ کتاب الماری سے نکال کر شبلی صاحب کے سامنے رکھ دی۔

مولانا شبلی اور مولوی سید علی بلگرامی

"تمدنِ عرب" اور "تمدنِ ہند" جیسی وقیع اور بلند پایہ کتابوں کے فاضل مترجم شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی کے متعلق بابائے اردو مولوی عبدالحق تحریر فرماتے ہیں کہ اُن کے ہاں ایک روز مولانا شبلی، مولانا ظفر علی خاں اور مولوی عزیز مرزا مدعو تھے۔ بارہ بجے کھانے کے بعد سے چار بجے شام تک مولانا شبلی اس محفل میں مختلف اساتذہ کے اشعار سناتے رہے جن سے سامعین بڑے محظوظ ہوئے۔ گفتگو کے دوران میں مولانا شبلی نے عربی کی مشہور کتاب "کامل مُبرّد" کے متعلق کمال اشتیاق ظاہر فرمایا۔ مولوی سید علی بلگرامی نے فوراً اس کتاب کا نہایت عمدہ نسخہ مطبوعہ یورپ جو اُن کے کتب خانے میں موجود تھا اور جس کی قیمت اُس زمانے میں ستّر روپے تھی مولانا کی نذر کیا اور فرمایا کہ مجھ ایسا طالب علم جو خود کتابوں کا انتہائی شائق ہے اہل علم کے اس جذبے کی قدر کرنے پر مجبور ہے۔

سرسید اور مولوی سید علی بلگرامیؒ

یہ بھی اُنھی مولوی سید علی بلگرامی کا واقعہ ہے کہ جب سرسید آخری مرتبہ حیدرآباد دکن تشریف لائے تو وہ اپنے کتب خانے کی نادر و نایاب کتابیں دکھانے کے لیے اُن کو اپنے مکان پر لے گئے۔ من جملہ دیگر کتب ایک بیش قیمت کتاب ایسی بھی تھی جس میں اوّل سے آخر تک اسپین کی عمارات کے نقشے اور بہت عمدہ تصویریں تھیں۔ سرسید نے اس کتاب کی بہت تعریف کی اور فرمایا کہ یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہمارے کالج کی لائبریری کی زینت بنے تاکہ مسلمان طلبا اُسے دیکھ کر عبرت کا سبق حاصل کریں۔ بلگرامی صاحب نے "تائید" کی اور فرمایا کہ بے شک یہ کتاب اسی قابل ہے، چناں چہ سرسید کے تشریف

لے جاتے وقت اُنھوں نے وہ کتاب اُن کی گاڑی میں رکھوادی۔

عمادالملک بلگرامی: چند دلچسپ واقعات

مولوی عبدالحق صاحب فرماتے ہیں کہ مولوی سیّد علی بلگرامی کے بڑے بھائی نوّاب عمادالملک مولوی سیّد حسین بلگرامی بھی کتابوں کے دیوانے تھے جب بھی کوئی نایاب کتاب اُن کے سامنے براہِ فروخت آتی وہ اُسے لیے بغیر نہ چھوڑتے اور منہ مانگی قیمت دیتے۔ اِس فیاضی کی بدولت کتب فروش اُن کی خدمت میں حاضر رہتے۔ جو لوگ اِن کتابوں کی قدر و قیمت سے ناواقف ہوتے اِس بات پر بہت جھنجھلاتے کہ مولوی صاحب سرکاری رقم اِن بے کار چیزوں پر ضائع کرتے ہیں۔ چناں چہ ایک مرتبہ اُنھوں نے چار پانچ کتابیں آٹھ ہزار روپے میں خریدیں۔ جب اِن کتابوں کا بل براہ منظوری وزیر متعلقہ کی خدمت میں پیش ہوا تو کسی مصاحب نے چپکے سے کہہ دیا کہ حضور مولوی سیّد حسین کتابیں خریدنے میں سرکاری رُپیہ بڑی بے دردی سے خرچ کرتے ہیں اور جتنی قیمت مانگتا ہے دے دیتے ہیں۔ نوّاب عمادالملک کو بھی اس واقعے کی خبر ہو گئی۔ انھوں نے وزیر صاحب سے کہا کہ وہ کتابیں اُنھیں واپس کر دی جائیں، وہ خود اُنھیں خرید لیں گے اور یورپ بھیج کر چار گنی قیمت وصول کریں گے۔ وزیر متعلقہ نوّاب وقارالامرا نے جو بہت بامروّت، فیاض اور سیر چشم امیر تھے بہت معذرت کی اور فوراً رقم کی ادائی کا حکم صادر فرمایا۔

مولوی چراغ علی: کتابیں اُن کا اوڑھنا بچھونا تھیں

نوّاب اعظم یار جنگ بہادر مولوی چراغ علی کے بارے میں مولوی عبدالحق صاحب نے لکھا ہے کہ اُنھیں مطالعے میں بے حد شغف تھا گویا یہی اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا، یہاں تک کہ کھانا کھاتے وقت بھی کتاب سامنے رہتی تھی اور وقتاً فوقتاً نشان کرتے جاتے تھے۔ انتہا یہ ہے کہ بیت الخلا میں بھی کتابیں رہتی تھیں اور وہاں بھی پڑھنے سے نہیں چوکتے

تھے۔ رات کو تین چار گھنٹے سے زیادہ نہیں سوتے تھے۔ آرام کرسی پر پڑھتے پڑھتے سو گئے اس کے بعد پلنگ پر جا لیٹے اور پڑھنے لگے۔ اتنے میں پھر آنکھ لگ گئی۔ کچھ دیر کے بعد میز پر جا کر لکھنے لگے۔ اُن کی اہلیہ فرماتی تھیں کہ "میری ایک ڈیوٹی یہ بھی تھی کہ سوتے میں اُن کے سینے پر سے کتاب اٹھا کے رکھوں" مطالعے میں اُنھیں محویت رہتی تھی کہ کچھ ہو جائے اُنھیں خبر تک نہ ہوتی تھی ایک مرتبہ وہ تانگے میں سوار دورہ کر رہے تھے کہ راستے میں تانگہ ٹوٹ گیا۔ آپ اُسی میں پڑے پڑے کتاب کا مطالعہ کرتے رہے لوگ گئے اور کسی دوسری جگہ سے تانگے کا انتظام کیا اور لے کر آئے تو آپ اُس میں سوار ہو کر آگے بڑھے۔

نواب محسن الملک: صاحبِ علم و فضل شخصیت

نواب محسن الملک کے متعلق مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں کہ اُن کو مرتے دم تک مطالعے کا شوق رہا۔ انگریزی، اُردو اور عربی کے بہت سے رسالے اور اخبار اُن کے پاس آیا کرتے تھے اور ڈاک کے آنے پر وہ نہایت سرگرمی کے ساتھ اُن کے دیکھنے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ عربی، فارسی، اُردو اور انگریزی کی کتابوں کا ایک کتب خانہ اُن کے ساتھ رہتا تھا۔ رات کو پلنگ پر لیٹ کر جس کتاب کو وہ چاہتے مطالعہ کرنے لگتے تھے اور قابلِ یادداشت مقامات کا نشان اس کتاب کے حاشیے پر کرتے جاتے تھے جب ساری کتاب دیکھ چکتے تو کتاب کے شروع میں تمام قابلِ یادداشت مقامات کے عنوانات اپنے قلم سے لکھ کر اُن کے سامنے صفحات کے نمبر لکھ دیا کرتے تھے۔ اس عادت نے اُن کی معلومات کے دائرے کو بہت وسیع کر دیا تھا اور باقاعدہ یادداشت لکھنے کے سبب وہ جس بات کو چاہتے بے تکلف اپنی تحریر یا تقریر میں لے آتے تھے۔

خان بہادر میر ناصر علی: اُنھیں کتابوں سے پیار تھا

خان بہادر میر ناصر علی مدیر "صلائے عام" دِلّی کا کتب خانہ دِلّی کے چند گراں قدر

کتب خانوں میں سے ایک تھا۔ اُس میں چاروں طرف سنگین اور بلوریں الماریاں لگی ہوئی تھیں جن میں سیکڑوں کی تعداد میں نادر اور بیش قیمت نسخے اور ہزاروں عربی، فارسی انگریزی اور اُردو کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ کتابیں اُن کی زندگی میں کیا اہمیت رکھتی تھیں، اس کا اندازہ اُن کے اس مکتوب سے ہو سکتا ہے جو اُنھوں نے اپنے پوتے سید انصار ناصری سابق ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان کو کبھی لکھا تھا:

"بیٹا! میری ایک آرزو ہے کہ کتب خانے والا مکان تکلف سے آراستہ ہو جائے اور مَیں دن رات وہیں پڑا رہوں۔ تم اگر ساتھ چائے پینے آجاؤ تو کیا کہنا" کھانا جب بھوک لگے پکا پکایا مل جائے اور لڑکیوں میں سے کوئی آکر کھلا جائے۔ کوئی نایاب کتاب نظر آئے تو مجھے اتنا مقدور ہو کہ فوراً خرید لوں۔ رات کو بے فکر سو جاؤں اور صبح خوش اُٹھوں۔ دنیا کی جتنی کتابیں دل و دماغ کو خوش کر سکیں سب میرے پاس ہوں۔ جاڑے میں انگیٹھی ہو اور گرمیوں میں برف، برسات میں کمرے کے اندر بیٹھا رہوں اور وہ ٹپکتا نہ ہو۔ رات کو جلانے کے لیے خوب صورت شمع دان کی روشنی ہو اور جو کتاب مجھے پسند ہو وہ میرے سامنے ہو۔ تم اتنا سامان میرے لیے کر دو تو I WILL DIE HAPPY (مَیں بااطمینان جان دے دوں گا)

مہدی افادی: کتابوں کی صُورت کے قائل

مشہور ادیب مہدی افادی کتاب کی "سیرت" کے ساتھ ساتھ اس کی "صُورت" کے بھی قائل تھے۔ مولانا عبد الماجد دریابادی فرماتے ہیں کہ وہ کتابیں نہایت صاف ستھری رکھتے تھے اور جلد اعلا سے اعلا بندھواکر، سیکنڈ ہینڈ یا مستعمل کتاب وہ ہاتھ میں لینا کیا جانیں۔ "دوشیزۂ کاغذی" انھی کی زبان میں دستِ غیر سے مَس ہونے کے بعد ان کے کس کام کی! یہ بھی واقعہ ہے کہ اُنھوں نے "حیاتِ جاوید" اور "البرامکہ" جیسی کتابوں کی جلدیں اس صدی کے شروع میں تیس تیس روپے دے کر بندھوائی تھیں۔

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی: مولوی صاحب نے کتاب لینے سے انکار کر دیا

شمس العلما ڈپٹی مولوی نذیر احمد دہلوی کے متعلق بھی ایک لطیفہ مشہور ہے، وہ یہ کہ اُن کے پاس عربی کی ایک نایاب کتاب تھی۔ جسے دیکھنے کے دِلّی کے ایک مولوی صاحب بھی مائق تھے۔ اُن سے ڈپٹی صاحب کے تعلقات کچھ اس قسم کے تھے کہ ڈپٹی صاحب نہ انکار کرنے تھے اور نہ دینا چاہتے تھے، لیکن ایک روز ڈپٹی صاحب کو یہ کتاب اُن کو تے ہی بنی۔ ڈپٹی صاحب کو اللہ نے حسِ مزاح سے پوری طرح نوازا تھا۔ کتاب مولوی صاحب کی جانب بڑھاتے ہوئے ڈپٹی صاحب نے فرمایا کہ کتاب تو بڑی اچھی ہے، لیکن اس کی جلد سؤر کے چمڑے کی ہے۔ مولوی صاحب نے جو یہ الفاظ سُنے تو لاحول پڑھتے ہوئے فوراً پیچھے ہٹ گئے اور کتاب لینے سے انکار کر دیا۔

مرزا فرحت اللہ بیگ: کتابوں کے صحیح قدر داں

برِّصغیر کے ممتاز مزاح نگار مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی پر اپنے مضمون میں اُن کے ایک عزیز مرزا حُسین احمد بیگ نے لکھا تھا کہ اُنھیں کتب بینی کا شوق ہمیشہ سے رہا۔ یہ بھی ہوتا تھا کہ دستر خوان پر بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے ہیں، لیکن کتاب بائیں ہاتھ میں ہے، آنکھیں کتاب کی طرف اور سیدھا ہاتھ باقاعدہ رکابی میں پڑ رہا ہے اُنھوں نے اُردو اور انگریزی کتابوں کا ذخیرہ اچھا جمع کر لیا تھا: زیادہ تر وہ شاعروں کے تذکروں کی تلاش میں رہتے تھے۔ کتب فروش اُن کے اس شوق سے واقف ہو گئے تھے۔ قیمت کی تکرار پُرلطف ہوتی تھی۔ موٹر میں بیٹھنے تک تکرار کا سلسلہ جاری رہتا۔ بعض کتب فروش مکان پر کتابیں پہنچا دیا کرتے تھے۔ دوسروں سے بھی کتابیں عاریتاً مانگ لیا کرتے تھے، لیکن واپس کرنے میں بڑا اہتمام ملحوظ تھا۔ اپنی کتابیں بھی پڑھنے کو دے دیا کرتے تھے، لیکن واپسی کا تقاضا شدید ہوا کرتا تھا۔ اکثر مجھ سے شکایت کیا کرتے کہ پڑھنے کے لیے کتاب

تو لے جاتے ہو، لیکن واپس نہیں کرتے۔ اگر مَیں کہتا کہ میری کتابوں میں رکھی ہوئی ہے، تلاش کر کے آپ کی کتاب دے دوں گا تو وہ خود میری کتابوں کا جائزہ لے کر اپنی کتاب نکال لیتے۔ جب تک کتاب نہ ملتی بے چین رہتے تھے۔"

حضرت مرزا داغ دہلوی اور اُن کا کتب خانہ

حضرت مرزا داغ دہلوی کو بھی مطالعے کا بڑا شوق تھا۔ جو نئی کتاب بھی شائع ہوتی وہ فوراً اُسے خرید لیتے اور اُس کے مطالعے میں مصروف ہو جاتے۔ مطالعہ وقفے وقفے سے کرتے، لیکن کتاب کو پوری پڑھ کر چھوڑتے۔ اُنھوں نے اپنے دولت کدے کا ایک بڑا کمرا کتب خانے کے لیے وقف کر رکھا تھا جس میں چار پانچ الماریاں کتابوں سے پُر تھیں اور ہر الماری میں دو دو ڈھائی ڈھائی سو کتابیں ہوتی تھیں۔ وہ کتابوں کی جلدیں قیمتی بندھواتے اور ہر کتاب پر مالکِ کتاب کی حیثیت سے اپنا نام بھی ڈلواتے۔ اساتذۂ اُردو اور فارسی کے پورے کلیات اور دواوین اُن کے کتب خانے میں موجود تھے۔ کتب خانے کی فہرست مجلّد تھی۔ مرزا صاحب اپنے احباب اور شاگردوں کو کتابیں مستعار بھی دیتے رہتے، لیکن اُن کا اندراج ایک علاحدہ رجسٹر میں کر دیتے۔ اس رجسٹر کی تنقیح ہر دوسرے تیسرے مہینے ہوتی رہتی اور اگر کوئی کتاب کسی کے پاس رہ جاتی تو تقاضا کر کے منگوا لیتے۔

کتابوں کے متعلق کتاب

حکیم مسعود احمد برکاتی مدیر "ہمدرد نونہال" کراچی اپنے سفر نامے "دو مسافر دو ملک" میں رقم طراز ہیں کہ پیرس میں، "مَیں ایک دن یونیسکو کے قریب ایک بازار میں جا رہا تھا کہ ایک دُکان کے باہر کچھ چھوٹی بڑی پُرانی دھرانی چیزیں نظر آئیں۔ خالی ڈبّے، بوتلیں، برتن، ایک آدھ بدرنگ کرسی اور پھر نظر کتابوں پر جم کر رہ گئی۔ پُرانی کتابیں بھی اس کباڑی کی دُکان پر رکھی تھیں۔ نظروں کے ساتھ ساتھ قدم بھی رُک گئے۔ اہا ہا، کتابیں! شاید کچھ اچھی سی کتابیں مل جائیں، اور سیکنڈ ہینڈ ہونے کی وجہ سے سستی بھی ہوں گی، ورنہ

آج کل کتاب کی قیمتیں بھی آسمان تک نہیں تو بادلوں تک تو پہنچ ہی گئی ہیں۔ اپنے ملک میں بھی اور مغربی ملکوں میں تو ہر چیز ہی مہنگی ہے۔ لندن میں تو چند کتابیں خریدی تھیں۔ دو کتابیں کہانیوں کی تھیں کہ شاید یہ "ہمدرد نونہال" کے لیے کارآمد ہوں۔ ایک بہت عمدہ کتاب کتابوں ہی کے متعلق THE BOOK ABOUT BOOKS خریدی۔

کہتے ہیں کہ جب انسان کو رفاقت کی ضرورت ہو تو کتاب اُس کی بہترین دوست ہے جب انسان کسی کش مکش اور شک شُبے کی حالت میں ہو تو کتاب اُس کی مشیر ہے۔ جب انسان اکتاہٹ اور بیزاری میں مبتلا ہو تو کتاب اُس کے لیے سب سے اچھی تفریح ہے۔ اس کتاب میں کتاب کے عاشقوں کے لیے سب کچھ نہیں تو بہت کچھ ضرور ہے۔ اس کتاب کی قیمت ساڑھے اکتالیس پونڈ ہے، لیکن لندن میں جس دُکان سے مَیں نے یہ خریدی وہاں "سیل" SALE ہو رہی تھی۔ اس لیے اس نے صرف تین پونڈ ۹ پنس میں دی، یعنی کوئی ۹۰۰ رُپے کی کتاب ۹۰ رُپے میں مل گئی۔ یہ ہوتی ہے "سیل"۔ ایک "سیل" ہمارے ہاں ہوتی ہے کہ بڑے بڑے اعلانات اور دعوے، مگر حقیقت میں رعایت یا کمی کچھ نہیں، بابرائے نام۔

یہ "کتابوں کے متعلق کتاب" میرے پسندیدہ موضوع پر ہے۔ بیس پچیس سال سے مَیں اس موضوع پر خود کتاب لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں اور خاصی کتابیں بھی جمع کر لی ہیں۔ اُردو میں تو اَب تک کوئی ایسی کتاب لکھی ہی نہیں گئی۔ انگریزی میں خاصی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اصل میں کتاب کا مطالعہ بھی ایک فن ہے۔ اس فن کے آداب اور نکات جانے بغیر کتابیں پڑھنے والے بھی اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اس لیے مطالعے کے فن پر بھی کتابیں ہونی چاہییں۔ بہر حال پیرس میں اس کباڑ خانے میں کتابوں پر لپکا، مگر وہاں تو کوئی کتاب بھی انگریزی میں نہیں تھی۔ ساری کتابیں، رسالے صرف فرانسیسی میں تھے۔ اُمیدوں کے محل دھڑام سے زمین پر آ گئے۔"

کتب خانے: روحانی شفاخانے

الحاج محمد زبیر اپنے مضمون "مسلم یونی ورسٹی لائبریری" کے آخر میں رقم طراز ہیں کہ اس لائبریری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ صرف مسلمانوں ہی کے تہذیبی ورثے کی محافظ نہیں ہے بلکہ اس میں مختلف علوم و فنون کا ایسا بیش بہا اور پُر از معلومات سرمایہ جمع ہے جس کی بنا پر اس لائبریری کو عاشقانِ کتب کا کعبہ کہہ دینا زیب دیتا ہے۔ عہدِ قدیم میں کتب خانوں کے دروازوں پر DISPENSARY OF THE SOUL (روحانی شفاخانہ) لکھ دیا کرتے تھے اگر میرے بس میں ہوتا تو میں مولانا آزاد لائبریری کے دروازے پر یہ شعر لکھ دیتا جو مولانا جلال الدین رومی کے مزار پر کندہ ہے ؎

کعبۂ عشاق باشد ایں مقام
ہر کہ ناقص آمد ایں جا شد تمام

"اسلامی کتب خانے": ایک عظیم تصنیف

ناسپاسی اور ناشکر گزاری ہوگی، اگر اس موقع پر الحاج محمد زبیر صاحب کی بلند پایہ اور محققانہ تصنیف "اسلامی کتب خانے" کا ذکر نہ کیا جائے۔ میرا یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہ ہوگا کہ اُردو ادب میں کتب خانوں کے موضوع پر "اسلامی کتب خانے" کی ہم مرتبہ اور ہم پایہ کوئی اور کتاب اس وقت تک موجود نہیں! "اسلامی کتب خانے" جو پانچ صد صفحات کی ضخامت پر مشتمل ہے بلاشبہ ایک عظیم کتاب کہلانے کی مستحق ہے جس میں فاضل مُصنّف نے دُنیائے اسلام کے بڑے سے بڑے کتب خانے سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے کتب خانے تک کے متعلق اتنے بھرپور انداز میں معلومات فراہم کی ہیں کہ اُن کی وسعتِ علمی کو بے اختیار داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ اللہ اُنھیں خوش رکھے۔

"اسلامی کتب خانے": چند دل چسپ اقتباسات

الحاج محمد زبیر اپنی کتاب "اسلامی کتب خانے" میں تحریر فرماتے ہیں کہ بادشاہوں

میں اندلس کے اُموی خلیفہ حکم ثانی کا ذوقِ مطالعہ اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اُس کے کتب خانے کی چار لاکھ کتابوں میں سے بہت کم ایسی تھیں جن کو اُس نے پڑھا نہ ہو۔ اکثر کتابوں پر اُس کے لکھے ہوئے حواشی بھی موجود تھے۔ کثرتِ مطالعہ کے سبب آخر عمر میں خلیفہ کی بینائی کمزور ہو گئی تھی، پھر بھی اُس نے مطالعہ جاری رکھا"۔

"علامہ ابن رشد نے ساری عمر کتب بینی میں صرف کر دی۔ اُس کی عمر میں دو راتیں ایسی آئیں کہ جب وہ مطالعہ نہ کر سکا، ایک شادی کی رات اور دوسری اُس کے والد کی وفات کی رات"۔

"منجّم ابو معشر کے انہماکِ مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ اُس نے خراسان سے مکہ معظمہ جاتے ہوئے بغداد کا ایک کتب خانہ "خزانۃ الحکمت" دیکھنے کا قصد کیا۔ مگر وہاں پہنچ کر مطالعے میں اتنا محو ہوا کہ مکہ معظمہ جانا ہی بھول گیا"۔

"بصرے کے ایک عالم جاحظ نے تو اپنی جان ہی ذوقِ مطالعہ کی نذر کر دی۔ وہ آخر عمر میں مفلوج ہو گیا تھا لیکن اس حالت میں بھی کتابیں اُس کے چاروں طرف پھیلی رہتی تھیں اور وہ مطالعے میں منہمک رہتا تھا۔ ایک روز کتابیں جاحظ پر گر پڑیں اور وہ اُن کے نیچے دب کر مر گیا"۔

نوّاب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے اپنی کتاب "علمائے سلف" میں امام زہری کے متعلق لکھا ہے کہ "وہ مطالعے میں اتنے منہمک رہتے تھے کہ دُنیا و مافیہا کی خبر تک نہ رہتی تھی۔ اُن کی اہلیہ کو یہ گوارا نہ تھا کہ اس کے شوہر کے دل میں سوائے اُس کے کسی اور کی بھی گنجائش موجود ہو، خواہ وہ کتاب ہی کیوں نہ ہو چنانچہ ایک روز اس نے بگڑ کر کہا "قسم ہے ربِّ کعبہ کی یہ کتابیں مجھ پہ تین سوکنوں سے بھی زیادہ بھاری ہیں"۔

ایک خوب صورت شعر

مدّت ہوئی میں نے ایک کتب خانے کے صدر دروازے پر یہ خوب صورت شعر

لکھا ہوا دیکھا تھا، خدا جانے کن صاحب کا نتیجۂ فکر تھا بہر حال حسبِ حال تھا اور مجھے بہت پسند آیا:

سیاحت کا جنھیں ہے شوق پھرتے ہیں وہ شہروں میں
کُتب بینی ہے سیر اپنی، کتابیں ہیں چمن اپنا

میری اس کتاب کا عنوان اس شعر کے مصرعۂ ثانی کا آخری ٹکڑا ہی ہے۔

کتاب اور مَیں

کتابوں کے بارے میں میرے جذبات و احساسات

جہاں جاؤں وہاں تیرا فسانہ چھیڑ دیتا ہوں
کوئی محفل ہو تیرا رنگِ محفل یاد آتا ہے

قسامِ ازل کی شفقت و عنایت اور کرم و فضل کے قربان جاییے کہ روزِ ازل جب وہ ہماری قسمتوں کا فیصلہ کر رہا تھا اور ہمیں اپنے انعام و اکرام سے نواز رہا تھا تو جہاں کسی کو حسن و جمال، کسی کو مال و دولت، کسی کو سطوت و شوکت، کسی کو عزم و استقلال اور کسی کو فہم و تدبر بخشا وہاں میرے دلِ خانہ خراب کو عشق و محبت کے جذبات سے سرشار فرمایا مگر یہ عشق قیس عامری کا عشق نہ تھا کہ جس نے اُسے مجنوں کا لقب دلایا اور نہ یہ محبت فرہاد کی محبت تھی کہ جس کے ہاتھوں اُس نے کوہ کن کا نام پایا، بلکہ مجھے یہ حکم ہوا کہ میں زندگی بھر کتاب کی اُلفت کا دم بھروں اور اُس کی محبت کا لطف اٹھاؤں چناں چہ اب یہ کیفیت ہے کہ اس بت کافر کے ہجر میں ؎

صُبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر اپنی تمام ہوتی ہے

ہجر و وصال کا یہ افسانہ رنگیں بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمر بھر ختم نہ ہوگا میرے شب و روز اُسی کے تصور میں گزرتے ہیں۔ مجھے اُس سے گہری محبت اور بے پایاں عشق ہے میں اُس سے دیوانگی کی حد تک پیار کرتا ہوں میں سوچتا ہوں کتاب میری زندگی میں نہ ہوتی تو یہ زندگی کتنی اُداس اور کتنی بے رونق ہوتی میں اُن لوگوں سے بھی محبت کرتا

ہوں اور انھیں قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں جنھیں کتاب سے محبت ہے اور جو کتاب کے عشق کا دم بھرتے ہیں۔ مجھے اُس محفل میں سکونِ قلب اور اُس مجلس میں اطمینانِ دل نصیب ہوتا ہے، جہاں کتاب کی باتیں ہوتی ہوں، جہاں کتاب کا ذکر ہوتا ہو۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا۔ ؎

ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے

ہر نئی کتاب بشرطیکہ وہ میرے مزاج اور معیار سے مطابقت رکھتی ہو میرے لیے پیامِ مسرت اور نویدِ شادمانی لے کر آتی ہے کتاب کا پارسل ملتے ہی اُس کی ایک جھلک تو میں اُسی وقت دیکھ لیتا ہوں پھر رکھ دیتا ہوں کہ جلد سے جلد رات ہو جائے اور میں اُس کے جمالِ جہاں آرا سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کروں۔ حضرت عمر خیام فرماتے ہیں ؎

فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے

میری دل چسپ خواہش

میں مطالعۂ کتب کے معاملے میں شاعرِ خمریات کے گوشۂ چمن کا قائل نہیں۔ فرصت کے لمحات ضرور میسر ہوں لیکن وقت رات کا ہو موسم سرد ہو اور بستر گرم گرم ہو تیز لیمپ روشن ہو اور انگیٹھی سُلگتی ہو، چائے کی دو ایک گرما گرم اور مزے دار پیالیاں اور تھوڑے سے بھُنے ہوئے نمکین پستے کسی خوب صورت طشت میں رکھے ہوئے ہوں تو سبحان اللہ! کامل تنہائی ہو اور مخل کوئی نہ ہو بس ؎

تو ہو ترا جلوہ ہو اور عالمِ تنہائی

اَلْاِنْتِظَارُ اَشَدُّ مِنَ الْمَوْتِ

کتابوں کے سلسلے میں میرے جذبات و احساسات انتہائی نازک ہیں۔ مجھے جوں ہی اپنی کسی دل پسند کتاب کے شائع ہونے کی اطلاع ملتی ہے، میں اُس کے حصول کے لیے بے تاب ہو جاتا ہوں اور اُسی وقت ناشر کو اُس کی فراہمی کے لیے خط لکھ ڈالتا ہوں اور اس خط میں اُنھیں تاکید کیا کرتا ہوں کہ مطلوبہ کتاب مجھے پہلی ڈاک سے ارسال کی جائے۔ لیکن بہت ہی کم مواقع ایسے آئے کہ کسی نے میری اِس شدید

خواہش کو پامال نہ کیا ہو۔ زندگی میں بار ہا ایسے لمحات بھی آئے کہ دل میں بے اختیار یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کاش میرے پر ہوتے اور میں اُڑ کر اس کتاب کو لے آتا۔ مجھے جب کسی کتاب کی روانگی کی اطلاع ملتی ہے اور وہ کتاب کسی وجہ سے اُس روز موصول نہیں ہوتی ہے تو اگلے چوبیس گھنٹے گزارنا مجھے مصیبت ہو جاتے ہیں اور دل و دماغ پر اَلْاِنْتِظَارُ اَشَدُّ مِنَ الْمَوْتِ کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ طبیعت بس یہی چاہتی ہے کہ وقت کی رفتار تیز تر ہو جائے اگلا دن جلد نمودار ہو اور اس معشوقۂ دل نواز کے دیدار سے مسرّت و سرخوشی نصیب ہو۔ ہجر و وصال کی ان داستانوں میں باوجود اُن کی تلخیوں کے کس قدر کیف و سُرور پنہاں ہوتا ہے اس کو وہی شخص محسوس کر سکتا ہے جس پر یہ واردات گزرتی ہوں۔ اس سلسلے میں دو چار واقعات بیان کرنا شاید دلچسپی کا باعث ہوں۔

صبح چار بجے، سردی، بارش اور ریلوے اسٹیشن

ایک زمانہ ہوا میں نے کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار دلی سے کچھ کتابیں منگوائیں پندرہ بیس روز کے انتظار کے بعد جس نے طبیعت کو سخت مکدّر اور بدمزہ کر ڈالا تھا اس ادارے کا خط ملا کہ آج آپ کو کتابیں ارسال کر دی گئی ہیں خط تو مل گیا لیکن کتابوں کا پارسل نہ ملا دل تڑپ کر رہ گیا وقت کاٹے نہ کٹتا تھا خدا خدا کر کے رات ہوئی نیند کچھ آئی کچھ نہ آئی یوں توں کر کے رات کٹی وقت آخر گزر ہی گیا آنکھ کھلی گھڑی پر نظر ڈالی چار بجے تھے بارش ہو رہی تھی دسمبر کا مہینہ تھا اور سردی اپنے جوبن پر تھی معاً میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہیں ہرکارہ ڈاک گاڑی سے ڈاک لینے سے نہ رہ جائے یہ خیال آتے ہی موسم کی شدت کے باوجود میں ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ فاصلہ دو فرلانگ سے کیا کم ہوگا۔ گاڑی آنے میں ابھی کچھ دیر تھی اور ہرکارہ بے چارہ حسبِ معمول ڈاک کا انتظار کر رہا تھا تھوڑی دیر میں گاڑی آن پہنچی وہاں سے ڈاک وصول کی اور ہرکارے کو ہمراہ لے کر ڈاک خانے کی طرف چل پڑا یقین فرمائیے اسٹیشن سے ڈاک خانے پہنچنا قیامت ہو گیا دل کی دنیا میں ہل چل مچی ہوئی تھی کہ دیکھیے

کتابیں آج بھی آتی ہیں یا نہیں۔ اسی کشمکش میں میں ڈاک خانے پہنچ گیا اور اسی وقت ڈاک کھول ڈالی دیکھ کر کتابوں کا پارسل موجود ہے اُسے اُٹھایا اور سینے سے لگالیا اس وقت صبح کے پانچ بجے تھے اور دِن نکلنے میں ابھی دو ڈھائی گھنٹے باقی تھے۔ یہاں میں اس امر کی وضاحت کرتا چلوں کہ حصولِ رزق کے سلسلے میں میرا تعلق محکمہ ڈاک سے تھا۔

"نقوش" کا شخصیات نمبر

۱۹۵۵ء کے ابتدائی ایّام کا ذکر ہے اُن دنوں "نقوش" لاہور کا شخصیات نمبر جلد اوّل شائع ہونے والا تھا شخصیات چوں کہ میرا پسندیدہ موضوع ہے میں نے احباب کے اور اپنے لیے چند پرچوں کی "فرمائش" کی ہوئی تھی۔ ادارہ "نقوش" کی طرف سے اخبارات میں اشتہار دیئے جاچکے تھے کہ پرچہ شائع ہوچکا ہے مگر وہ پرچہ ہمیں بھیجنے کا نام نہ لیتے تھے۔ یہ نمبر ابھی تک غالباً پریس میں تھا۔ مجھے اس شمارے کا انتظار کرتے ہوئے پورے دو ماہ ہوچکے تھے اور اب تو انتظار کی حدیں بھی ختم ہوچکی تھیں۔ اس قدر روحانی کوفت محسوس ہورہی تھی کہ بس کچھ نہ پوچھیے۔ میں اِن دنوں ادارہ "نقوش" کو روزانہ ایک خط لکھتا تھا اور ایک روز تو تار بھی دے ڈالا پھر بھی یہ شمارہ موصول ہوتے ہوتے تین چار دن تو لگ ہی گئے۔ جس روز یہ نمبر آیا خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ کاش میرے اُس روز کے جذبات کا اظہار سینۂ قرطاس پر بخوبی ہوسکتا۔

میرا روزنامچہ

ایک کتاب کے متعلق میرے روزنامچے کا ورق ملاحظہ فرمایئے

۲۵۔۰۱۔۵۶۔ آج "حیاتِ آفتاب" کی قیمت شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب لاہور کو ارسال کی اور منی آرڈر کی رسید مع خط خان بہادر ڈپٹی طبیب اللہ خان صاحب کو بذریعہ رجسٹری علی گڑھ بھیجی۔ اُمید ہے کہ میرا یہ خط ڈپٹی صاحب کو مورخہ ۳۰ جنوری ۵۶ء کو ضرور مل جائے گا۔ میں نے اس خط میں اُن سے درخواست کی ہے کہ وہ براہِ کرم میرا خط ملتے ہی اُسی روز یہ کتاب روانہ فرمائیں۔ اس طرح یہ کتاب مجھے اِن شاء اللہ مورخہ ۴ فروری ۵۶ء کو ضرور مل جائے گی۔

۴۔۲۔۵۶۔ کتاب آج نہیں آئی۔
۵۔۲۔۵۶۔ کتاب آج بھی نہیں آئی۔
۶۔۲۔۵۶۔ اُف کتاب آج پھر نہیں آئی شاید کل آجائے۔
۷۔۲۔۵۶۔ لیجیے میرا اندازہ غلط رہا آج بھی وہی کیفیت ہے میرے صبر کا امتحان ہو رہا ہے۔
۸۔۲۔۵۶۔ آج کی ڈاک بھی کتاب سے خالی ہے نہ جانے خان بہادر صاحب کو کیا ہو گیا ہے وہ کیوں اتنے سنگ دل ہو گئے ہیں۔
۹۔۲۔۵۶۔ آج بھی صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی خدا اِن خان بہادر صاحب کو سمجھے!
۱۰۔۲۔۵۶۔ افسوس صد افسوس کہ کتاب آج بھی نہیں آئی آج اس کا انتظار کرتے کرتے پورے سات دن گزر چکے ہیں۔ اگر کل بھی نہ آئی تو میں ضرور دیوانہ ہو جاؤں گا۔
۱۱۔۲۔۵۶۔ اس وقت صبح کے چھ بجے ہیں میں اس وقت اللہ تعالےٰ کے حضور میں گڑگڑا کر دعا مانگ رہا ہوں خدا مجھے اِس عذاب سے نجات دے۔
۱۱۔۲۔۵۶۔ صبح آٹھ بجے۔ مبارک ہو مبارک ہو آج کی ڈاک سے "حیاتِ آفتاب" موصول ہوئی میری دُعا قبول ہو گئی۔
مجھے اس قدر خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ جیسے کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔ کتاب بھی واقعی لاجواب ہے۔

انتظار کی حد ہو گئی

اور سُنیے۔ مجھے مسٹر کے۔ ایم۔ منشی کی انگریزی کتاب END OF AN ERA کی شدید ضرورت لاحق تھی یہ کتاب زوالِ حیدر آباد (دکن) کے متعلق ہے۔ کئی ماہ کی سعیِ پیہم کے بعد کتاب کے حصول کی صورت نظر آئی اور ایک محترم دوست نے بمبئی سے مجھے یہ کتاب ارسال فرمائی۔ اس کتاب کی روانگی کی اطلاع اُنھوں نے مجھے علاحدہ ایک خط کے ذریعہ دی۔ خط موصول ہوا تو بڑی مسرت ہوئی، لیکن کتاب کا پیکٹ نہ ملا۔ ہوا یہ کہ اُن

صاحب نے کتاب کے پیکٹ پر بجائے "رجسٹرڈ پیکٹ" لکھنے کے "رجسٹرڈ پارسل" تحریر فرمایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کتاب براہِ راست آنے کی بجائے کسٹم آفس میں چلی گئی کیوں کہ رجسٹرڈ پارسلوں کو پڑتال کی غرض سے کسٹم آفس سے گزرنا پڑتا ہے اور وہاں سے برآمد ہوتے ہوتے ہفتہ عشرہ ضرور لگ جاتا ہے۔ اِدھر میں نے کتاب کا انتظار کرنا شروع کیا۔ ایک دن ہوا، دو دِن ہوئے، تین دن ہوئے، غرض پورا ہفتہ ختم ہوگیا تب کہیں جاکر اس کتاب نے شکل دکھائی یہ آٹھ دن جس طرح گزرے۔ ایک انتہائی تلخ داستان ہے اِن دنوں یہ کیفیت تھی کہ رات کو دیر سے سوتا خواب بھی کتاب ہی کے دیکھتا اور صبح سویرے اُٹھ بیٹھتا۔ اس وقت عموماً چار بجے ہوتے چار بجے سے لے کر سات بجے تک کا وقت جب ڈاک خانہ کھلتا عجب بے چینی اور بے کیفی سے گزرتا۔ پہلے دو ایک روز انتظار رہا پھر انتظار نے کوفت کی شکل اختیار کر لی اور پھر یہ کوفت اذیت میں تبدیل ہوگئی۔ لیکن جب کتاب مل گئی تو ایسا محسوس ہوا گویا کچھ بھی نہ ہوا تھا اور اگلے دن میں یہ سوچ رہا تھا کہ کاش کل بھی کتاب نہ آتی اور آج میں اُس کے انتظار کے مزے لوٹتا ہوتا۔

کتابیں خرید کر پڑھنی چاہییں

مالی وسائل محدود ہونے کے باوجود بھی میں کتاب خرید کر پڑھنے کا قائل بلکہ اس اصول پر سختی سے عامل بھی ہوں۔ میں مقامی کتب خانوں کا رُکن ضرور ہوں لیکن اپنے مذاق مزاج اور دلچسپی کی کتابیں ضرور خریدتا ہوں۔ الحمدللہ میرا یہ ریکارڈ ہے کہ کتاب پاکستان یا ہندوستان میں خواہ کہیں بھی چھپی ہو اور اس کی قیمت میری بساط سے کتنی ہی باہر کیوں نہ ہو، میں نے ضرور حاصل کر ڈالی بشرطے کہ وہ میرے مذاق اور مزاج کے مطابق ہو۔

میرے پسندیدہ موضوعات

میری محبوب اور پسندیدہ کتابوں میں آپ بیتیاں، یادداشتیں، سیرت و سوانح، مکاتیب، سفرنامے، سیر و شکار اور واقعاتی ادب (رپورتاژ) شامل ہیں۔ دِلّی، علی گڑھ، حیدرآباد دکن اور لاہور سے متعلق کتابوں کو بھی میں نے ہمیشہ دلچسپی سے پڑھا۔ شعری ادب کو بھی میں پسند کرتا ہوں لیکن ناول اور افسانے سے مجھے اب کوئی اُنس نہیں رہا۔

مطالعۂ کتب کے سلسلے میں میری یہ عادت ہے کہ میں شاید ہی کسی کتاب کو ایک نشست میں ختم کرتا ہوں وگرنہ جستہ جستہ دیکھتا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ ختم نہ ہو جائے۔

میں کتاب مستعار دینے کا قائل نہیں

میرا ایک نہایت بُرا اصول یہ ہے کہ میں اپنی ذاتی کتب میں سے کوئی کتاب کسی کو مستعار دینے کے لئے تیار نہیں، مستعار دینا تو بڑی بات ہے میں تو اس بات کا بھی قائل نہیں کہ میری کتاب میری ہی موجودگی میں چند لمحوں کے لیے بھی دستِ غیر میں چلی جائے، کیوں کہ میں نے اکثر وبیشتر لوگوں کو دیکھا ہے کہ ادھر کتاب اُن کے ہاتھ میں آئی اُدھر انھوں نے اُنگلی کو تھوک لگا لگا کر ورق اُلٹنے شروع کیے مجھے افسوس ہے کہ میں اس حرکتِ قبیحہ کا سخت مخالف ہوں اور مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا کہ ایک کتاب کے ساتھ اس قسم کا سلوک کیا جائے۔ ویسے طبّی نقطۂ نظر سے بھی یہ بات سخت قابلِ اعتراض ہے بعض لوگوں کو اس عادتِ بد کا شکار دیکھا کہ وہ یادداشت کے طور پر کتاب کا ورق ہی موڑ ڈالتے ہیں میرا قول ہے کہ شیشے میں بال، کاغذ پر شکن اور کاتب کی غلطی کا کوئی علاج نہیں۔ یہ بے احتیاطیاں اور لاپروائیاں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا وجود قائم رکھ چھوڑتی ہیں ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ماہنامہ "اُردو ڈائجسٹ" کا تازہ شمارہ جس میں میرا مضمون شامل تھا اور جسے میں نے مقامی نیوز ایجنسی پر رکھے ہوئے تیس پرچوں میں سے منتخب کیا تھا میرے زیرِ مطالعہ تھا۔ یکایک کسی ضرورت کے پیشِ نظر میں اپنی کرسی سے اُٹھا لیکن اُٹھنے سے پیشتر میں نے اُسے میز پر رکھی ہوئی ایک کتاب کے نیچے دبا دیا اور خود دوسرے کمرے میں چلا گیا اتنے میں ایک صاحب آئے پرچہ اٹھایا اور ورق گردانی کرنے لگے۔ میں آیا تو وہ صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے لیکن مخاطب ہونے کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے اس پرچے کے ایک نہ دو بلکہ پورے چھے ورق موڑ ڈالے میں نے یہ منظر دیکھا تو جل کر خاک ہو گیا اور پھر جو میں نے اُن کی تواضع کی مجھے بعد ازاں اُس پر کمال افسوس ہوا۔

میرے نظریے کے مطابق کتاب ایک ایسی چیز ہے کہ وہ اُس حالت میں کبھی واپس نہیں آتی جس حالت میں آپ نے اُسے کسی کے حوالے کیا تھا۔ اس لیے احباب میرے چھوٹے

سے کتب خانے کو جسے کتب خانہ کہنا شاید اصطلاح "کتب خانہ" کی توہین ہو۔ "حرم سرا" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں وہ فرمایا کرتے ہیں کہ میرے کتب خانے میں پہنچی ہوئی کتاب کو پھر کبھی ہوا نہیں لگتی۔ مجھے کتابیں صاف ستھری اور اُجلی رکھنے کا بڑا شوق ہے اور میرا یہ شوق جنوں کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔ میں یہ برداشت کر سکتا ہوں کہ میرا لباس اَدنا درجے کا ہو مجھے یہ گوارا ہوگا کہ زندگی میں کام آنے والی دوسری چیزیں گھٹیا قسم کی ہوں لیکن میں اِس امر کے لیے کبھی تیار نہیں ہوں گا کہ میری کوئی کتاب بھدی اور بدزیب ہو۔ کتابوں کے معاملے میں میں مرحوم مہدی افادی کی طرح نفاست پسند طبیعت کا مالک ہوں اور اُن کو اس قدر پاکیزہ رکھنے کا عادی ہوں کہ اُن پر اپنا نام تحریر کرنے سے بھی گریز کرتا ہوں۔ اِس سلسلے میں چند لطائف بیان کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

ایک پُرلطف واقعہ

میرے ایک مرحوم دوست نے ایک مرتبہ میری میز پر سے ایک کتاب اٹھائی جس کی جلد پر میں نے حفاظت کی غرض سے کاغذ چڑھایا ہوا تھا۔ اُنھوں نے اس کاغذ پر یہ الفاظ تحریر فرمائے اور کتاب میز پر رکھ دی:

خطرہ

۴۴۰ وولٹ

مت چھوؤ

میں نے یہ الفاظ پڑھے اور کافی دیر تک اُن کا لطف اٹھاتا رہا۔

ایک اور دلچسپ واقعہ

یہی عزیز دوست ایک دفعہ مجھ سے ایک کتاب مستعار لے گئے اور چند دنوں بعد لوٹا دی۔ میں نے کتاب اُن سے لے کر رکھ دی۔ میرے یہ دوست بیٹھے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اُنھوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا اس کتاب کی کوئی اور جلد بھی دستیاب ہو سکتی ہے۔ میں نے گمان کیا کہ انھیں شاید یہ کتاب پسند آگئی ہے۔ تصدیق کرنا چاہی تو فرمانے لگے کہ یہ بات تو نہیں البتہ اس کتاب کے سرورق پر میری بے احتیاطی سے ایک

بدنما سا دھبا لگ گیا ہے جسے آپ کا ذوقِ نفاست غالباً برداشت نہ کر سکے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے عوض آپ کو ایک دوسری کتاب دے سکوں جو عمدہ اور صاف حالت میں ہو۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے وہ دھبا دکھایئے تو سہی، بظاہر تو کوئی داغ دھبا نظر نہیں آتا۔ اس پر انھوں نے مجھے وہ دھبا دکھایا جس کا رقبہ بمشکل ایک نقطے کے برابر تھا۔ اُن کی اس نشان دہی پر بے اختیار ہنسی آگئی اور وہ بھی مسکرا دیے۔

خدا ایسے دوستوں سے محفوظ رکھے

آپ کا ایسے دوستوں سے بھی ضرور سابقہ پڑا ہو گا کہ وہ آپ سے ملاقات کی غرض سے تشریف لائے آپ کے کمرے میں بیٹھے اور میز پر رکھی ہوئی کتاب سے جسے آپ آج ہی خرید کر لائے تھے اور جسے آپ نے ابھی اچھی طرح دیکھا بھی نہ تھا کھیلتے رہے۔ آپ ان حضرت سے بخوبی واقف ہیں کہ اُنھیں کتاب ایسے مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن رخصت ہوتے وقت ان صاحب نے "میں ذرا یہ کتاب دیکھنا چاہتا ہوں کل واپس آجائے گی" کہا اور کتاب بغل میں دبا کر چل دیے اور آپ ہیں کہ "ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم" والا مضمون بن کر دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ ہائے مروّت تیرا ستیاناس! اس واقعے کو اب دو ماہ گزر چکے ہیں اور آپ اس دوران میں کئی مرتبہ تقاضا کر چکے ہیں، لیکن بے سود۔ آپ کے محترم دوست کی کل ختم ہوتے میں نہیں آتی۔ خیر خدا خدا کر کے وہ مبارک دن آیا کہ آپ کی کتاب آپ کو واپس ملی لیکن کس حالت میں؟ دو چار ورق غائب، دو چار پھٹے ہوئے اور جلد ٹوٹی ہوئی، پہلی نظر میں تو آپ گمان کرتے ہیں کہ شاید آپ سے مذاق کیا جا رہا ہے اور کوئی دوسری کتاب آپ کو دی جا رہی ہے لیکن جلد ہی یہ حقیقت آپ پر واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کتاب دراصل آپ ہی کی ہے۔ یہاں اس بات کا بھی خیال رہے کہ آپ کے یہ دوست اس کتاب کو صرف آپ کے ہاں سے اُٹھالے جانے کے گناہ گار ضرور تھے۔ قسم لے لیجیے جو اُنھوں نے اس کا ایک لفظ بھی پڑھا ہو۔ اب اگر آپ کتاب کے معاملے میں مجھ ایسے "بد دماغ" واقع ہوئے ہیں تو گھر پہنچتے ہی سب سے پہلا کام یہ کریں گے کہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے نذرِ آتش کر دیں اور آیندہ کتاب خریدنے یا مستعار دینے سے توبہ کر لیں۔

ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات

شرارت سب ہی بچے کرتے ہیں میرے بچے بھی شرارت کرتے ہیں گھر کی مختلف چیزیں گاہ بہ گاہ اُن کی شرارت کا نشانہ بنتی رہتی ہیں لیکن جہاں تک میری کتابوں کا تعلق ہے وہ بھی اُن کو ادب و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک دل چسپ واقعہ رونما ہوا۔ مَیں کھانا کھانے میں مصروف تھا کہ قریب ہی میز پر رکھی ہوئی ایک کتاب نیچے گر گئی۔ مَیں نے اپنے بچے سے کہا کہ بیٹا! اُسے اٹھا کر میز پر رکھ دیں۔ بچہ بجائے اس کے کہ کتاب کو اٹھا کر میز پر رکھتا دوڑ کر باہر نکل گیا۔ مجھے اُس کی اس حرکت پر بڑا غصہ آیا مَیں نے ذرا سخت لب و لہجے میں پوچھا "کہاں جا رہے ہو"، بچے نے ایک لمحے رُک کر کہا "ابھی آیا"، دو چار منٹ بعد لڑکا واپس آ گیا وہ اپنے ہاتھ دھو کر آیا تھا اور اب تولیے سے اُنھیں پونچھ رہا تھا مَیں نے دریافت کیا "کیا معاملہ تھا؟" کہنے لگا "میرے ہاتھ صاف نہیں تھے۔ ڈر تھا کہیں یہ نئی کتاب میلی نہ ہو جائے۔ اس لیے ہاتھ دھو کر آیا ہوں اور اب اٹھاتا ہوں"۔ چناں چہ لڑکے نے بڑی آہستگی سے کتاب کو اٹھا کر میز پر رکھ دیا۔ ایک اور موقعے پر جب مَیں کتاب "شاہ کار تصاویر" دیکھ رہا تھا میرا دوسرا بچہ آیا میرے پاس کھڑے ہو کر کتاب کو دیکھا اور چلا گیا کچھ دیر بعد پھر آیا تو اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں پر صاف ستھرا تولیا پھیلایا ہوا تھا اور کہہ رہا تھا کہ تھوڑی دیر کے لیے یہ کتاب مجھے دے دیجیے مَیں اسے تولیے پر رکھ کر دیکھوں گا اور میلا نہ ہونے دوں گا۔

چند دل چسپ سوالات

میرے ایک دوست نے ایک دفعہ ازراہِ تفنن فرمایا کہ "اس میں تو کوئی کلام نہیں کہ آپ اپنی پسندیدہ کتابیں خریدتے ضرور ہیں لیکن اس میں شبہ ہے کہ آپ ان کتابوں کو پڑھتے بھی ہوں گے میرا خیال ہے کہ آپ کی خرید کردہ کتابیں محض آپ کے کتب خانے کی زینت ہی بنتی ہوں گی اور مطالعے کے لیے وہی کتابیں آپ کسی لائبریری سے مستعار لاتے ہوں گے۔" فرمایئے میں اُن کو کیا جواب دیتا!

میرے ایک دوسرے دوست نے ایک روز مجھ سے ایک عجیب سا سوال کیا۔

وہ فرمانے لگے کہ آپ کی وفات کے بعد آپ کی ان کتابوں کا کیا ہوگا جن سے آپ جنون کی حد تک محبت کرتے ہیں۔ میں کوئی مناسب جواب سوچنے ہی لگا تھا کہ وہ خود ہی فرمانے لگے "ایک لطیفہ سنیے ایک انگریز عالم کو اپنا کتب خانہ اس قدر عزیز تھا کہ اُن کے علاوہ کوئی بھی اُن کی کتابوں سے استفادہ نہ کر سکتا تھا۔ اُن کے اس کلیے سے اُن کی اولاد بھی مستثنیٰ نہ تھی۔ اُن کے مرنے کا وقت قریب آیا تو کہنے لگے کہ مجھے میرے کتب خانے میں لے چلو۔ وہاں پہنچ کر اُنھوں نے اپنے بچوں کو وصیت کی کہ میرے بعد میری ہر چیز کے تم مالک ہو لیکن میری ان محبوب کتابوں کو یوں ہی مقفل رہنے دینا۔ کسی نے انھیں چھیڑا تو میری روح کو سخت اذیت ہوگی۔"

کتاب عروسِ نو کی مانند آراستہ و پیراستہ ہو

کتابوں کے متعلق میرا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ نفسِ مضمون دل چسپ، کتابت دل کش، طباعت دیدہ زیب، کاغذ نفیس، جلد عمدہ اور مضبوط اور گرد پوش جاذبِ نظر ہو یعنی کتاب حسنِ ظاہری و باطنی کا ایک پیکرِ جمیل ہو۔ جب وہ سامنے آئے تو ایسا معلوم ہو کہ آراستہ و پیراستہ کوئی عروسِ نو اٹھلاتی چلی آتی ہے۔ مجھے دورِ حاضرہ میں بے جلد کتاب دیکھ کر دلی افسوس ہوتا ہے اور حضرت اکبرالہ آبادی کا یہ شعر بے اختیار یاد آجاتا ہے۔

خدا کی شان وہ مِس بے حجاب ہو کے رہی
کتاب غیر مجلد خراب ہو کے رہی

کتابوں کے تعاقب میں

دو اہم کتابوں کی تلاش و کاوش کا افسانہ

اب یہ تو علم نہیں کہ یہ شعر کن صاحب کا ہے اور شعر بھی کیا اب تو صرف اس کا ایک ہی مصرع یاد رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ "بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے" تفصیل اس اجمال کی ضرور بیان کی جائے یہ فرمائش ہے مکرم دیرینہ اور حبیب مخلص سید انیس شاہ صاحب جیلانی کی کہ اس داستان کا ایک اہم کردار وہ خود بھی ہیں بات ۱۹۷۰ء کے اواخر کی ہے۔ اس سال ماہ نومبر کے "ہمدرد ڈائجسٹ" میں میرا ایک مضمون "میرا علی گڑھ" کے زیرِ عنوان شائع ہوا تھا۔

میر ولایت حسین صاحب کی اہم آپ بیتی

اس مضمون میں میں نے ایک مقام پر علی گڑھ کی داستانِ دل کش کے ضمن میں علی گڑھ کے دورِ سرسید کے طالب علم اور بعد ازاں اسی درس گاہ کے مشہور و معروف معلم میر ولایت حسین صاحب مرحوم اور ان کی آپ بیتی کا ذکر کیا تھا جسے تحریر فرما کر وہ مسودے کی صورت میں ۱۹۴۹ء میں اپنی وفات کے بعد اپنے لواحقین کے پاس چھوڑ گئے اور جس کا تلخص بعد ازاں "علی گڑھ میگزین" کے "علی گڑھ نمبر" میں علی گڑھ ہی کے ایک سپوت سید محمد صاحب ٹونکی کے قلم سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔ سید محمد صاحب ٹونکی نے لکھا تھا کہ میر صاحب نے اپنی سوانح لکھ کر جو احسان علی گڑھ پر کیا ہے اس کا اندازہ اُس وقت ہوگا جب وہ پوری چھپ کر منظرِ عام پر آئے گی اور لوگ دیکھیں گے کہ وہ اُن کی نہیں علی گڑھ کی بڑی سچی تاریخ ہے۔ میر صاحب کے متعلق اُنھوں نے بتایا کہ میر صاحب کی جامع شخصیت میں علی گڑھ کی پوری تحریک سموگئی تھی وہ کالج کی زندگی کے ہر پہلو میں موجود تھے۔ مشکلات سے گھبرانا، کام سے جی چرانا وہ جانتے ہی نہیں تھے۔ اُن کو

ذوقِ عمل اور قوتِ بازو پر بھروسا تھا۔ان ہی کے بل پر انھوں نے اپنی منزل طے کی اور سب پر اپنا سکہ جمایا۔علی گڑھ میں یہ کہاوت مشہور تھی کہ اگر آپ کسی مشکل میں گھرے ہوئے ہوں اور اس سے نکل نہیں پاتے آپ میر صاحب کو مدد کے لیے پکاریے وہ اُسے مغلوب کرلیں گے۔اس کہاوت کا تجربہ کیا گیا اور اُسے درست پایا گیا۔چناں چہ ہم بھی اس مضمون میں پیش کردہ میر صاحب کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوئے اور اصل کتاب کے اَن دیکھے دیوانے ہو گئے اور پورے بیس سال اس کے انتظار میں گزار دیے۔

"علی گڑھ نمبر" کی اشاعت کے بعد میر ولایت حسین صاحب کی آپ بیتی کا ذکر بعد ازاں ۱۹۵۸ء میں علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے نقیب پندرہ روزہ "علی گڑھ" میں بھی ہوا۔جو اُن دنوں میرے پاس آرہا تھا۔میں نے اس سلسلے میں ایڈیٹر صاحب "علی گڑھ" کو ایک تفصیلی خط لکھا جسے انھوں نے اپنے پرچے میں شایع کیا اور اس کا جواب بھی ساتھ ہی تحریر فرمایا کہ یہ کتاب عن قریب پریس کے حوالے کی جارہی ہے لیکن بعد ازاں معلوم ہوا کہ اُن کا جواب درست نہ تھا۔

سیّد محمد صاحب ٹونکی کی کوششیں

انھی ایام میں میں نے سیّد محمد صاحب ٹونکی کو بھی اس کتاب کے بارے میں خط تحریر کیا تھا۔اس کے جواب میں انھوں نے بڑے دکھ کے ساتھ فرمایا کہ "میر صاحب کی آپ بیتی کی اشاعت کے لیے میں نے مقدور بھر کوشش کی۔میر صاحب کے شاگرد ڈاکٹر سیّد محمود صاحب (سابق وزیرِ تعلیم بہار و سابق وزیرِ خارجہ ہند) سے بھی درخواست کی۔مسوّدہ کئی مہینے اُن کے پاس رہا لیکن چوں کہ کسی بڑے آدمی نے یہ کوشش نہیں کی تھی اس لیے کسی نے توجہ نہیں دی حالاں کہ اُن کی شخصیت اتنی گراں قدر ہے کہ مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا ظفر علی خاں، مولوی عبدالحق، سر سیّد راس مسعود اور نامعلوم کون کون اُن کے شاگرد تھے۔خود ان کی لائق و فائق اولاد موجود ہے لیکن اس تمام تر اہمیت کے باوجود یہ دل چسپ کتاب ہنوز مسوّدے کی صورت میں ہے اور کوئی صورت اُس کے چھپنے کی نظر نہیں آرہی ہے"۔میں مایوس ہو گیا اور زمانہ آہستہ آہستہ گزر کر ۱۹۷۰ء تک آگیا جب میں نے ہمدرد ڈائجسٹ کے مدیر

بالا شمارے میں اس کتاب کے متعلق اپنے جذبات و احساسات اور حسرت و حرماں کا ذکر کیا۔

مصنّفینِ اُردو

میرا یہ مضمون میر ولایت حسین صاحب کے بھتیجے سیّد زوّار حسین زیدی جوان دنوں لاہور میں قیام فرما ہیں کی نظر سے گزرا۔ ان کی مرتبہ فہرست کتب "مصنّفینِ اُردو" شائع کردہ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی اور ادیبوں اور شاعروں کے البم، میں ۱۹۳۹ء میں دورانِ قیامِ دہلی جب کہ میں اینگلو عربک کالج میں زیرِ تعلیم تھا دیکھ چکا بلکہ خرید بھی چکا تھا۔ "مصنّفینِ اُردو" کی قیمت صرف چار آنے تھی جب کہ اس کی ضخامت دو سو صفحات سے زیادہ تھی۔ "مصنّفینِ اُردو" اپنے موضوع پر غالباً پہلی ادبی کاوش تھی۔ مصنّفین کے ناموں کا سلسلہ حروفِ تہجی کے اعتبار سے تھا۔ ہر مصنّف کے مختصر حالاتِ زندگی، اس کی تصویر اور اُس کے بعد اس کی ادبی تخلیقات کا ہلکا سا تعارف نہایت دل نشین پیرائے میں پیش کیا گیا تھا۔ صرف مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی تصویر دینے سے گریز کیا تھا اور اُس کی بجائے غالب کا یہ شعر لکھ بھیجا تھا ؎

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکونامیِ فرہاد نہیں

اور نیچے دستخط ثبت تھے۔ "عبدالماجد دریابادی"۔ زوّار حسین صاحب نے مولانا کی تصویر کی جگہ اس شعر کی تصویر سے کام لیا اور یوں اپنی جدّتِ طبع کا ثبوت فراہم کیا۔

زوّار صاحب نے چوں کہ اُنھیں میرا پتہ معلوم نہ تھا ایڈیٹر صاحب "ہمدرد ڈائجسٹ" کے توسط سے ایک خط تحریر فرمایا جس میں اُنھوں نے مجھے بتایا کہ جس کتاب کے متعلق میں اس قدر بے چین اور پریشان ہوں وہ حال ہی میں علی گڑھ میں چھپ چکی ہے اور اس کی چند جلدیں میر صاحب کے عزیزوں کے پاس پاکستان بھی آچکی ہیں۔ ایڈیٹر صاحب "ہمدرد ڈائجسٹ" نے ازراہِ کرم وہ خط مجھے ارسال فرمادیا۔ ظاہر ہے کہ اس خبر نے میرے سمندِ اشتیاق پر تازیانے کا کام کیا۔ میں نے فوراً ہی زوّار صاحب کو اس خط کا جواب ارسال کردیا اور اُن سے درخواست کی کہ خدارا مجھے کسی نہ کسی طرح اس کتاب کا دیدار کرادیجیے

جس کے لیے میں کم از کم پندرہ سال سے منتظر چلا آتا ہوں اللہ بھلا کرے زوار صاحب کا کہ انھوں نے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے میر صاحب کے صاحب زادے سیّد مسعود زیدی صاحب ایم اے علیگ سے جو ماڈل ٹاؤن میں قیام پزیر ہیں یہ کتاب لے کر مجھے فوری طور پر ارسال فرمائی۔

میں نے اس کتاب کو ابھی پڑھنا ہی شروع کیا تھا کہ دو ایک روز بعد ایک صاحب کا کراچی سے خط ملا کہ وہ علی گڑھ سے آ گئے ہیں اور جناب سیّد محمد صاحب ٹونکی نے میرے لئے دو کتابیں اُن کے حوالے کی ہیں۔ انھوں نے دریافت کیا کہ کیا یہ پتا جس پر وہ مجھے خط لکھ رہے ہیں درست ہے تاکہ اس پتے پر کتابیں بھیج دی جائیں۔ پتا چوں کہ درست ہی تھا اس لیے مجھے ان کا یہ خط مل گیا تھا تاہم میں نے یہ سوچتے ہوئے کہ کہیں ان کا اشارہ ان کتابوں کے محصول ڈاک کی جانب نہ ہو اُسی روز دو رُپے کے ڈاک ٹکٹ اُن کو ارسال کر دیے۔ اب میں اپنی جگہ خوش تھا کہ لیجیے ہمارا جذبۂ صادق رنگ لایا اور جلد ہی ہم اپنی کتاب کے مالک بن جائیں گے۔ تاہم میری جلد بازی ملاحظہ ہو کہ میں نے میر صاحب کی آپ بیتی جس کا تھوڑا سا حصّہ ہی ابھی دیکھنے پایا تھا اسی روز زوار صاحب کو واپس کر دی۔

چند روز کے شدید انتظار کے بعد کراچی سے ایک چھوٹا سا رجسٹرڈ پیکٹ مجھے موصول ہوا جسے دیکھ کر میں حیران رہ گیا اور میرے ارمانوں پر اوس پڑ گئی کہ اس چھوٹے سے پیکٹ میں تو میر صاحب کی آپ بیتی کسی بھی طور نہیں سما سکتی چناں چہ اُسے کھولا تو اس میں سے ٹونکی صاحب کی دو چھوٹی چھوٹی کتابیں "آبگینے" اور "جامعہ کا بانی" برآمد ہوئیں خدا جانے میر صاحب کی آپ بیتی اُنھوں نے کیوں نہیں ارسال فرمائی۔ چناں چہ یہ مسئلہ پھر میرے لیے پریشان کن بن گیا کیوں کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد ہندستان سے کتابیں بذریعہ ڈاک آ جا نہیں رہی تھیں اور زوار صاحب کو میں دوبارہ تکلیف دینا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔

سیّد مبارک شاہ جیلانی

انھی ایام میں ایک روز زوار صاحب کا گرامی نامہ مجھے موصول ہوا کہ جن دنوں وہ دہلی

میں حالی پبلشنگ ہاؤس سے منسلک تھے ان کی ملاقات وہاں ریاست بہاولپور سے متعلق ایک بزرگ شخصیت سے ہوئی تھی جو سرگرم سفر تھے اور ہندستان بھر کے عالموں، ادیبوں اور شاعروں کی تحریریں، اشعار اور ر آٹو گراف ایک بیاض میں جمع کر رہے تھے میں چوں کہ اس سابق ریاست میں کافی دیر سے مقیم ہوں کیا میں ان کے متعلق یہ معلومات فراہم کر سکتا ہوں کہ اگر وہ زندہ سلامت ہوں تو اُن کا قیام ان دنوں کہاں ہے اس لیے کہ ان کی شدید خواہش ہے کہ وہ اس بیاض کو اگر وہ دست یاب ہو جائے کتابی شکل میں شایع کر ڈالیں۔

یہ خط پا کر میں نے ہر طرف نظر دوڑائی پوچھ گچھ کی لیکن کوئی شخص ایسا نہ ملا چناں چہ میں نے زوار صاحب سے اس سلسلے میں اپنی مجبوری کا اظہار کر دیا اور یوں یہ بات ختم ہو گئی۔

مبارک اردو لائبریری محمد آباد

۱۹۷۳ء کے آغاز میں جب میں طویل رخصت پر تھا میں نے انیس جیلانی صاحب سے جن سے میرے دس بارہ سال سے ادبی قسم کے غائبانہ مراسم چلے آ رہے تھے ملاقات کا پروگرام بنایا اور صادق آباد سے کوئی دس بارہ میل دور اُن کے گاؤں محمد آباد جا پہنچا محمد آباد ہمارے ملک کے دوسرے دیہات کی طرح ایک دور افتادہ گاؤں ہے لیکن اس گاؤں میں انیس شاہ جیلانی کے والد مرحوم سید مبارک شاہ جیلانی نے مبارک اردو لائبریری کی صورت میں علم و ادب کے جو مہکتے ہوئے پھول کھلائے ہیں وہ اُسے دیہات و قصبات چھوڑ شہروں تک سے کہیں زیادہ ممتاز اور سربلند بنائے ہوئے ہیں مبارک اردو لائبریری محمد آباد میں نامساعد حالات کے باوجود قدیم و جدید اردو مطبوعات کا ہزاروں کی تعداد میں ذخیرہ فراہم کیا گیا ہے اور پرانے رسائل تو اس کتب خانے میں اتنی بڑی تعداد میں موجود ہیں کہ بہاولپور ڈویژن میں شاید ہی کسی نجی کتب خانے میں یک جا ہوں پھر انیس شاہ جیلانی اپنے صاحب ذوق والد مرحوم کے صحیح جانشین ثابت ہوئے ہیں کتابوں سے عشق ان کی رگ رگ میں رچا ہوا ہے انھیں قلم پر پوری قدرت حاصل ہے جس کا بیّن ثبوت اُن کی تصانیف "دو نیاز فتح پوری" اور قاضی احسان احمد شجاع آبادی کی سیرت "قاضی صاحب" ہیں اور خطوط نویسی میں تو اُن کا جواب نہیں یہ دولت سو اُن کو بلا یقیناً خداداد ہے انھوں نے اپنے

والد کے علمی و ادبی ورثے میں جو روز افزوں اضافے کیے اس کے لیے میں ان کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

بیاض مبارک

محمد آباد میں میرے سہ روزہ قیام کے دوران میں سید انیس شاہ جیلانی نے جن مطبوعہ و غیر مطبوعہ ادبی نوادرات کی مجھے زیارت کرائی اُن میں اُن کے والد مرحوم کی ایک بیاض بھی تھی جس میں سید مبارک شاہ مرحوم نے ہندوستان بھر کے چیدہ چیدہ ادبا شعرا اور عالمانِ دین کے اوٹو گراف اور پیغامات جمع کیے تھے جن میں سے کچھ حضرات کے نام اس طرح لیے جا سکتے ہیں، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا ظفر علی خاں، بابائے اُردو مولوی عبدالحق، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا محمد الیاس، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا احمد علی، خواجہ حسن نظامی، ملّا واحدی، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر سید عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، مولانا عبدالمجید سالک، خواجہ محمد شفیع دہلوی، حضرت جگر مراد آبادی، حضرت سیماب اکبر آبادی، حضرت سائل دہلوی، حضرت بے خود دہلوی، حضرت احسان دانش، حضرت حفیظ جالندھری، مولانا ماہر القادری، نواب اسماعیل خان حضرت نیاز فتح پوری، حضرت جوش ملیح آبادی، مولانا چراغ حسن حسرت، جناب رئیس احمد جعفری، حضرت جوش ملسیانی، حضرت اسد ملتانی، جناب شاہد احمد دہلوی اور حضرت فراق گورکھپوری جب کہ دیگر حضرات سمیت یہ تعداد ایک سو چھ تک پہنچتی ہے۔ ظاہر ہے کہ سید مبارک شاہ جیلانی نے یہ کتنا بڑا اور انوکھی قسم کا کارنامہ انجام دیا تھا جب کہ اُن کی مالی حالت بھی چنداں خوش گوار نہ تھی۔ اس بیاض سے معلوم ہوا کہ سید مبارک شاہ جیلانی نے اس مقصد کے لیے کم از کم تین مرتبہ ہندوستان گیر سفر اختیار کیے تھے جن میں سب سے طویل سفر انھوں نے ۱۹۴۳ء میں کیا تھا اور اس سفر میں وہ پچاس سے زیادہ اکابر سے ملے اور ان کے اوٹو گراف حاصل کیے۔

اس بیاض پر جوں ہی میری نظر پڑی میں خوشی سے اچھل پڑا، انیس جو میرے قریب بیٹھے ہوئے تھے حیرانی سے پوچھنے لگے کیا ہوا؟ میں نے کہا جس کو ہر شب چراغ کی مجھے

ایک عرصہ سے تلاش تھی وہ ابھی ابھی آپ کے ہاں مل گیا۔ فرمانے لگے کیسے؟ اور میں نے وہ تمام داستان اُن کے گوش گزار کر دی۔ پھر میں نے محمد آباد ہی سے سید زوار حسین زیدی صاحب کو خط لکھ ڈالا کہ بھائی وہ صاحب تو کئی برس ہوتے مرحوم ہو چکے ہیں لیکن آپ کی مطلوبہ بیاض اُن کے صاحبزادے سید انیس شاہ صاحب جیلانی کے پاس محفوظ ہے۔ آپ اُن سے معاملہ طے کر لیجیے اور اس بیاض کو ضرور شائع کرا دیجیے۔ واقعی یہ متاع بے بہا اس قابل ہے کہ یہ ہر اُس شخص کے ہاتھوں میں پہنچے جسے علم و ادب سے ذرا بھی دل چسپی ہے۔

اب زوار حسین صاحب اور انیس صاحب میں باہمی خط و کتابت ہونے لگی معاملہ طے پا گیا اور انیس صاحب نے بلا کسی لالچ کے یہ بیش قیمت بیاض زوار صاحب کے حوالے کر دی جو کچھ عرصے بعد ہی "بیاضِ مبارک" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو گئی۔

سید زوار حسین زیدی ایک بہت ہی اچھے انسان ہیں کبھی لاہور جانا ہوا اور اُن سے ملے تو انھوں نے خاطر تواضع کی حد کر دی مگر مجھے اُن سے ایک شکوہ بھی ہے اور وہ یہ کہ انیس صاحب سے "بیاض مبارک" کا مسودہ لیتے وقت اُنھوں نے مجھے اپنے گرامی نامے میں تحریر فرمایا تھا کہ اس کتاب کے حصول کے سلسلے میں وہ میرا ذکر بھی ضرور کریں گے بلکہ اُنھوں نے اپنے قلم سے ایک اسکیچ بنا کر بھی میرے پاس بھیج دیا تھا جس پر میرا نام درج تھا وہ اگر فرماتے تو میں اُن کو ایک چھوٹا سا مضمون لکھ کر بھیج سکتا تھا لیکن جب کتاب چھپ کر منظرِ عام پر آئی تو نہ جانے ہم کیوں غائب تھے بہر حال ہمیں اپنے آپ پر ناز ہے کہ اُردو ادب کی ایک منفرد کتاب "بیاضِ مبارک" ہمارے توسط سے چھپی اور ملک کے ہر اچھے کتب خانے کی زینت بنی۔

میرے پچاس سال علی گڑھ میں

"بیاضِ مبارک" کا ذکر تو یہاں ختم ہوا لیکن میر ولایت حسین صاحب کی آپ بیتی کا قصہ رہا جاتا ہے سو وہ بھی سن لیجیے۔ دس اکتوبر ۱۹۷۵ء کا ذکر ہے اُس روز ہم صبح سویرے لاہور پہنچے اور سید زوار حسین زیدی صاحب کے درِ دولت پر حاضر ہوئے

زیدی صاحب نے ہمیں دیکھتے ہی کہا "دبھی وہ تایا صاحب (میر ولایت حسین صاحب) کی آپ بیتی یہاں پاکستان میں بھی چھپ گئی ہے۔" میں یہ سنتے ہی بے چین ہو گیا "کہاں چھپی"؟ "کیسی چھپی"؟ "کس نے چھپوائی"؟ "ناشر کون ہے"؟ "قیمت کیا ہے"؟ غرض سوالات کا ایک ہجوم اُمنڈ آیا۔

تحریک علی گڑھ پر بیش بہا تصنیف

زوار صاحب نے بتایا کہ کتاب کراچی سے شائع ہوئی ہے بہت اچھی چھپی ہے اور اسے میر صاحب کے صاحبزادے سید مسعود زیدی صاحب نے چھپوایا ہے قیمت بھی زیادہ نہیں صرف دس روپے ہے، سید مسعود زیدی صاحب کے متعلق اُنھوں نے بتایا کہ وہ ان دنوں کراچی گئے ہوئے ہیں۔

زوار صاحب سے فارغ ہو کر ہم اردو بازار کی طرف نکل گئے تاکہ کتاب اگر مل جائے تو اُسے خرید لیا جائے۔ ابھی بمشکل آٹھ بجے تھے اور اِکا دُکا ہی کوئی دکان کھلی تھی جہاں ہم نے اپنی مطلوبہ کتاب کے متعلق معلوم کیا لیکن کامیابی نہ ہوئی ہماری بے چینی کی کوئی انتہا نہ تھی اور ہم مزید دکانیں کھلنے کے انتظار میں بازار کے چکر پہ چکر لگا رہے تھے، خدا خدا کر کے کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد پورا بازار کھل گیا لیکن کتاب کو نہ ملنا تھا نہ ملی کیوں کہ اس کتاب کی جلدیں ابھی تک کراچی سے لاہور نہ پہنچی تھیں۔ آخر ہم اس کی تلاش میں پنجاب پبلک لائبریری اور وہاں سے پنجاب یونی ورسٹی لائبریری جا دھمکے لیکن توبہ صاحب کہیں بھی گوہر مراد نہ ملا۔ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری سے ہم باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ ہم کہیں کچہری روڈ کے آس پاس ہیں۔ کچہری روڈ سے ہمیں مکتبہ کارواں یاد گیا چناں چہ ہم وہاں پہنچ گئے۔ مکتبہ کارواں کے مالک چودھری عبدالمجید صاحب وہاں موجود تھے وہ بھی علیگ ہیں ہم نے اُن سے بھی اس کتاب کا ذکر کیا افسوس کہ ان کے ہاں بھی یہ کتاب دست یاب نہ تھی علی گڑھ سے میری دل چسپی کا ذکر سن کر چودھری صاحب نے مجھے بٹھا لیا اور اور چائے منگوالی۔

سید مسعود زیدی سے میری ملاقات

اس دوران میں مسعود زیدی صاحب کا ذکر بھی آگیا، چودھری صاحب نے کہا کہ زیدی میرے دوست ہیں اور کل وہ یہیں تھے اتنی جلدی کراچی کیسے پہنچ گئے اُنھوں نے اسی

وقت زیدی صاحب کو ٹیلے فون کیا زیدی صاحب تشریف نہیں رکھتے تھے۔ تاہم اُن کے ملازم سے معلوم ہوا کہ وہ یہیں ہیں لیکن کسی ضروری کام سے باہر گئے ہوئے ہیں اور دوپہر بعد لوٹیں گے زیدی صاحب کے متعلق یہ معلوم کر کے ہمیں کچھ اطمینان ہوا کہ چلئے وہ لاہور میں تو ہیں ملاقات ہو ہی جائے گی لیکن وقت گزارنا پھر دوبھر ہو گیا اللہ اللہ کر کے تین بجے ہم نے ماڈل ٹاؤن کا راستہ لیا اور زیدی صاحب کے دولت کدے پر جا صدا لگائی۔ اس وقت کوئی پونے چار ہو چکے تھے۔ ملازم نے بتایا کہ زیدی صاحب موجود ہیں لیکن سوئے ہوئے ہیں اور پانچ بجے بیدار ہوں گے۔ ملازم نے مزید کرم یہ کیا کہ اندر ڈرائنگ روم میں لے جا بٹھایا۔ جہاں ملحقہ کمرے میں زیدی صاحب آرام فرمارہے تھے۔ اب ہمیں مزید گھنٹہ سوا گھنٹہ اور گزارنا تھا اور یہ مرحلہ نہایت ہی کوفت طلب تھا لیکن ہماری خوش قسمتی ملاحظہ فرمایئے کہ کوئی پندرہ منٹ بعد ہی زیدی صاحب کے دو بے تکلف قسم کے دوست نازل ہو گئے اور انھوں نے شور مچا کر فوراً ہی اُن کو جگا ڈالا زیدی صاحب ڈرائنگ روم میں آئے تو ہم نے بھی اپنا تعارف کرایا اور میر صاحب کی آپ بیتی کے متعلق اپنے بیس سالہ اشتیاق کا پوری تفصیل کے ساتھ ذکر کیا۔

"میرے پچاس سال علی گڑھ میں": ایک بیش بہا تحفہ

زیدی صاحب میری باتوں سے بڑے متاثر ہوئے وہ اندر گئے اور وہاں سے اپنے والد مرحوم کی آپ بیتی "میرے پچاس سال علی گڑھ میں" کی ایک جلد لے کر آئے اور میرے قریب کرسی پر بیٹھ کر کتاب کے صفحۂ اول پر میرا نام اور ہدیے کے الفاظ لکھنے لگے میں نے دیکھا کہ اس کتاب پر کسی اور صاحب کا نام لکھا ہوا ہے جسے کاٹ کر زیدی صاحب میرا نام لکھنے لگے ہیں میں تلملا اٹھا یہ میرے ذوق نفاست کے خلاف تھا میں نے کہا زیدی صاحب ٹھہریے میرے لیے تو آپ دوسری جلد لایئے جس پر کسی اور کا نام لکھا ہوا نہ ہو۔ زیدی صاحب مسکرائے اُٹھ کر پھر اندر گئے اور دوسری جلد لا کر اس پر میرا نام لکھا اور ہدیتہً میرے حوالے کی۔ اپنی محبوب کتاب کے ملنے پر اور پھر ہدیتہً ملنے پر ہمیں جو مسرت ہوئی وہ ظاہر ہے لیکن اس سے زیادہ

مسرت، ہمیں اس وقت ہوئی جب ہم نے دیکھا کہ سید محمد صاحب ٹونکی نے اپنے پیش لفظ میں ہمارے خط کا بھی خصوصی طور پہ ذکر کیا ہے۔

اس کے بعد زیدی صاحب فرمانے لگے کہ قریشی صاحب میں اس وقت آپ کی کوئی اور تواضع نہ کر سکا کیوں کہ میں ان دونوں حضرات کے ہمراہ فوری طور پر باہر جا رہا ہوں۔ آپ یوں کیجیے کہ کل شام کو لاہور کے علیگ حضرات کے اس اجتماع میں جو ہیلی کالج اوف کامرس میں منعقد ہو رہا ہے میرے مہمان کے طور پر تشریف لائیے علیگ حضرات سے ملاقات کیجیے اور وہاں ماحضر بھی تناول فرمایئے چناں چہ اگلی شام ہم ہیلی کالج پہنچ گئے۔ وہاں ہم نے پرنسپل محمد مرتضیٰ خاں صاحب سے جو پرانے علیگ تھے ملاقات کی ان کے ہمراہ چائے پی اور ان سے اس امر کا وعدہ لیا کہ وہ بھی ہمارے مرتبہ مجموعۂ مضامین ''ذکرِ علی گڑھ'' میں شمولیت کی غرض سے علی گڑھ سے متعلق اپنے مشاہدات و تاثرات قلم بند فرمائیں گے۔ تھوڑی دیر میں علیگ حضرات آنا شروع ہو گئے۔ جن کی تعداد آہستہ آہستہ بڑھ کر اسّی نوّے تک پہنچ گئی بعض حضرات کو تو ہم نے دور سے دیکھنے پر اکتفا کیا لیکن بعض حضرات سے ہم نے خصوصی طور پر ملاقات کی ان میں ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، سید مسعود زیدی، علامہ شبّیر بخاری کے علاوہ سید نجم الحسن نقوی بھی تھے۔ نقوی صاحب کو دیکھ کر ہمیں بمبئے ٹاکیز کی تیار کردہ فلم ''بہنر ملن'' یاد آگئی جس کی ڈائرکشن ۱۹۴۳ء میں انھوں نے دی تھی فلم دیکھنے کا شوقِ فراواں تو ہمیں اس زمانے میں بھی نہ تھا کہ جب آتش جوان تھا تاہم سلیقے طریقے کی کوئی نہ کوئی فلم ہم ضرور دیکھ لیتے تھے۔

علیگ حضرات کی ایک یادگار تقریب

لیجیے دورِ رفتہ کی اس بھولی بسری یاد نے ہمیں کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔ خیر تو علیگ حضرات کے اس اجتماع نے سید مسعود زیدی صاحب کی صدارت میں پہلے ایک مجلسِ مذاکرہ کی صورت اختیار کی اور بعد میں وہ جلد ہی ایک محفلِ مشاعرہ میں تبدیل ہو گئی۔ پروگرام اچھا دل چسپ ثابت ہوا تاہم ہمیں اور دیگر حضرات کو علامہ شبّیر بخاری

کی وہ نظم بہت پسند آئی جو انھوں نے کبھی علی گڑھ پر لکھی تھی اور جس کا اعادہ اُنھوں نے
اس محفل میں سنا کر کیا تھا۔

اب صرف دعوتِ طعام باقی رہی جاتی تھی سو وہ بھی آخر کار رات کے دس بجے کے
قریب سامنے آگئی۔ یہ دعوت اپنے کھانوں کے لحاظ سے بڑی عجیب و غریب تھی، شاید علی گڑھ
کی ریت یہی تھی، نرم نرم گرم گرم سات پرتوں والے میدے کے پراٹھے، اشتہا انگیز خوشبو
سے بھرپور سیخ کے کباب اور سوجی کا خوش ذائقہ حلوہ،

دعوت کا شروع ہونا تھا کہ بوڑھے بوڑھے علیگوں میں وہ چھینا جھپٹی ہوئی کہ توبہ ہی بھلی۔
کباب سیخ خاص طور پر ان کا نشانہ تھے انھوں نے اپنے دورِ شباب کے علی گڑھ کو واپس
لانے کی پوری پوری کوشش کی تھی اور وہ اُسے واپس لے آئے تھے لیکن جلد ہی حالات
درست ہو گئے اور دعوت کا صحیح لطف محسوس ہونے لگا۔

رات کے گیارہ بجے ہم رخصت ہوئے تو یہ محفل ایک نہ مٹنے والے نقش کی صورت
میں قرطاسِ دل پر ثبت ہو چکی تھی۔

داستان اِک بے وفا کی!

حضرتِ صدق جائسی کی یادگار کتاب "دُربارِ دُربار" کا دلچسپ قصہ

دسمبر ۱۹۵۵ء کا ذکر ہے صحیح تاریخ یاد نہیں۔ مَیں ملتان کی پبلک لائبریری میں بیٹھا، کچھ ادبی رسائل سے دِل بہلا رہا تھا کہ میرے سامنے لائبریری کے ایک کارکن نے "ساقی" کراچی کا تازہ شمارہ لاکر رکھ دیا۔ مَیں نے زیرِ مطالعہ رسالے کو چھوڑ کر اُسے اٹھالیا اور اُس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اس مشغلے میں میری نگاہیں ایک مضمون پر آکر رُک گئیں۔ عنوان تھا "فانی کا آغاز و انجام" اور لکھنے والے تھے "صدق جائسی"۔ صدق جائسی صاحب اُردو کے ایک مشہور شاعر اور معروف ادیب ہیں اور شاعری میں اُستاذ السّلطان حضرت جلیل مینائی کو اپنا اُستاد تسلیم کرتے ہیں۔ ہاں تو یہ مضمون "فانی کا آغاز و انجام" مَیں نے پڑھنا شروع کیا تو پڑھتا ہی چلا گیا۔ بڑی دل چسپی سے اُسے ختم کیا اور ختم کیا تو تشنگی محسوس ہوئی اور میرے دل میں ھَل مِن مَزید کی طلب بھی ہوئی۔ شاہد احمد دہلوی صاحب مدیر "ساقی" سے رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ ابھی تو ابتدا ہے "آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟" دوسری قسط شائع ہوئی تو نقاش کے نقشِ ثانی کی طرح پہلی قسط سے بھی دل چسپ نکلی غرض مَیں "ساقی" اپنے نام جاری کرا بیٹھا۔ فانی کے آغاز و انجام کی یہ داستان جو بعد ازاں "دُربارِ دُربار" کے نام سے موسوم ہوئی کوئی ڈھائی سال تک ساقی کے اوراق کی زینت بنتی رہی اور کہیں مارچ ۱۹۶۰ء میں جاکر ختم ہوئی۔ یہ صرف پہلی جلد تھی اور ایسی ایسی تین اور جلدوں کا مواد صدق صاحب کے پاس اشاعت کے لیے موجود تھا۔ "دُربارِ دُربار" گو فانی کی حرماں نصیبی کی داستان تھی لیکن الف لیلہ کی طرح اور الف لیلائی رنگ میں بے شمار داستانیں اس داستان کے پہلو بہ پہلو

نمودار ہوتی رہیں، بعض انتہائی طرب ناک اور بعض غایت درجہ کرب انگیز۔ ان داستانوں میں آپ حیدرآباد دکن کے جونیئر پرنس شہزادہ معظّم جاہ کی محفلوں میں فانی، جوش، نجم آفندی، ماہر القادری، صدق جائسی اور خود رونقِ محفل شہزادہ معظّم جاہ کی گوناگوں اور رنگا رنگ جھلکیاں دیکھ سکیں گے۔

شہزادہ معظّم جاہ کی محفل کو میں ایک وسیع اور بارونق اسٹیج سے تعبیر کرتا ہوں۔ یہ لوگ اس اسٹیج پر اُبھرنے والے اداکار تھے۔ ان میں سے کچھ بے حد جاندار اور کچھ قطعی بے جان، لیکن شہزادے کی محفلوں کا رنگ کسی نہ کسی طرح نکھرتا ہی رہتا تھا۔ بقول مجاز لکھنوی:

یہ رنگِ بہارِ عالم ہے کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی
محفل تو تری سونی نہ رہی کچھ اُٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

ان لوگوں کے علاوہ حیدرآباد کے نظام نوّاب میر عثمان علی خاں اور اُن کے والد نوّاب میر محبوب علی خاں، اُن کے بڑے بیٹے شہزادہ اعظم جاہ، اُن کے استاد حضرت جلیل مینائی، جلیل کے استاد حضرت امیر مینائی، حضرت مرزا داغ دہلوی، شہزادی دُرِّ شہوار، شہزادی نیلوفر، مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ اور ریاست حیدرآباد کے دوسرے عالی مرتبت اور جلیل القدر رؤسا و اُمرا اپنے پورے جاہ جلال اور کرّوفر کے ساتھ صدق جائسی صاحب کے "دَربارِ دُربار" میں نمایاں ہیں۔

مارچ ۱۹۶۰ء میں "دَربارِ دُربار" کے حصہ اوّل کے اختتام کے بعد، جب "ساقی" میں تین چار ماہ تک حصۂ دُوم کی کوئی قسط شائع نہ ہوئی تو مجھے پھر اُسی تشنگی نے گھیر لیا۔ "مدیر ساقی" سے استفسار کیا تو پتا چلا کہ "ساقی" میں اب یہ سلسلہ شاید دوبارہ شروع نہ ہوگا۔ یہ خبر میرے لیے مایوس کن تھی تاہم اب میں نے یہ کیا کہ "ساقی" کے جن جن شماروں میں یہ قسطیں چھپی تھیں۔ اُن میں سے اُنھیں نکال کر ایک علاحدہ جلد مرتّب کی اور اُسے مجلّد کرا لیا۔ یوں "دَربارِ دُربار" کی جلد اوّل پہلی مرتبہ عالمِ وُجود میں آگئی۔ یہ جلد ہرچند مواد کے لحاظ سے مکمّل تھی لیکن میرے ذہن پر

حسن حسین اور دیدہ زیب کتاب کا تصور چھایا ہوا تھا وہ مجھے ہر دم بے چین اور مضطرب رکھتا تھا۔ میری خواہش تھی کہ کتاب دَربارِ دُربار کا انداز پیش کش بالکل ایسا ہی ارفع اور اعلا ہو جیسی شہزادہ معظم جاہ کی اپنی دل رُبا شخصیت اور اُن کے دَربارِ دُربار کی باوقار محفل ہے۔ مَیں اس کتاب کو حسین سے حسین تر شکل میں دیکھنے کا متمنّی تھا۔ ستمبر ۱۹۶۰ء میں مجھے معلوم ہوا کہ دَربارِ دُربار کا دوسرا حصّہ "نیرنگِ خیال" لاہور میں شائع ہو رہا ہے۔ ادارہ نیرنگِ خیال کو لکھا تو انھوں نے تصدیق کی کہ دُربارِ دُربار، اگست ۱۹۶۰ء سے "نیرنگِ خیال" میں پیش کی جا رہی ہے۔ چناں چہ نیرنگِ خیال "میرے نام آنے لگا۔

جائسی صاحب کے نام میرا تعریفی خط

انھی دنوں مَیں نے صدق صاحب سے رابطہ قائم کیا وہ بھارت کے قصبہ جائس ضلع رائے بریلی میں قیام فرما تھے۔ چناں چہ مَیں نے اُن کو ۸ اکتوبر کو جائس کے پتے پر ایک مفصّل خط تحریر کیا جس میں مَیں نے "دَربارِ دُربار" کی جی بھر کے تعریف کی اور اُن سے دریافت کیا کہ وہ "دربارِ دُربار" کی جلد اوّل کی اشاعت کے متعلق کیا کچھ کر رہے ہیں۔ مَیں نے اُن سے یہ بھی گزارش کی کہ دَربارِ دُربار، جہاں بھی چھپے بڑے ٹھاٹ باٹ کے ساتھ چھپے مَیں نے انھیں یہ بھی مشورہ دیا کہ کتاب کا سائز عام کتابی سائز نہ ہو بلکہ ذرا کھلتا ہوا اور جچتا ہوا سا ہو۔ اور اس میں حضرت مصنّف، حضرت فانی مرحوم، شہزادہ معظّم جاہ، شہزادہ اعظم جاہ، نوّاب میر عثمان علی خاں نظام دکن، شہزادی دُرِّ شہوار، شہزادی نیلوفر، اور مہاراجہ کشن پرشاد شاد وزیرِ اعظم دکن کی اعلا معیار کی تصاویر بھی شامل ہوں۔ اپنے اسی خط میں مَیں نے دَربارِ دُربار کی اُس انوکھی جلد کا بھی ذکر کیا جسے مَیں نے اپنی دل چسپی اور تسکین قلب کی خاطر مرتّب کیا تھا۔ میرے اس خط کا جواب صدق صاحب نے حسب ذیل خط کے ذریعہ حوصلہ افزا اور بہ واپسی ڈاک دیا۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ مَیں ہمیشہ اُن کو لفافہ بھیجتا رہا لیکن انھوں نے جواب کے لیے پوسٹ کارڈ ہی استعمال کیا۔

جائس ضلع رائے بریلی

۱۴ اکتوبر ۶۰ء

شفیقی زاد الطافکم ۔ تسلیم اخلاص تصمیم

نامۂ نامی شرفِ صدور لا کر میری دلی مسرت کا باعث ہوا۔ آپ نے میری سرگزشت کو اس قدر پسند فرمایا۔ اس مہربانی کا دلی شکریہ قبول فرمائیے۔

"دربارِ دُربار" کا حصّہ اوّل بھارت میں ایک معقول ناشر کو دے چکا ہوں۔ اگر لکھنؤ میں سیلاب نہ آجاتا تو اس کی طباعت کا کام شروع ہو جاتا ۔ پاکستان کے ناشر کتاب کو مفت لینا چاہتے ہیں۔ جن احباب نے اب تک کتاب کی طباعت کے لیے کراچی میں کوششیں کیں، اُن کو کامیابی نہیں ہوئی۔ رہی کتاب کی طباعت میں نفاست، اس کے لیے سرمایہ چاہیے۔ وہ کہاں سے لاؤں۔ مَیں نے انقلاب کے بعد بڑے نقصان اور خسارے کے ساتھ پنشن لی ہے۔ بھارت میں اُردو اور اُردو کے اچھے جاننے والوں کی کوئی قدر نہیں ورنہ میری بھی دلی تمنا تھی کہ کتاب بڑی نفاست کے ساتھ چھپتی۔

اگر آپ کسی ناشر سے معاملت کر سکیں تو بسم اللہ، مجھے کتاب کے چھپوانے میں عذر نہیں۔ مجھے آپ آمادہ سمجھیے۔ خلافِ مصلحت نہ ہو تو اپنا تعارف بھی کرا دیجیے۔ ملتان وطن ہے یا آپ بسلسلۂ ملازمت وہاں مقیم ہیں۔ اشغال کیا ہیں؟

"نیرنگِ خیال" میں اب تک صرف دو مضمون اگست اور ستمبر کے پرچوں میں نکلے ہیں۔ اگست کا پرچہ کاتب نے بالکل چوپٹ کر دیا۔ ستمبر نمبر غنیمت ہے۔ شاہد احمد صاحب اچھے لکھنے والے کی قدر نہیں کر سکتے۔ مَیں نے اُن کی ناقدری دیکھ کر "ساقی" سے کنارہ کشی کر لی۔ حکیم

یوسف حسین صاحب مدیر "نیرنگِ خیال"، قدر شناس آدمی ہیں۔
بہانیاں، ملتان کا کوئی قصبہ ہے یا محلّہ اور ملتان لاہور سے کتنے فاصلے پر ہے۔
میری تصویر اور فانی کی تصویر تو ان شاء اللہ کتاب میں ہوگی، مگر اعلیٰحضرت کی تصویر کے لیے اُن سے درخواست کرنی پڑے گی۔ اعظم جاہ کو اہلِ ادب سے کوئی دُور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ اُمید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے، والسلام

مخلص ——— صدق

صدق صاحب کا یہ خط مجھے مورخہ ۲۰ ۱/۲ کو موصول ہُوا۔ اس کا جواب مَیں نے مورخہ ۲۰ ۱/۲ کو تحریر کیا۔ مَیں نے اپنے اِس خط میں اُن سے دریافت کیا کہ "دربارِ دُربار" کے پاکستانی ایڈیشن کی اشاعت کے متعلق اُن کی شرائط کیا ہیں۔ ساتھ ہی مَیں نے اُن سے یہ بھی گزارش کی کہ وہ "دربارِ دُربار" کے ہندوستانی ناشر کے پتے سے بھی مطلع فرمائیں تاکہ اُن سے بھی یہ درخواست کی جائے کہ وہ کتاب کو عمدہ سے عمدہ طریقے پر شائع کریں اُس درخواست کے علاوہ میرا اس اطلاع سے اور کوئی مقصد نہ تھا لیکن صدق صاحب نے اپنے جواب میں یہ معلومات مہیا کرنے سے کسی وجہ سے گریز کیا جیسا کہ اُن کے خط کی اِس نقل سے جو نیچے پیش کی جارہی ہے ظاہر ہے۔ اِس کے علاوہ پاکستانی اور ہندوستانی ایڈیشنوں کی اشاعت کی شرائط میں بھی آپ پُورا ایک اور دو کا فرق ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

صدق جائسی صاحب کا دوسرا خط

جائس
۸ر نومبر ۶۰ء

شفیقی۔ سلام مسنون

کرم نامہ مورخہ ۲۰ر اکتوبر کا دِلی شکریہ۔ لکھنؤ کے ناشر صاحب سے یہ معاملت ہوئی ہے کہ وہ دو سو مجھے نقد دیں گے۔ کتاب چھپنے کے بعد پندرہ فی صد کے حساب سے رائلٹی ملا کرے گی، مگر پہلے یہ نقد رقم وضع

کر لی جائے گی۔ اُس کے بعد ہر شش ماہی پر حساب ہُوا کرے گا۔ ناشر دُنیائے ادب کے بہت بڑے آدمی ہیں۔ ابھی ان کا نام نامی بتانا مناسب نہیں۔ چند روز کے بعد مَیں آپ کو لکھ بھیجوں گا، مگر اُن سے رابطہ پیدا کرنا بے سُود ہو گا۔ وہ خود بڑے اہتمام سے کتاب شائع کریں گے۔

انھی شرائط پر آپ لاہور کے ناشروں سے بات چیت کر سکتے ہیں۔ کم از کم تین چار سو پیشگی مجھے نقد دے دیں۔ اُس کے بعد ۲۰ فی صد ہر شش ماہی پر رائلٹی دیا کریں۔ طباعت کے بعد ۲۰ کتابیں مؤلف کو دیں۔ اس سے زیادہ میرے شرائط نہیں، مگر ناشر ایسا معقول ہو جو اپنی زبان کا پابند رہے، جعل ساز اور دھوکے باز نہ ہو۔

آپ کے حالات کا علم ہُوا۔ نواب شیفتہ نے خوب کہا ہے:

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں
گُل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں

آج صبح سے احباب کے خطوط کا جواب لکھ رہا ہوں۔ اب سہ پہر کا وقت ہے۔ دماغ معطّل سا ہو رہا ہے۔ از راہِ کرم ناشر صاحبان سے معاملت کرنے میں عُجلت سے کام لیجیے گا۔ یہ کام اگر آپ کی وساطت سے انجام پا یا تو مَیں کمال شکر گزار ہوں گا۔

اُمید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ مَیں بفضلہٖ تعالیٰ اچھا ہوں، والسّلام

مخلص ——— صدق

مَیں نے صدق صاحب کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے کراچی اور لاہور کے دو تین تاجرانِ کتب کو جن سے میرے مراسم تھے "دَربارِ دُربار" کے حقوق خرید لینے کے متعلق خطوط تحریر کیے اور اُن سے اس سلسلے میں شرائط طلب کیں۔ صدق صاحب کو بھی مَیں نے اپنی سرگرمیوں کی تفصیل سے آگاہ کر دیا اور اُنھیں لکھ دیا کہ جن صاحب کی شرائط بہتر معلوم ہوئیں اُن سے اُن کو مطلع کر دیا جائے گا۔ میرا یہ خط پہنچنے پر صدق

صاحب کی جانب سے یہ خط ملا:

صدق جائسی صاحب کا تیسرا خط

جائس

۱۲، نومبر ۶۰ء وقتِ شب

مکرّم بندہ زاد لطفکم۔ تسلیم اخلاص تصمیم

مَیں کل ایک ہفتے کے بعد لکھنؤ سے واپس آیا۔ اور کتاب "دَربارِ دُربار" ناشر صاحب کے حوالے کر آیا۔ اُس کی طباعت کے لیے آپ بہت بے چین تھے۔ اللہ تعالیٰ نے غیب سے صُورت پیدا کردی۔ یہ کام بھارت میں ہوگیا۔ کراچی کی اُردو اکیڈمی "بھی "دَربار" کی اشاعت پر آمادہ ہے، مگر اشاعت سے پہلے پُوری کتاب کو دیکھنا چاہتی ہے۔ میرے پاس جو فائل تھی اُسے تو مَیں لکھنؤ کے ناشر صاحب کو دے چکا۔ اب اگر آپ اپنی فائل میرے دوست جناب سیّد شریف الحسن صاحب مدیر "نورس" کو دفتر "نورس" انجمن بنی باغ۔ پاکستان کوارٹرز۔ لارنس روڈ کراچی کے پتے پر بصیغۂ جوابی رجسٹری بھجوادیں اور اُن سے ذریعۂ خط ربط پیدا کریں تو پاکستان میں بھی اشاعت کا انتظام ہوجائے۔ مَیں سیّد شریف الحسن صاحب کو آپ کے متعلق لکھ چکا ہوں۔ وہ آپ کے عنایت نامے کے منتظر ہوں گے۔ آپ کی فائل میں جس نمبر کی کمی ہے، اسے اِن شاءاللہ مَیں پورا کردوں گا۔ ازراہِ کرم اُن سے بلاتاخیر ربط پیدا فرمایئے۔ فائل کے معاوضے میں مَیں اِن شاءاللہ آپ کو پُوری کتاب بھجوادوں گا۔

لکھنؤ کے ناشر مولوی عبدالحق صاحب کے گرتے اور درجے کے آدمی ہیں۔ اِن شاءاللہ اُن کے اہتمام میں کتاب بڑی نفاست سے شائع ہوگی مؤلف کی تصویر تو کتاب کے ساتھ شامل ہے۔ بلاک میری موجودگی میں تیار ہوگیا

تھا۔ اُسے دیکھ کر اور پسند کر کے پلٹا ہوں۔ اعلاحضرت اور پرنس کی تصویر کے لیے کوشش کروں گا کہ پاکستان کی اکیڈیمی کی اشاعت میں وہ کتاب میں شامل ہوں۔

اُمید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ مَیں بفضلہ تعالیٰ بہت اچھا ہوں۔ والسّلام

صدق

صدق صاحب اپنے خط میں مجھے جس فائل کو اپنے محترم دوست جناب سیّد شریف الحسن صاحب کے پاس بھجوانے کے متعلق تحریر فرما رہے ہیں یہ وہی "دَربارِ دُربار" کی فائل ہے جسے مَیں نے "ساقی" کے مختلف شماروں سے ترتیب دیا تھا اور جس کا ذکر مَیں ان ہی صفحات میں پیشتر کر چکا ہوں۔ "دَربارِ دُربار" کی اسی فائل کی وجہ سے مَیں "ساقی" کا پورے تین سال تک خریدار رہا اور کوئی تیس روپے "ساقی" کے چندے کی مَد میں صرف کر بیٹھا۔ مَیں سچ عرض کرتا ہوں کہ "دَربارِ دُربار" کی اِن قسطوں کے علاوہ مَیں نے "ساقی" میں شائع ہونے والے کسی مضمون سے کبھی کوئی دِل چسپی نہ لی۔ بہر حال یہ تیس رُپے قیمت کی ایک کتاب تھی جس پر رُپیہ سوا رُپیہ مزید خرچ کر کے مجھے اسے سیّد شریف الحسن صاحب کی خدمت میں کراچی بھیجنا تھا۔ آپ اندازہ کیجیے کہ جس کتاب پر ایک شخص نے اتنی رقم اور اتنا وقت "ضائع" کیا ہو وہ اُسے کس قدر عزیز ہو گی، لیکن صدق صاحب کا یہ خط موصول ہونے پر مَیں نے اِسے بغیر کسی اَدنا ہچکچاہٹ کے بذریعہ رجسٹری کراچی بھیج دیا محض اُن کے اس وعدے پر کہ وہ مجھے "دَربارِ دُربار" کے ہندُستانی ایڈیشن کی ایک جلد فراہم کر دیں گے۔ "ساقی" کی اس فائل کو مورخہ ۲۰؍۱۱ کو کراچی بھیجنے کے ساتھ ہی مَیں نے صدق صاحب کو بھی ایک خط تحریر کر دیا جس کا جواب مندرجہ ذیل مکتوب کی صورت میں اُن کی طرف سے موصول ہُوا۔

صدق جائسی صاحب کا چوتھا خط

جائس

۹؍ دسمبر ۶۶ء

کرم گستر سلام مسنون

نامۂ نامی مورخہ ۳۰ نومبر نظر افروز ہوا۔ یہ معلوم کر کے کہ آپ نے اپنے پاس کے پرچے سیّد شریف الحسن صاحب کو بھیج دیے۔ حد درجے ممنون ہوا۔ کسی ناشر کے لیے اتنا مواد کافی ہے۔ مارچ ۶۰ء میں حصّہ اول تمام ہو گیا۔ اگست سے نیرنگِ خیال میں دُوسرا حصّہ شروع ہے۔

...... صاحب مدیر ...... کراچی مجھے بھی جانتے ہیں۔ ان کو لکھنؤ ایڈیشن کی خبر ابھی دینا ہرگز مناسب نہیں۔

لکھنؤ کے ناشر صاحب مجھے طباعت کے بعد صرف دس جلدیں دیں گے جن میں آٹھ انعامی کمیٹی میں لکھنؤ چلی جائیں گی۔ میرے پاس دو رہیں۔ ان میں سے ایک آپ کی نذر کروں گا، دُوسری کہاں سے لاؤں کہ آپ سے دو کا وعدہ کر لوں۔ ورنہ بات معمولی تھی" دو کیا تین بھیج دیتا۔

دسمبر کے آخری ہفتے میں جب میں اِن شاء اللہ "دربار" کی اگلی قسطیں ایڈیٹر "نیرنگِ خیال" کے نام رجسٹری کرنے ڈاک خانے جاؤں گا، اُسی دن مینیجر رسالہ "کتاب نما" مکتبۂ جامعہ دلّی کے نام ایک رُپے کا منی آرڈر بھی کر دوں گا، جائس کا ڈاک خانہ قصبے کے باہر ہے اور مجھے وہاں تک جانے میں تکلیف ہوتی ہے۔ بس اسی کام سے جس کا حوالہ دے چکا، مہینے میں صرف ایک بار جاتا ہوں۔ آپ اطمینان رکھیں، رسالہ آپ کے نام جاری ہو جائے گا۔

...... صاحب کو کتاب "دربار" لے لینے اور اس کی اشاعت کے متعلق توجہ دلوایے۔ سرِدست وہ مجھے پانچ سو نقد دیں اور ۲۰ فی صدی رائلٹی دینا منظور فرمائیں۔ جو رقم وہ نقد دیں گے وہ پہلے ایڈیشن کو فروخت کر کے میری رائلٹی کی رقم سے وضع فرمالیں۔ اُس کے بعد رائلٹی کا حساب چالو ہو گا۔ حتی الامکان کتاب کی طباعت میں عجلت سے کام لیجیے۔ امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ والسلام

مخلص —— صدق

میں نے صدق صاحب کو اپنے خط مورخہ ۳۰/۱۱/۶۰ میں یہ تحریر کیا تھا کہ وہ براہِ کرم مجھے "دربارِ دُربار" کے ہندستانی ایڈیشن کی دو جلدیں ارسال فرمائیں۔ اس کے جواب میں اُن کا فقرہ "دوسری کہاں سے لاؤں" اُن کی کتنی بے بسی کو ظاہر کرتا ہے۔ کیا واقعی وہ اس قدر بے بس تھے میں ان ہی دنوں مکتبہ جامعہ دہلی کا کتابوں کے موضوع سے متعلق ماہنامہ "کتاب نما" اپنے نام جاری کرانا چاہتا تھا لیکن کوئی مناسب ذریعہ اُس وقت موجود نہ ہونے پر میں صدق صاحب کو اس کام کے لیے لکھ بیٹھا۔ اس رسالے کا سالانہ چندہ محض ایک رُپیہ تھا۔ صدق صاحب نے اپنے خط میں مجھے اس سلسلے میں اطمینان دلانے کی کوشش کی ہے لیکن اُنھوں نے اپنے اس وعدے کو کہاں تک پورا کیا اس کے لیے تھوڑا سا انتظار کیجیے اور اگلے خطوط ملاحظہ فرمائیے۔ اس خط میں صدق صاحب کا رائلٹی کی پیشگی رقم کو تین چار سو سے پانچ سو تک پہنچا دینا بھی قابلِ غور ہے۔ بہر حال مورخہ ۱۵/۱۲/۶۰ کو میں نے صدق صاحب کو اُن کے اس خط کا جواب بھیج دیا۔ اُن کی جانب سے کوئی جواب موصول نہ ہونے پر میں نے ۱/۱/۶۱ کو ایک خط اور تحریر کیا۔ جس کا جواب صدق صاحب نے مورخہ ۲۱/۱/۶۱ کو دیا جو درج ذیل ہے:

صدق جائسی صاحب کا پانچواں خط

کوٹھی شہزادہ صاحب رائے بریلی

۲۱-۱-۶۱

مکرمی تسلیم

۱۴ رجب مطابق ۲ جنوری ۱۹۶۱ کو میری لڑکی کا عقد تھا۔ بفضلہ یہ رشتہ پاکستان ہی میں ہوا ہے، ۱۰ جنوری کو میں جائس کی سکونت ترک کر کے رائے بریلی منتقل ہو گیا۔ اُدھر عقد کی مصروفیت اِدھر منتقلی کی گڑبڑ اس میں آپ کو خط نہ لکھ سکا اور اُنھی دو گڑبڑوں میں آپ کا وہ خط بھی کھو گیا جس میں آپ نے دہلی کے ادارے کو ایک رُپیہ بھیج

کہ کوئی رسالہ یا فہرست بھجوانے کی مجھ سے فرمائش کی تھی۔ ازراہِ کرم مجھے مکرّر پتا عنایت فرمائیں تاکہ اُس کی تعمیل کر دی جائے۔

کل شام کی ڈاک سے شریف الحسن صاحب کا عنایت نامہ مِلا ہے اُنھوں نے اطلاع دی ہے کہ کتاب "دو دَر بار"، جن شرائط پر ..... اکیڈیمی لینا چاہتی ہے اُس کے متعلق ...... صاحب نے تفصیلی شرائط مجھے آپ کے توسط سے لکھ بھیجے ہیں۔ تعجب ہے کہ آپ نے، جن کو کتاب کی طباعت کی اس قدر جلدی تھی، مجھے اب تک اطلاع نہیں دی۔ مَیں یکم جنوری سے ۱۶ جنوری تک جیسا مصروف رہا وہ نہ پوچھیے۔ احباب کے خطوط جو جائس سے واپس ہو کر مجھے یہاں ملتے تھے، سب بے جواب پڑے رہے۔ ۱۷ جنوری سے اُن کے جواب لکھ رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

مخلص ــــــ صدق

مغربی پاکستان میں نوابشاہ ایک ضلع ہے۔ اُس کی آب و ہوا کیسی ہے؟ کیسا مقام ہے؟ آپ ازراہِ کرم معلومات حاصل کر کے مجھے مطلع فرمائیں۔ زیادہ تر آبادی کن لوگوں کی ہے؟

صدق

لیجیے صدق صاحب میرا ۳۰ نومبر والا خط ہی کھو بیٹھے اور ساتھ ہی میرا وہ خط بھی جو مَیں نے اُن کو ایک تاجرِ کتب دوست کی شرائط سے مطلع کرنے کے لئے لکھا تھا۔ خیر نقل مکانی اور شادی بیاہ کی مصروفیات میں ایسا ہو بھی جاتا ہے۔ مجھے اس سلسلے میں اُن سے کوئی شکایت نہیں۔ مَیں نے اُن کے خط کی آمد پر اُسی روز یعنی مورخہ ۲۶ کو ایک اور خط اُن کو لکھ ڈالا جس میں اُن شرائط کو دوبارہ نقل کیا۔ رسالہ "کتاب نما" کا پتا پھر ان کو تحریر کیا اور اُن سے یہ بھی دریافت کیا کہ "دو دَربار دُربار" کے ہندستانی ایڈیشن کی اشاعت کا مسئلہ اب کس مرحلے پر ہے۔ اس خط کا جواب نہ ملنے پر مَیں نے ایک خط اُن کو فروری

میں تحریر کیا۔ یہ خط بھی اُن سے کوئی جواب نہ لا سکا۔ آخر مارچ کے دوسرے ہفتے میں پھر اُن کو ایک خط ارسال کیا گیا۔ خدا خدا کر کے صدق صاحب اس قابل ہوئے کہ وہ مورخہ ۲۳/۳/۶۱ کو یعنی پورے دو ماہ کے بعد مجھے جواب سے نواز سکیں۔ اُن کا یہ جواب حسب ذیل ہے:

صدق جائسی صاحب کا چھٹا خط

کوٹھی شہزادہ صاحب رائے بریلی، یو پی

۲۳ مارچ ۶۱ء

مکرّمی تسلیم

عید کی مبارک باد کا دلی شکریہ، میری طرف سے بھی عید کی تہنیت قبول فرمایئے۔ آپ کو میری مصروفیتوں کا علم نہیں کل ہی دوپہر کو رات بھر کا جاگا ہوا ایک مشاعرے کی محفل میں شرکت کر کے واپس آیا ہوں۔ اگلے عنایت ناموں کا جواب اس لیے نہیں لکھ سکا کہ آپ کے مخلص کرم فرما ..... صاحب نے کتاب کی طباعت کے سلسلے میں معاہدے کا جو مسودہ آپ کی معرفت میرے پاس بھجوایا تھا وہ صداقت سے یکسر معرا تھا۔ کتاب کا مسودہ اُن کے پاس دو ہفتوں سے موجود اور عبارتِ معاہدہ یہ کہ مسودہ ملنے پر وہ کتاب کی ایک مناسب قیمت مقرر کریں گے اور اس کا چوتھائی جو کُل کتاب کی فروخت کے بعد انھیں مل سکتا ہے مجھے پیشگی ادا کریں گے۔ خدارا ایسے صاحبان سے معاملت نہ کرایئے۔ باور نہ ہو تو شریف الحسن صاحب کو لکھ کر دریافت کر لیجیے کہ مسودہ ملتے ہی اُنھوں نے ..... صاحب کے حوالے کر دیا تھا اور وہ پوری کتاب کا مسودہ رکھے ہوئے آپ کا اور میرا وقت ضائع کر رہے تھے۔ ان حالات میں مَیں نے خاموشی ہی کو بہتر جانا۔ اس کے علاوہ کراچی کے بعض معتبر احباب

نے بھی مجھے اُن سے محتاط رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ اُن کے معاہدے کی عبارت نے مزید تصدیق اور توثیق کر دی:

"خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے

مجھے کچھ معلوم نہیں کہ لکھنؤ میں کتاب طباعت کی کس منزل میں ہے، نہ مجھے اتنا وقت مِلتا ہے کہ ناشر صاحب سے مراسلت کرتا رہوں۔ اُمید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ والسلام

مخلص ـــــ صدق

صدق صاحب کا یہ جواب بے اعتنائیوں اور تلخیوں سے کس قدر بھرپور ہے۔ اس کے لیے اُن کے مکتوب کے یہ ٹکڑے بہترین شاہد ہیں۔ "آپ کو میری مصروفیتوں کا علم نہیں"، "مجھے کچھ معلوم نہیں کہ لکھنؤ میں کتاب طباعت کی کس منزل میں ہے"، "نہ مجھے اتنا وقت ملتا ہے کہ ناشر صاحب سے مراسلت کرتا رہوں" پھر میرے ناشر دوست کے لیے "صداقت سے یکسر معرّا"، "خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے"، کے الفاظ کس قدر "دل خوش کن" ہیں۔ حالانکہ اُن بے چاروں کی شرائط نہایت مناسب تھیں لیکن اس کا کیا علاج کہ صدق صاحب کے مطالبات ہندوستان میں کچھ اور پاکستان میں کچھ ہیں۔ وہاں وہ دو سو روپے پیشگی پر رضامند ہو جاتے ہیں اور یہاں تین سو چار سو کا مطالبہ کرتے ہیں۔ پھر تین چار سو کو بڑھا کر پانچ سو پر آتے ہیں۔ ہندوستان میں وہ ناشر سے دس کتابیں لیتے ہیں اور پاکستان میں اُس کی بیس جلدیں طلب فرماتے ہیں۔ آخر حرص کی کوئی انتہا بھی! میں نے "کتاب نما" کے سالانہ چندے کے سلسلے میں اُن سے ایک رُپیہ ارسال کرنے کی جو گزارش کی تھی اُس کا ذکر ہی مفقود ہے۔ اس کو کہتے ہیں:

کیسی آنکھیں پھیرلیں مطلب نکل جانے کے بعد

"دَربارِ دُربار" کی فائل میں صدق صاحب کے حوالے کر ہی بیٹھا۔ اب اُنھیں میرے خطوط کے جواب دینے کی پرواہی کیا۔ ویسے بھی وہ بڑے آدمی ٹھہرے، خیر، میں نے اُن کو اس مرحلے پر ایک سخت سا خط ضرور لکھ ڈالا تاکہ اِن لوگوں کو ذرا معلوم تو ہو جائے

کہ "ہم بھی مُنھ میں زبان رکھتے ہیں"، میرے اس "عتاب نامے" (بقول صدق صاحب) کا جواب خدا کا شکر ہے مجھے ذرا جلد ہی مل گیا، آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

صدق جائسی صاحب کا ساتواں خط

کوٹھی شہزادہ صاحب رائے بریلی

۵؍اپریل ۶۷ء

جناب بندہ تسلیم

آپ کا عتاب نامہ ملا۔ قصور یہ کہ جو واقعہ سید شریف الحسن صاحب نے مجھے لکھ بھیجا تھا وہ مَیں نے آپ کو لکھ دیا۔ آپ نے میری درخواست پر اپنی فائل شریف الحسن صاحب کو بھیج دی یہ مجھ پر احسان فرمایا، لیکن اہلِ کرم احسان کر کے جتاتے نہیں پھرتے نہ کہ خود اسی سے جس پر احسان کیا ہو۔ کراچی کی دو معزز اور معتمد ہستیوں نے مجھے اطلاع دی تھی کہ اس معاملت میں جو آپ کے مخلص دوست سے ہونے والی تھی مَیں محتاط رہوں۔ شریف الحسن صاحب کو مَیں نے لکھ دیا ہے۔ وہ آپ کی فائل بذریعہ رجسٹری آپ کو واپس کر دیں گے، بشرطیکہ وہ اُسے آپ کے مخلص دوست سے حاصل کر سکے ہوں۔ آپ کو لازم تھا کہ پیشتر واقعے کی تحقیقات کر لیتے اس کے بعد برافروختہ ہوتے۔ بڑائی صرف اللہ کی ذات پاک کے لیے ہے۔ بندوں میں نہ کوئی چھوٹا ہے نہ بڑا۔ میرے ساتھ ہی آپ اپنی پسندیدہ کتاب سے بھی برہم ہو گئے۔ یہ بھی منظور:

صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا
لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

ایک رُپیہ کی تو کوئی حقیقت نہ تھی بڑا سوال ڈاک خانے تک جانے کا تھا جو میری قیام گاہ سے دُور ہے۔ ٹھنڈے وقت منی آرڈر ہوتا نہیں،

لکھنؤ کے ناشر سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم اے ریٹائرڈ اردو پروفیسر لکھنؤ یونی ورسٹی ہیں۔ کتاب ختم کے قریب ہے۔ کاتب چوں کہ درجۂ اوّل کا ہے اس لیے اتنی تاخیر ہوئی۔ بس اب خدا حافظ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش و خرم رکھے۔ والسلام

مخلص صدق

صدق صاحب اس بات پر ناراض ہو گئے کہ مجھ جیسے چھوٹے آدمی نے ان ایسے بڑے آدمی پر احسان کر کے اُسے جتایا کیوں لیکن خود اُن سے کوئی احسان مجھ چھوٹے آدمی پر نہ ہو سکا یعنی صرف ایک رُپے کے منی آرڈر کا قصّہ آخر کار وہ گول ہی کر گئے۔ باقی رہا فائل کی واپسی کا معاملہ تو وہ معلق ہی رہا، کیوں کہ پاکستان میں انجمن ترقّیِ اُردو سے معاملت ہو جانے پر یہ فائل انجمن کے حوالے کر دیا گیا تھا جیسا کہ آگے پیش کیے جانے والے خط سے ظاہر ہے۔ بہر حال ایک مہینہ، دو مہینے، حتّیٰ کہ پورے چھ ماہ اُس کے انتظار میں گزر گئے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو اس عرصہ میں چھ خطوط تو اُن کو ضرور ہی لکھے گئے ہوں گے لیکن میرے مہربان صدق صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔ وہ تو اتنے آزاد ہوئے کہ انھوں نے "صاحب" کی چیخ پکار پر پھر کان ہی نہ دھرے لیکن خدا جانے ۴ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو آپ کو مجھ ناچیز پر کیا ترس آیا کہ یہ خط بھیجنے کی تکلیف گوارا فرمائی۔

صدق جائسی صاحب کا آٹھواں خط

رائے بریلی

۴ اکتوبر ۶۱ء

شفیقی تسلیم

لکھنؤ میں کتاب مطبع میں جا چکی ہے عجب نہیں کہ اسی مہینے میں بازار میں آجائے، ورنہ اگلے مہینے میں ضرور آجائے گی۔ پاکستان میں مولوی عبدالحق صاحب نے چھ سو میں خرید لیا۔ اب فائل کے بدلے چھپی چھپائی کتاب ہی

اِن شاء اللہ آپ کو پہنچے گی۔ مجھے آپ کی مہربانی بھولی نہیں اور نہ بھولے گی
ناشر صاحب نے آٹھ نسخے مجھے دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اُن میں سے
ایک آپ کا ہے، دوسرا حصّہ بھی قریب قریب تیار ہے۔ پہلا حصّہ جو مطبع میں
ہے ۲۳۸ صفحات کا ہے۔ یہی حجم اِن شاء اللہ چاروں حصّوں کا رہے گا۔
اُمید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے،

ناچیز صدق

صدق صاحب کا یہ خط پاکر مَیں اکتوبر اور نومبر دو ماہ بالکل خاموش رہا اور اُس
نیک ساعت کا انتظار کرنے لگا جب پوسٹ مین اچانک "دردربار دُربار" کا رجسٹرڈ پیکٹ
مرسلہ صدق صاحب مجھے تقسیم کرنے کے لیے لے کر آئے گا، لیکن توبہ کیجیے صاحب یہ نیک
ساعت نہ آنی تھی اور نہ آئی۔ ایک خط دسمبر میں اُن کو لکھا لیکن جواب ندارد، پھر جنوری میں
ایک خط اور تحریر کیا لیکن اُن کی وُہی خاموشی، آخر ۲۱ر فروری ۱۹۶۲ء صدق صاحب کے
نامۂ رنگین رقم نے یہ مژدہ سُنایا کہ:

صدق جائسی صاحب کا نواں خط

کوٹھی شہزادہ صاحب رائے بریلی

۱۶ر فروری ۶۲ء

مکرّمی تسلیم

آپ کے دونوں عنایت نامے وقت پر ملے تھے مگر میں اپنی غیر معمولی
مصروفیت کی وجہ سے بروقت جواب نہ دے سکا۔ کتاب دسمبر ۶۱ء ہی میں
چھپ کر سیّد مسعود حسن صاحب رضوی ایم۔ اے ادیبؔ کے گھر پر آگئی تھی
مگر بدقسمتی سے وہ اُسی وقت سے سخت علیل ہیں۔ اس لیے کتابوں کے
بنڈل جوں کے توں اُنھی کے یہاں رکھے ہوئے ہیں، مَیں نے اب تک
کتاب کی صورت نہیں دیکھی۔ یہ حالات ہیں۔ ان حالات میں بجز صبر چارہ

کارہی کیا ہے۔ خدا اُن کو بیماری سے نجات دے۔ غسلِ صحت کریں تو کام آگے بڑھے۔ کتاب مجھ تک پہنچے تو مَیں آپ کو بھیجوں مگر جس اہتمام و نفاست سے آپ اُس کی پیکنگ چاہتے ہیں۔ وہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ نہ اتنی مجھے فرصت ہے کہ حرف بحرف آپ کے حکم کی تعمیل کر سکوں۔ معمولی پیکنگ کے ساتھ اِن شاء اللہ کتاب حاضر کی جائے گی۔ اُمید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ والسلام

نیازمند صدق

اِسے کہتے ہیں "آسمان سے گرا اور کھجور میں اٹکا" یعنی کتاب چھپی تو ناشر صاحب بیمار پڑ گئے۔ اب ہم نے روزانہ اللہ تعالےٰ کی درگاہ میں گڑگڑا گڑگڑا کر یہ دُعا مانگنا شروع کی کہ الٰہی تو رضوی صاحب کو جلد از جلد شفائے عاجلہ وصحتِ کاملہ عطا فرما تاکہ وہ آٹھ کتابیں صدق صاحب کو بھیجیں اور صدق صاحب اُن میں سے ایک جلد اس حقیر پُرتقصیر کو عنایت فرمائیں۔ صدق صاحب سے مَیں نے اپنے اِن دو خطوط میں یہ بھی گزارش کی تھی کہ وہ اس کتاب کا پیکنگ ذرا عمدگی سے کروائیں تاکہ اُس کی جلد نہ ٹوٹنے پاتے۔ میری اِس گزارش کا جو اُن پر جو اثر ہوا وہ اس خط کی عبارت سے ظاہر ہی ہے۔ ہاں تو یہ پیکنگ کا قصّہ بیچ میں آن ٹپکا، میں دُعا کے متعلق عرض کر رہا تھا۔ تو صاحب دُعا مانگنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ کچھ دنوں دُعا مانگنے کے بعد ہم نے اس کا اثر دیکھنے کی خاطر پھر صدق صاحب کو یاد کرنا شروع کیا۔ مارچ، اپریل اور مئی کے مہینے تمام اُن کی یاد میں بسر ہوتے۔ جون کی ابتدا ہوئی تو ایک روز بے چارے مائل بہ کرم ہو ہی گئے اور اُن کا مکتوب گرامی مرقومہ ۸ر جون ۶۲ء ہمارے لیے سرمۂ نظر بن کر آیا۔ آپ بھی اس سے آنکھیں ٹھنڈی کر لیں۔

صدق صاحب کا دسواں خط

کوٹھی شہزادہ صاحب رائے بریلی

۸ر جون ۶۲ء

مکرم و محترم زاد لطفہٗ سلام مسنون

کتاب "دربارِ دُربار" چھپ گئی اور ایسی چھپی کہ لکھنؤ میں کوئی دوسرا ناشر اس نفاست سے ہرگز نہ چھاپ سکتا، مگر پروف ریڈر کی بے توجہی سے ۶۰، ۷۰ غلطیوں کی بھی حامل ہے۔ مَیں نے ناشر صاحب کو وہ غلطیاں لکھ کر بھیج دی ہیں۔ غلط نامہ بھی چھپ جائے جب کہیں وہ کتاب آپ کو بھیجنے کے قابل ہو۔ پاسپورٹ مجھے مل گیا ہے۔ ان شاء اللہ اگست کے مہینے میں کراچی حاضر ہو کر کتاب آپ کی خدمت میں پیش کر سکوں گا۔ تین رُپے آٹھ آنے قیمت ہے۔ کاغذ چکنا اور سفید ہے۔ خود پیش کرنے میں یہ بھی فائدہ ہے کہ آپ سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔ جہانیاں کراچی سے کس قدر فاصلے پر ہے؟ اگر تین مہینے صبر کے ساتھ آپ انتظار نہیں کر سکتے تو ناشر صاحب کا پتا بھی لکھ دیتا ہُوں، مگر مجھے تو بہرحال ایک کتاب آپ کو نذر کرنی ہے۔ ناشر صاحب کا پتا!

جناب سیّد مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم اے

ادبستان، کتاب نگر، دین دیال روڈ۔ لکھنؤ

اُمید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ اس عرصے میں آپ نے ملازمت میں کیا ترقّی کی۔ کراچی آپ آسکیں گے یا مجھے جہانیاں حاضر ہو کر شرفِ نیاز حاصل کرنا پڑے گا۔ والسلام

نیاز آگیں ——— صدق

لیجیے یک نہ شد دو شد، خدا خدا کر کے ناشر صاحب تندرست ہوئے تو کتاب "بیمار" پڑ گئی۔ اب صدق صاحب بطورِ تعویذ کے اغلاط نامہ مرتّب فرمائیں گے، وہ چھپے گا، کتاب میں شامل ہوگا، تب کہیں جا کر کتاب تندرست ہوگی اور ہمیں ملے گی اور وہ بھی اُس وقت جب تین ماہ کے بعد صدق صاحب پاسپورٹ لے کر کراچی تشریف لائیں گے اور ہمیں کم از کم سو

رُپیہ خرچ کر کے اور چھ سو میل کا فاصلہ طے کر کے اُسے کراچی میں صدق صاحب سے حاصل کرنا پڑے گی۔ بصورت دیگر صدق صاحب کو جہانیاں تشریف لانے کی تکلیف دی جائے گی اور انہیں یہاں دو چار پُر تکلف دعوتیں کھلا کر یہ کتاب اُن سے حاصل کی جائے گی۔ چناں چہ مَیں نے صدق صاحب کو مورخہ ۲۶ ۲ ۲۰۰۱ کو جس دن مجھے اُن کا یہ خط ملا لکھ دیا کہ آپ براہِ کرم اغلاط نامہ مرتب کرنے کے چکر میں نہ پڑیے اور اس بدعت کو جو آج سے پچاس برس پیشتر دم توڑ چکی ہے اب زندہ نہ کیجیے، کتابت کی غلطیاں روزمرّہ کی چیز بن چکی ہیں اور آج کون سی تحریر ہے جو اُن کے وجود سے خالی ہے۔ باقی رہا کتاب کی ترسیل کے لیے تین ماہ کا عرصہ تو یہ مدت بہت زیادہ طویل ہے اتنا انتظار اب مجھ سے نہ ہو گا۔ بہتر ہو گا کہ اب اس کتاب کی ایک جلد مجھے براہِ راست بھیج دیں۔ لیکن کتاب نہ صدق صاحب نے خود بھیجی نہ بھجوائی۔ دو ایک مرتبہ میں نے پھر بھی ان کو لکھا لیکن انھیں پلٹ کر جواب دینا نصیب نہ ہُوا۔ اُن کا مقرر کردہ تین ماہ کا عرصہ بھی گزشتہ اگست میں ختم ہو چکا اور اب تو چھے ماہ ہو چلے۔ مَیں اب خاموش ہوں، بالکل خاموش۔ بات بہت ہی چھوٹی سی تھی یعنی صرف ساڑھے تین رُپے کی، لیکن یہی چھوٹی چھوٹی باتیں ان "بڑے" کہلانے والے لوگوں کے کردار کے باطن کو ظاہر کر دیتی ہیں۔ اُن کی کتاب کا مَیں آج بھی مدّاح ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔ جس کتاب کے مقدّمہ نگار ادیب شہیر مولانا عبدالماجد دریا بادی ہوں اور جس کی جلد از جلد اشاعت کے لیے حکیم اسرار احمد صاحب ناظم انجمن ترقّیٔ اُردو سے بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی وفات سے صرف ہفتے بھر پیشتر خاص طور پر اصرار فرمایا ہو وہ بھلا تعریف و توصیف کے قابل کیوں نہ ہو گی، بہرحال خدا بھلا کرے نظامی بک ایجنسی بدایوں کے مالک جناب جمال الدین صاحب مونس کا جن کی کمال مہربانی سے مجھے پچھلے دنوں "دَربارِ دُربار" کی مطلوبہ ایک جلد مل اور یوں میری اس دیرینہ بے تابی کا قصّہ تمام ہُوا۔

اس قصّے کے اختتام کے چند ماہ بعد جناب جمال الدین مُونس صاحب کا ایک پُر لطف خط مجھے موصول ہوا۔ اُنھوں نے لکھا تھا کہ قریشی صاحب آپ کو "دَربارِ دُربار" مہیا کرنے کے کچھ عرصے بعد مجھے پاکستان سے اس کتاب کی فراہمی کے مسلسل آرڈر ملنے

لگے۔ میں حیران کہ میں نہ اس کتاب کا ناشر ہوں اور نہ میرے ادارے کی فہرست میں اس کا کوئی ذکر موجود ہے پھر یہ لگاتار فرمائشیں کیسے ؟ بہر حال ایک صاحب سے دریافت کیا تو یہ راز کھلا کہ پچھلے دنوں جناب حنیف رامے کے ماہنامے "نصرت" لاہور میں آپ کا ایک مضمون بعنوان "داستان اک بے وفا کی" شائع ہوا تھا جس میں آپ نے "دربار دُربار" کا نہایت متاثر کن پیرایے میں ذکر کیا تھا، یہ سب کچھ اُس کا کرشمہ ہے۔ چوں کہ اس مضمون میں آپ نے اس کتاب کے حصول کے ضمن میں میرا اور میرے ادارے کا نام اور پتا بھی دیا تھا اس لیے لوگوں نے اس کی فراہمی کی خاطر مجھے خطوط لکھنا شروع کر دیے۔ میں نے ان کی فرمائشیں تو پوری کر دیں، تاہم اس مضمون کے مطالعے کا مجھے بھی اشتیاق ہوا۔ چناں چہ میں نے حنیف رامے صاحب کو خط لکھ کر "نصرت" کا متعلقہ شمارہ منگوایا اور سب سے پہلے آپ کا مضمون پڑھا۔ آپ نے مضمون خوب لکھا اور خوب کیا۔ واقعات کی صحیح تصویریں پیش کی ہیں۔ جائسی صاحب کے خطوط پر آپ نے جو چٹکیاں لی ہیں وہ خاص چیز ہے بس مزہ آ گیا۔

مَیں اور میرا کتب خانہ

میرے ذوقِ کُتب اندوزی کی داستان

عالم آب دگل میں آنکھیں کھلیں تو اپنے آپ کو ایک علمی اور دینی گھرانے کی آغوش میں پایا۔ میرے دادا صاحب مرحوم متوسط درجے کے عالم اور ایک اچھے حکیم تھے۔ فنِ مناظرہ سے اپنی دل چسپی کی بنا پر اُنھوں نے اپنے گرد وپیش قرآن حکیم کی مختلف تفسیروں، احادیث کے جملہ مجموعوں اور فقہ کی تمام کتابوں کا ایک انبار لگا تھا۔ اِن کتابوں کے علاوہ مولانا شاہ ولی اللہ، مولانا اسمٰعیل شہید، نواب صدیق حسن خاں بھوپالی، مولوی وحید الزمان حیدر آبادی، مولانا ثناء اللہ امرتسری اور دوسرے اہلِ علم حضرات کی تصانیف سے الماریاں پُر تھیں۔ اُن کا یہ علمی و دینی اثاثہ ہزار بارہ سو کتابوں پر مشتمل تھا۔ علوم و فنون کے اس ذخیرے میں بیش تر کتابیں ایسی تھیں جنھیں آج بجا طور پر نادر و نایاب کا نام دیا جا سکتا ہے۔ میرے والد صاحب سرکاری ملازمت کی گوناگوں مصروفیات کے باوجود مطالعۂ کتب کے لیے وقت ضرور نکال لیتے تھے اور جب وہ ملازمت کی ذمّے داریوں سے دست کش ہوئے مطالعہ ہی اُن کی واحد دل چسپی تھا۔ مجھے فخر ہے کہ کتابوں سے یہی دل چسپی مجھے بھی ورثے میں ملی۔ مرزا غالب مرحوم کا تو خیر بقول اُن کے سَو پشت سے پیشۂ آبا سپہ گری تھا لیکن میرے خاندان میں کم از کم تین پشتوں سے کتابوں سے غیر معمولی اُنسیت اور دلی عقیدت واقعی ذریعۂ عزّت چلا آتا ہے۔

میری تعلیم کی بسم اللہ

میری تعلیم کی بسم اللہ اُردو کے اُس قاعدے سے ہوئی جس کے مصنف لالہ رنگ بہاری لال اور ناشر لالہ عطر چند کپور اینڈ سنز لاہور تھے۔ یہ قاعدہ میری سب سے پہلی پسندیدہ کتاب تھا۔ اِس قاعدے کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اُسے نصف صدی سے زیادہ عرصے تک پنجاب کے سرکاری مدرسوں میں پڑھایا جاتا رہا۔ آج سے بیس پچیس برس پہلے ایسی مثالیں کافی مل جاتی تھیں کہ دادا نے بھی یہی قاعدہ پڑھا اور پوتا بھی اِسی قاعدے کو پڑھ رہا تھا۔ ہمارے ہاں آج کل جو قاعدے رائج ہیں وہ کسی لحاظ سے بھی اس قاعدے کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ خُدا جانے اس قاعدے میں کیا خوبی تھی کہ بچّہ اُسے فر فر پڑھتا چلا جاتا اور کہیں کوئی اُلجھن محسوس نہ کرتا۔ ہمارے زمانے کے پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، ایم ایڈ اور بی ایڈ کی بھاری بھرکم ڈگریاں رکھنے والے حضرات نے تو قاعدوں اور دوسری درسی کتابوں کو اِس درجے پیچیدہ، ثقیل اور ناقابلِ فہم بنا کر رکھ دیا ہے کہ طلبہ تو طلبہ، اساتذہ کرام تک اِن حضرات کی بُوالعجبیوں کا ماتم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اگر ہمارے یہ عالم اور فاضل دوست تعلیم و تدریس کے لیے نسبتہً آسان اور ہموار راہیں تلاش کر سکتے تو ہمارے مدرسوں میں ایک مبتدی کو "ف" سے "فوارے" کی بجائے "ف" سے "برف" نہ کہنا پڑتا۔ جی ہاں، یہ طریقۂ تعلیم بھی ایک زمانے میں رائج کیا گیا تھا۔

"اُردو کی پہلی کتاب"

قاعدہ ختم کرنے کے بعد مجھے "اُردو کی پہلی کتاب" پڑھنے کے لیے ملی۔ یہ کتاب شمس العلما مولوی محمد حسین صاحب آزادؔ کی تصنیف تھی جسے رائے صاحب مُنشی گلاب سنگھ اینڈ سنز نے شائع کیا تھا۔ بچّوں کے لیے کتابیں لکھنا کس قدر دشوار اور محنت طلب کام ہے اس کا اندازہ لگانے کے لیے مولانا آزاد کے ایک مکتوب کا یہ ٹکڑا ملاحظہ فرمائیے۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ "بڑا حصّہ عمر کا سر رشتۂ تعلیم کی ابتدائی کتابوں کی

تصنیف میں صرف ہوا۔ وہ کتابیں نام کو ابتدائی تھیں، مگر مجھ سے اُنھوں نے انتہا سے بڑھ کر محنت لی۔ اُنھیں بار بار کاٹنا اور بنانا، لکھنا اور مٹانا، یعنی بوڑھا ہو کر بچّہ بننا پڑا۔ چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، بچّوں ہی کے خیال میں رہا، مہینوں نہیں، برسوں صرف ہوتے، جب کہیں وہ بچّوں کے کھلونے تیار ہوتے۔

مجھے یاد ہے میری اس کتاب کا پہلا سبق "ماں کی محبّت" تھا جس میں بڑے خلوص سے ماں کی ممتا کو واضح کیا گیا تھا۔ سبق کی ابتدا یوں ہوتی تھی: "ماں بچّے کو گود میں لیے بیٹھی ہے، باپ حقّہ پی رہا ہے اور بچّے کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ بچّہ آنکھیں کھولے پڑا ہے، انگوٹھا چوس رہا ہے، ماں محبّت بھری نگاہوں سے اُس کے منہ کو تک رہی ہے اور پیار سے کہتی ہے "میری جان! وہ دن کب آئے گا جب تو میٹھی میٹھی باتیں کرے گا، بڑا ہوگا، سہرا باندھے گا، دولہا بنے گا، دُلھن بیاہ کر لائے گا، ہم بُوڑھے ہوں گے تو تُو کمائے گا۔ آپ کھائے گا، ہمیں کھلائے گا۔" بچّہ مسکراتا ہے تو ماں کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔"

اس کتاب کے دوسرے سبق بھی اسی طرح ہلکے پھلکے اور آسان تھے۔ یہی حال نظموں کا تھا، بڑی مؤثر، رواں اور سبق آموز۔ پچھلے دنوں جب اس کتاب کی ایک نظم "صبح کی سیر" کو فیروز سنز کے مرتّبہ نظموں کے ایک مجموعے "قدرت کے نظارے" میں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ تو فرطِ انبساط سے میری عجیب حالت ہوئی۔ مجھے پچاس سال پہلے کا وہ زمانہ یاد آ گیا جب میں اس نظم کو ترنّم سے پڑھا کرتا تھا اور اس کا لُطف اٹھایا کرتا تھا۔ اُس کا پہلا شعر تھا ؎

سویرے جو کل آنکھ میری کھُلی
عجب تھی بہار اور عجب سیر تھی

فطرت کی رنگینیوں اور بہار آفرینیوں کی جتنے سادہ الفاظ میں اور جس قدر سلیس انداز میں عکاسی اس نظم میں کی گئی ہے، اُردو شاعری میں اس کی مثالیں بہت ہی کم ملیں گی۔

اس کتاب سے میری محبّت کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۳۰ء میں اسے ختم کرنے کے بعد میں نے اسے اپنے پاس ہی رکھ چھوڑا تھا۔ میں باوجودیکہ کالج کا چکّر بھی لگا آیا تھا، اس کتاب کو

گوگاہ بہ گاہ پڑھتا، اپنے بچپن کی یاد کو تازہ کرتا اور خوشی محسوس کرتا۔ یہ کتاب میرے پاس ۱۹۴۷ء تک رہی اور پھر ۱۹۴۷ء میں میری دوسری کتابوں کے ہمراہ اُس زمانے کے فسادات کی نذر ہو گئی۔ ۱۹۴۷ء کی ابتدا میں مَیں نے اس کتاب کو از سرِ نو مجلّد کرایا تھا، مگر افسوس کہ "آں قدح بشکست و آں ساقی نماند"۔ مجھے ۱۹۴۷ء کے بعد سے آج تک یہ کتاب بار بار اور بے اختیار یاد آتی رہی، لیکن آج کل یہ اس قدر نایاب ہے کہ تلاشِ بسیار کے باوجود مَیں اس کا ایک نسخہ حاصل کرنے میں ابھی تک کام یاب نہ ہو سکا۔ اس کتاب کی زبان میں جو حلاوت، شیرینی اور مٹھاس تھی وہ آج کہاں! زمانہ کتنی بھی ترقی کیوں نہ کرے، شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد اب پیدا نہ ہوں گے۔ اُردو ادب کے دربار میں جن کرسیوں پر وہ لوگ متمکن تھے، ہمیشہ خالی پڑی رہیں گی اور کبھی پُر نہ ہوں گی۔ بڑے بڑے ادیب، شاعر اور عالم وجود میں آتے رہیں گے، لیکن میرؔ ہوں یا سوداؔ، غالبؔ ہوں یا ذوقؔ، مومنؔ ہوں یا دردؔ، شبلیؔ ہوں یا حالیؔ، نذیر احمد ہوں یا ذکاء اللہ، سرسیّد ہوں یا آزادؔ، اِن حضرات کے کارنامے ہمیشہ اپنی انفرادیت منواتے رہیں گے اور جب تک اُردو زبان زندہ ہے اِن شاء اللہ زندہ رہیں گے۔

دادا جان کا کتب خانہ

مجھے زمانۂ طالب علمی میں میرے والد صاحب نے ہمیشہ یہی نصیحت کی کہ میں سوائے اپنی درسی کتب کے کسی اور کتاب کا مطالعہ نہ کروں۔ مَیں نے اُن کی نصیحت پر عمل پیرا ہونے کی پوری پوری کوشش کی، لیکن افسوس کہ میری یہ سعی، سعیٔ ناکام ہی رہی۔ مَیں اپنے مقصد میں کام یاب نہ ہو سکا اور کتابوں سے میرا فطری رجحان مجھے ہمیشہ ایسی ہدایات سے بغاوت کا مشورہ دیتا رہا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک اچھے طالب علم کے طور پر مَیں اپنا کام انتہائی توجہ اور محنت سے کرتا اور اُس میں کبھی لاپروائی یا کوتاہی نہ کرتا۔ کھیل کود سے مجھے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ اِس لیے سوائے اس کے کہ مَیں اپنے فرصت کے لمحات کو اخبارات، رسائل اور کتابوں کے مطالعے کے لیے وقف کر دوں، مجھے اور کوئی

چارہ کار نہ تھا۔ یہی کشش مجھے اپنے دادا صاحب مرحوم کی کتابوں تک لے گئی اور مجھے اُن سے والہانہ محبت ہوگئی۔ یہ کتابیں اگرچہ میری علمی استعداد سے کہیں بلند تھیں تاہم مجھے اُن کی "خدمت" کرنے میں بڑا سکون محسوس ہوتا۔ میں اِن کتابوں کی فہرستیں مرتب کرتا، اُن پر نمبر اور ناموں کی چٹیں لگاتا، انھیں الماریوں میں باقاعدگی سے رکھتا اور انھیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا۔ کبھی کبھی کسی کتاب کو اپنی کم علمی کے باوجود پڑھنے اور سمجھنے کی بھی کوشش کرتا اور یوں مطالعے کی عادت پختہ تر ہوتی گئی۔

مرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا

اگر میں یہ کہوں کہ "مرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا" تو کتابوں کے معاملے میں یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ میں نے اپنے مدرسے کی لائبریری سے بھی مطالعے کے لیے کثرت سے کتابیں برآمد کرائیں اور اس طرح ہر جماعت میں اپنے شوق کی تکمیل کی۔ اس زمانے میں خدا جانے کون کون سی کتابیں دیکھنے کا اتفاق ہوا، لیکن ایک کتاب کے متعلق مجھے اپنے تاثرات بخوبی یاد ہیں۔ یہ کتاب محترمہ نذر سجاد حیدر کی "اختر النسا بیگم" تھی۔ سوتیلی ماں کی زیادتیوں اور حقیقی باپ کی بے اعتنائیوں کی وجہ سے ایک تعلیم یافتہ لڑکی پر کیا قیامت بیتی، اُس کے اظہار کے لیے جو پیرایۂ بیان اس کتاب میں اختیار کیا گیا تھا وہ بہت کم لکھنے والوں کو نصیب ہوتا ہے۔ ہرچند کہ کہانی تخیلی تھی، مگر حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ مجھے جب یہ کتاب ملی، میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا اور میری عمر تیرہ سال کے لگ بھگ تھی۔ سردی کا موسم تھا۔ میں نے مدرسے کا کام ختم کرنے کے بعد رات کو نو بجے کے قریب اِسے پڑھنا شروع کیا اور اس کی دلچسپیوں میں گم ہو گیا۔ یقین کیجیے مجھے پتا ہی نہ چلا کہ تمام کی تمام رات اس کتاب کے مطالعے میں گزر گئی ہے۔ فجر کی اذان کی آواز کان میں پڑی تو میں چونک اُٹھا۔ میں نے دیکھا کہ شب کے خاتمے کے ساتھ ساتھ کتاب بھی اختتام کی طرف رواں دواں ہے۔ مطالعے کے دوران میں ایسے ایسے رنج دِہ اور الم انگیز واقعات سامنے آئے کہ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ

گئی۔ میں آنسو پونچھتا رہا اور کتاب پڑھتا رہا حتّٰی کہ میں نے اسے ختم کر دیا۔

کے۔ ایم۔ منشی کی کتاب اور مولانا عبدالماجد دریا بادی

یہ سطور قلم بند کرتے وقت مجھے زوالِ حیدر آباد کے متعلق مسٹر کے۔ ایم۔ منشی کی انگریزی کتاب END OF AN ERA (ایک دور کا خاتمہ) پر مولانا عبدالماجد دریا بادی کے تبصرے کے یہ الفاظ یاد آ گئے: "مسٹر منشی نام ہی کے منشی نہیں، اُن کے قلم میں جان ہے۔ رُوداد گو تلخ اور عبرت ناک سہی، پھر بھی تصویر واقعات بڑی جان دار ہے اور مرقع دل کش اتنا کہ چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ ٹریجڈی پڑھنے والے کو کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آنسو برابر نکلتے جا رہے ہیں، لیکن یہ نہیں ہوتا کہ کتاب ہی بند کر دی جائے۔"

اسی زمانے کا ایک اور واقعہ بھی میں آج تک فراموش نہیں کر سکا۔ میری عمر ان دنوں گیارہ بارہ سال کی تھی کہ ایک صاحب ہمارے محلے میں آ کر آباد ہوئے۔ یہ کہیں باہر سے تبدیل ہو کر آئے تھے۔ سرکاری ملازمت میں منسلک تھے اور کسی اچھے عہدے پر فائز تھے۔ اُن کی اہلیہ بھی تعلیم یافتہ تھیں۔ اُن کا صرف ایک لڑکا تھا جو میرا ہم عمر اور ہم جماعت تھا اور اسی ناتے سے ہمارا ایک دُوسرے کے ہاں آنا جانا تھا۔ ایک روز میں اُن کے یہاں موجود تھا کہ محلے کی ایک خاتون اُن کے ہاں آئیں۔ صاحبۂ خانہ اُن سے بڑی خوش خلقی سے پیش آئیں۔ اور اُنھیں اپنے پاس بٹھایا۔ پھر مختلف موضوعات پر جیسا کہ عورتوں کا دستور ہے، باتیں ہونے لگیں۔ دورانِ گفتگو مہمان خاتون نے ازراہِ مزاح کہا کہ میں ایسے خوب صورت جسم پر زیور بہت ہی کم دیکھ رہی ہوں، کیوں کہ صاحبۂ خانہ نے اُس وقت صرف کانوں میں سنہری بُندے پہنے ہوئے تھے۔ صاحبۂ خانہ مسکرائیں اور کہنے لگیں کہ "زیور میرے پاس بہتیرے ہیں، آئیے آپ کو بھی دکھلا دوں۔" چناں چہ وہ اُٹھیں اور اُنھیں اپنے ہمراہ اُدپر لے گئیں۔ میں بھی شوق کی وجہ سے اُن کے ساتھ ہو لیا۔ اوپر پہنچ کر اُنھوں نے ایک مقفل کمرا کھولا اور اُس میں داخل ہو گئیں۔ اس کمرے میں کئی

خوب صورت الماریاں تھیں جن میں سیکڑوں کتابیں بڑے سلیقے اور نفاست سے رکھی ہوئی تھیں۔ میزبان خاتون نے بڑے فخر سے ان کتابوں کی طرف دیکھا۔ پھر کہنے لگیں میرے زیورات ہماری یہ کتابیں ہیں"۔ میں نے دیکھا کہ اُن کا چہرہ فرطِ مسرت سے تمتما رہا تھا۔

اینگلو عربک کالج دِلّی کا کتب خانہ

میٹرک کے بعد میں اینگلو عربک کالج دِلّی میں داخل ہوا تو اُس کی چھوٹی سی لائبریری مجھے بہت بڑی معلوم ہوئی۔ میرے مطالعے کے بے پایاں اشتیاق نے اس لائبریری کا بڑے ہی پُرکیف انداز میں استقبال کیا۔ ستم یہ کہ میں سائنس کا طالب علم اور ادب کا دِل دادہ، والدین بے چارے مجھے آیندہ زندگی میں غالباً انجینئر یا حساب یا سائنس کا پروفیسر دیکھنا چاہتے تھے، لیکن میرا یہ حال کہ علم کیمیا اور علم طبیعات کی لیبارٹریوں کی خشک اور روکھی پھیکی فضاؤں سے دِل گھبراتا تو اِس لائبریری کی ٹھنڈی چھاؤں میں مجھے آرام و سکون محسوس ہوتا اور اُس میں رکھی ہوئی سیکڑوں کتابیں میری ہم دم ہم راز بن جاتیں۔

علمی و دینی کتابوں کا مطالعہ

تعلیم سے فراغت پانے کے بعد میری زندگی میں ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب مَیں نے بے کار مباش کچھ کیا کر کے طور پر اپنے آپ کو مختلف متنازعہ مسائلِ دینی میں بحث و مباحثہ کی راہ پر ڈال دیا۔ میرا یہ مشغلہ ایک لحاظ سے میرے لیے اچھا ہی ثابت ہوا، کیوں کہ اِس بہانے مجھے کئی علمی و دینی کتابوں کے مطالعے کا موقع مل گیا جس سے میری مذہبی معلومات میں کافی اضافہ ہوا۔ اس زمانے کا ایک پُرلطف واقعہ مجھے نہیں بھولتا۔ ہُوا یوں کہ ایک روز احباب نے تفریح کے طور پر یہ طے کیا کہ آج فلاں مولوی صاحب سے مناظرہ کیا جائے اور اُنھیں ایسا زچ کیا جائے کہ بس مزہ آجائے۔ یہ مولوی صاحب، اللہ مغفرت فرمائے، تھے تو دھان پان قسم کے آدمی، لیکن نہایت

غصہ ور، بلکہ سراپا غیظ و غضب، جب جلال میں آتے تو اپنے پرائے کسی کو نہ بخشتے اور دشنام طرازی چھوڑ دھول دھپے تک پر آمادہ ہو جاتے۔ خیر ہم اُن کی مسجد میں پہنچے۔ ظہر کی نماز وہیں ادا کی اور نماز کے بعد پوری سنجیدگی سے ایک مسئلہ اُن کی خدمت میں پیش کر دیا۔ مولوی صاحب نے مسئلے کی توضیح کی تو ہم نے اس پر چند اعتراضات کر دیے۔ مولوی صاحب جواب دینے لگے لیکن دورانِ گفتگو ایک مقام پر میری گرفت اتنی شدید ہوئی کہ مولوی صاحب کو جواب بن نہ آیا اور وہ بغلیں جھانکنے لگے۔ مولوی صاحب کی یہ حالت دیکھ کر مجھے قدرے ہنسی آگئی، گو مَیں نے ضبط کرنے اور مولوی صاحب کی طرف سے اپنا مُنہ پھیرنے کی کوشش بھی کی، لیکن ناکامی ہوئی اور مولوی صاحب کی نظر میرے مسکراتے ہوئے چہرے پر پڑ گئی۔ اب کیا تھا، مولوی صاحب مارے غصے کے لال ہو گئے اور چیخ اُٹھے "او کم بخت! تیرے دادا نے ہم سے پڑھا، تیرے باپ نے ہم سے پڑھا، اور تُو ہم پر اعتراض کرتا ہے۔ ٹھیر تو سہی ہم تیری کیسی گت بناتے ہیں"۔ یہ کہہ کر مولوی صاحب اپنا عصا تلاش کرنے لگے۔ ہم نے اس فرصت کو غنیمت جانا اور وہاں سے ایسے رفو چکر ہوئے کہ گھر آکر ہی دم لیا۔ واضح رہے کہ مولوی صاحب کے عصا کو ہم نے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت پہلے ہی اُن سے علاحدہ کر رکھا تھا۔

دو یادگار کتابیں

اُس زمانے میں دو کتابوں نے میری طبیعت پر گہرا اثر ڈالا۔ ان میں سے ایک کتاب مولانا شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی "تقویۃ الایمان" تھی اور دوسری مولانا خواجہ الطاف حسین حالی کی مشہور مسدس "مسدسِ حالی"۔ شاہ صاحب نے اُس دور میں جب ہندستان کے مسلمان بدعقیدگی اور بے دینی کا شکار ہو کر صراطِ مستقیم سے بھٹک رہے تھے اور شرک و بدعت کی ظلمت پوری طرح اُن کے ذہنوں پر مسلط ہو چکی تھی "تقویۃ الایمان" کی شکل میں اللہ جلّ جلالہٗ کی توحید کا چراغ روشن کیا۔ "تقویۃ الایمان" کا یہی چراغ ڈیڑھ صدی سے تاباں و درخشاں چلا آتا ہے۔ اس طویل مدت میں اس چراغ کی ضیاپاشیوں

نے ہزاروں لاکھوں نہیں کروڑوں دل و دماغ کو منور کیا اور آج بھی یہ چراغ گم گشتہ راہوں کے لیے نشانِ منزل کی صورت میں اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ ہم میں موجود ہے۔

اللہ کا شکر ہے "تقویۃ الایمان" نے میرے ایمان کو وہ تقویت پہنچائی کہ باوجود بے عمل ہونے کے شرک و بدعت اور جملہ بے ہودہ رسوم سے میری طبیعت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نفرت پیدا ہو گئی۔

مولانا حالی مرحوم نے "مسدسِ حالی" میں مدو جزرِ اسلام کی تصویریں اتنی کامیابی سے کھینچیں کہ ماضی کے تمام دھندلے نقوش نکھر کر سامنے آ گئے۔ "مسدسِ حالی" مرثیہ نہ تھی، رجز تھی جس کی آتش بیانی نے مسلمانانِ ہند کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ لوگ "مسدسِ حالی" کو پڑھتے اور سر دھنتے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کتاب نے مسلمانوں کے دلوں میں احساسِ بیداری کو زندہ اور اُن کی قوتِ عمل کو بیدار کیا۔ اِس مرحلے پر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جن محرکات کے سہارے ہم آزادی کی منزل کی جانب بڑھے "مسدسِ حالی" بھی اُن میں سے ایک تھی۔ حالی کی اس نظم نے اُردو شاعری کو ایک نئے راستے پر لا ڈالا اور یہی وہ راستہ تھا جس پر بعد ازاں اقبال، ظفر علی خاں اور ملت کے دوسرے شاعر گام زن ہوئے۔ مجھے اُن دنوں "مسدس" کے بند کے بند یاد تھے۔ میں جب بھی یہ شعر پڑھتا:

رہا دین باقی نہ اسلام باقی
اِک اسلام کا رہ گیا نام باقی

تو طبیعت میں عجیب طرح کا احساس پیدا ہوتا اور آنکھیں نم ناک ہو جاتیں۔

"مسدس" کے مطالعے کا مجھ پر یہ اثر بھی ہوا کہ میرا ابحث و مباحثہ اور مناظرہ بازی کا شوق رفتہ رفتہ دھیما ہو کر آخر کار بالکل ختم ہو گیا۔ میری تحقیق کے مطابق نثر میں "تقویۃ الایمان" اور نظم میں "مسدسِ حالی" ایسی کتابیں ہیں جن کی مثال بہ اعتبارِ اشاعت پورے اُردو ادب میں نہیں ملتی۔ "تقویۃ الایمان" کے متعلق تو بلا شبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب لاکھوں کی تعداد میں قیمتاً فروخت اور ہدیۃً تقسیم ہوتی رہی ہے اور آج بھی اُس کے بہتر سے بہتر ایڈیشن دست یاب ہیں۔

"کتابوں کے دو دیوانے"

یہ واقعات جو میں نے تحریر کیے اُن کا تعلق ۱۹۴۷ء سے پیشتر کے زمانے سے ہے۔ ۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے بعد مجھے مولانا حکیم محمد عبداللہ صاحب مالک دواخانہ سلیمانی روڑی ضلع حصار سے جہانیاں ضلع ملتان میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ حکیم صاحب موصوف سے غائبانہ طور پر تو میں اُس زمانے سے واقف تھا جب ۱۹۳۶ء میں اخبار "اہلِ حدیث" امرتسر ہمارے ہاں آیا کرتا تھا اور اُس میں اُن کے دواخانے کے اشتہارات چھپا کرتے تھے، لیکن ایک ہی ضلع سے تعلق رکھنے اور عقیدے کی ہم آہنگی کے باوجود اُن سے ملنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ اِس کا واحد سبب یہ تھا کہ مجھے پیشتر ازیں یہ معلوم ہی نہ ہو سکا تھا کہ وہ عالمِ دین اور طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اتنے بڑے کتب خانے کے مالک بھی ہیں جس کی مثال ضلع حصار تو کیا شاید پورے انبالہ ڈویژن میں بھی نہ ہو، اور اب حکیم صاحب کی زبانی اس عظیم کتب خانے کی تباہی اور بربادی کی داستان سُن کر میں اپنی بدقسمتی پر ماتم کناں تھا۔ کاش میں حکیم صاحب کے اس کتب خانے کی زیارت کر سکتا، کاش یہ کتب خانہ کسی طرح یہاں منتقل ہو سکتا۔ بہر حال قدرت کو جو منظور تھا وہ ہو کر رہا۔ الحمدللہ کہ جہانیاں میں قیام فرما ہونے کے بعد اُنھوں نے ۱۹۴۷ء ہی میں ایک نئے کتب خانے کی بنیاد رکھ دی اور آج اس کتب خانے میں کتابوں کی تعداد آہستہ آہستہ بڑھ کر چار پانچ ہزار کے قریب جا پہنچی ہے۔

ہاں تو جہانیاں میں حکیم صاحب سے ملاقاتوں پر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ اِن ملاقاتوں میں وجہ مشترک صرف ایک ہی تھی اور وہ تھی کتابیں، کتابوں سے ہماری محبت اور شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ مصرع "خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو" ہم پر پوری طرح چسپاں ہوتا تھا۔ حکیم صاحب لاکھ فرزانے سہی، لیکن کتابوں کا تو میں اُن کو دیوانہ ہی کہوں تو بجا اور درست ہو گا۔ اُنھوں نے عمدہ غذائیں نہ کھائیں، اُنھوں نے تن ڈھانپنے کے لئے موٹا جھوٹا پہنا، اُن کے سر پر معمولی سی ٹوپی ہوتی، اُن کے پاؤں میں بیش قیمت

جوتا نہ ہوتا، وہ لاہور جیسے شہر میں بڑے سے بڑا فاصلہ پیدل طے کر لیتے، لیکن ان تمام تکالیف اور مشکلات کو برداشت کر کے اُنھوں نے کتابیں خریدیں، کتب خانہ بنایا اور پھر اس کتب خانے کو فی سبیل اللہ وقف کر دیا۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ میں نے ان کی طبیعت میں وہ فقر و غناء دیکھا جو کبھی مولانا حسرت موہانی کا طرّۂ امتیاز تھا۔ حکیم صاحب فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اللہ اور اُس کے رسولؐ کے بعد دُنیا میں کتابوں سے زیادہ پیارا اور کوئی نہیں۔ اُن کا یہ قول بھی میرے دل پر نقش بن کر رہ گیا ہے کہ کتاب اور دوا قیمت کے تکلف سے بالا ہیں اُن کی قیمت اُن کی ضرورت ہے۔

میرا ذوقِ کتب اندوزی

مطالعے کا رسیا تو میں پہلے ہی تھا، لیکن مولانا حکیم محمد عبداللہ صاحب کی ہم نشینی اور ہم جلیسی نے میرے سمندِ شوق پر سراسر تازیانے کا کام کیا۔ اُن کی صحبت میں مجھے کتابیں خرید کر پڑھنے اور اُنہیں کتب خانے کی صورت میں مرتب کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے پاس آہستہ آہستہ کتابوں کا ایک ایسا ذخیرہ جمع ہو گیا جس کا مجھ ایسے محدود ذریعۂ آمدنی رکھنے والے آدمی کے پاس جمع ہونے کا بادی النظر میں تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ اگر حکیم صاحب کے کتب خانے میں چار پانچ ہزار کے قریب کتابیں موجود ہوں تو چار پانچ سو کے لگ بھگ کتابیں ان سطور کا راقم بھی اپنے کتب خانے سے برآمد کر سکتا ہے۔ رسائل اور اخبارات کے خصوصی شمارے جو اس تعداد سے یقیناً دو چند ہوں گے، اس کے علاوہ ہیں۔

میرا حقیر سا کتب خانہ

یہاں میں بہت ہی ڈرتے ڈرتے اپنی چار پانچ سو کتابوں کو ایک کتب خانے کا نام دے رہا ہوں وہ بھی محض اس وجہ سے کہ لغت میں اس سے کم تر درجے کا کوئی لفظ نہیں پاتا۔ وگرنہ جہاں تک کتب خانے کی اصطلاح اور اُس کی وسعت اور ہمہ گیری کا تعلق

ہے مجھے شرم محسوس ہوتی ہے کہ مَیں اپنی کتابوں کے اس انتہائی محدود ذخیرے کو کتب خانہ کہوں۔ ہیں کیا اور میرا کتب خانہ کیا "بس" دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے والی بات ہے۔ کتب خانے کا مقام حقیقت میں بہت ہی بلند ہے اور اس مقام تک پہنچنے کے لیے ذوقِ سلیم کے ساتھ ساتھ وافر سرمایے کی بھی اشد ضرورت ہے۔ ہمارے معاشرے میں علم اور دولت گو دو بالکل متضاد سی چیزیں ہیں، لیکن جب یہ دونوں چیزیں خوش قسمتی سے کہیں یک جا ہو جائیں تو وہاں کتب خانے کی تشکیل و تعمیر ہونے میں کوئی دیر نہیں لگا کرتی۔ ہمارے ہاں "خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ"، "کتب خانہ حبیب گنج (علی گڑھ)"، "ہمدرد لائبریری کراچی"، "کتاب محل" (کتب خانہ سید زاہد حسین صاحب رئیس اعظم صادق آباد) اور "کتب خانہ سلیمانی جہانیاں" جیسے عظیم علوم و فنون کے گہوارے دراصل علم و دولت کے اسی قِران السعدین کا مظہر ہیں۔

کتابیں اور حُسنِ ترتیب

مَیں نے اپنے کتب خانے میں کتابوں کو اُن کی قلیل تعداد سے قطع نظر ایسی نفاست، سلیقے اور ندرت سے ترتیب دیا ہے کہ ایک چمن سا کھلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ آپ میری اِن کتابوں کو اُجلی اُجلی نکھری نکھری اور بالکل نئی نئی پائیں گے۔ اور آپ کو ایسا محسوس ہوگا، جیسے یہ سب کتابیں آج ہی خریدی گئی ہیں حالانکہ اُن میں سے بیشتر کو خریدے ہوئے ایک زمانہ ہو گیا۔ اس کی واحد وجہ کتابوں سے میرا وہ عشقِ حقیقی ہے جس کا تذکرہ میں گزرے ہوئے اوراق میں کر چکا ہوں۔ میرے معیار کے مطابق کتابیں خریدنے کا صحیح مقام تو دراصل کسی ناشر یا تاجرِ کتب کی دکان ہے جہاں ہمارے سامنے ایک ہی کتاب کے درجنوں نسخے موجود ہوتے ہیں اور ہم اُن میں سے عمدہ سے عمدہ اور بے عیب کتاب کا انتخاب اپنی پسند کے مطابق کر سکتے ہیں لیکن ایک باذوق آدمی کو دِقت اُس وقت پیش آتی ہے۔ جب بھی کتابیں وہ ڈاک کے ذریعے منگواتا ہے، کیوں کہ ہمارے ناشرین اور تاجرانِ کتب واضح ہدایات کے باوجود پیکنگ کے معاملے میں عموماً لاپروائی اور بے توجہی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کتابوں کی جلدیں ٹوٹ جاتی ہیں اور اگر جلدیں نہ ٹوٹیں

تو بھی کتاب کے اوپر بندھی ہوئی رسّی کے نشانات جلد پر ضرور ظاہر ہو جاتے ہیں جو بذاتِ خود ایک بڑا عیب ہے۔ کتابوں کے پیکنگ کے یہی نقائص میرے لیے ذہنی کوفت اور دلی رنج کا باعث ہوتے ہیں۔ چناں چہ اُن سے بچنے کی خاطر مَیں اپنے اور اپنے احباب کے واسطے کتابیں ہمیشہ اکٹھی منگوایا کرتا ہوں تاکہ کوئی کتاب تو صاف اور ستھری نکلے۔ ایسی کتابوں کا حق انتخاب احباب کی طرف سے دائمی طور پر میرے نام محفوظ ہے۔ اُن کی شفقت و عنایت سے مجھ خود غرض کو کتاب قریب قریب اسی حالت میں مل جاتی ہے جس حالت میں وہ ناشر کے ہاں سے چلی تھی۔ گو بعض دفعہ کوئی نہ کوئی شکوہ پھر بھی میرے لب پر آ ہی جاتا ہے مگر اس کا علاج !

غلط اندازے

کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ کسی خاص کتاب کے متعلق میرا اندازہ غلط ثابت ہوا اور مَیں نے اُسے اپنے مقررہ معیار اور مزاج کے مطابق نہ پایا۔ کچھ عرصہ ہوا مَیں نے جناب غلام محمد ایم اے (عثمانیہ) کی نئی کتاب "تذکرہ مولانا سلیمان ندویؒ" کو کمال اشتیاق کے ساتھ منگوایا۔ جب اس کتاب کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ سید صاحب مرحوم تو بے چارے بڑے صوفی ہی صوفی تھے۔ ادیب، صحافی، عالم، مؤرخ اور سیاستدان کچھ بھی تو نہیں۔ فاضل مصنّف اگر اس کتاب کو اُس رنگ میں لکھتے جس رنگ میں کبھی اُنھوں نے نواب بہادر یار جنگ کی سوانح "حیاتِ قائدِ ملّت" قلم بند فرمائی تھی تو سید صاحب کی زندگی کے یہ تمام پہلو بھی اچھی طرح سامنے آجاتے۔ کاش وہ اس کتاب کی تصنیف کے وقت سید صاحب ہی کی "حیاتِ شبلیؒ" کو پیشِ نظر رکھتے۔ ایسی کتابیں مستقلاً میری طبیعت پر بار ہو جاتی ہیں اور مَیں بار بار پچھتایا کرتا ہوں کہ فلاں کتاب اگر نہ خریدی جاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ ویسے مناسب موقع آجانے پر مَیں ایسی کتابوں سے اپنا دامن چھڑا بھی لیا کرتا ہوں۔

میرے منتخب موضوعات

میرا یہ کتب خانہ جن کتابوں سے عبارت ہے اُن میں سے بیشتر کا موضع آپ بیتی،

سوانح حیات، رپورتاژ، تاریخ، سیاسیاتِ پاکستان، خطوط، سفر نامے، شکار اور مہماتی ادب ہے۔ اِن عنوانات کے تحت مَیں نے اُن منتخب کتابوں کو اپنے گرد اکٹھا کرنے کی کوشش کی ہے جن کی دل کشی اور پُر لطفی کے سامنے مَیں دل چسپ سے دل چسپ ناول کو بھی ہیچ سمجھتا ہوں۔ ناول اور افسانے کا میرے کتب خانے میں گزر نہیں اور مَیں ان کتابوں پر پیسہ خرچ کرنا گناہ تصوّر کرتا ہوں۔ کتابوں کی پسندیدگی کے متعلق میرا پہلا اصول یہ ہے کہ کتاب کا اندازِ بیان شگفتہ اور اُس کا طرزِ نگارش ہلکا پھلکا ہو اور وہ کسی اعلیٰ مقصد کی حامل ہو خشک اور ٹھوس کتابیں چاہے وہ علمی ہوں یا ادبی، میری طبیعت سے مناسبت نہیں رکھتیں کیوں کہ مَیں عالم ہوں نہ فلاسفر۔

کتابوں کی تلاش

کتابوں کی تلاش میں بعض اوقات میری یہ عجیب وغریب خواہش سرگرم کوششوں کا رُوپ دھار لیتی ہے کہ میرے کتب خانے میں کچھ ایسی نادر و نایاب قسم کی کتابیں جمع ہو جائیں جو دُور و نزدیک کسی کے پاس نہ ہوں اور جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ میرے اس چھوٹے سے کتب خانے میں بعض ایسی کتابیں موجود ہیں جو کسی بڑی لائبریری میں بھی نہیں تو میرے دل میں اپنے کتب خانے کی عظمت اور اِن کتابوں کی اہمیت کا احساس جاگ اٹھتا ہے اور میرا سر فخر سے اونچا ہو جاتا ہے، لیکن محض ایک لمحے کے لیے، کیوں کہ مَیں بخوبی جانتا ہوں کہ دوسروں کے ہاں بھی سیکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں ایسی کتابیں موجود ہیں جو میرے کتب خانے میں موجود نہیں ہیں۔ اس مرحلے پر اس لطیفے کا اعادہ باعثِ دل چسپی ہوگا:

ایک لطیفہ

ایک روز دواخانہ سلیمانی کی ایک محفل میں کتابوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ حکیم محمد عبداللہ صاحب فرما رہے تھے کہ "اُن کے کتب خانے میں محض سفر نامے کے موضوع پر دو ڈھائی

سو کے لگ بھگ کتابیں موجود ہیں جن کی مثال ہمارے ملک کی بڑی سے بڑی لائبریری میں بھی نہ ملے گی"۔ میں نے انھیں چھیڑنے کے انداز میں کہا کہ "مولانا میرے کتب خانے میں فلاں فلاں سفر نامے (اُن کی تعداد تین یا چار تھی) موجود ہیں جو آپ کے ہاں نہیں ہیں۔ "حکیم صاحب نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ "آپ کا اُن سیکڑوں سفر ناموں کے متعلق کیا خیال ہے جو آپ کے کتب خانے میں نہیں ہیں" اس پر محفل میں زبردست قہقہہ پڑا اور چند لمحوں کے لیے محفل سے سنجیدگی رخصت ہو گئی۔

اعمال نامہ

اب میں چند واقعات ایسے سپردِ قلم کرتا ہوں جن سے معلوم ہو گا کہ میں نے اپنی پسندیدہ کتابوں کو حاصل کرنے کی خاطر کس طرح اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ کاٹا۔ کس قدر ذہنی پریشانیاں مجھے اس راہ میں لاحق ہوئیں۔ کیسے میرے روز و شب اُن کے فراق میں گزرے اور کس کس در کی خاک میں نے ان کی تلاش میں چھانی تب کہیں جا کر یہ گوہرِ مقصود ہاتھ آئے۔ آپ حیران ہوں گے کہ سر سید رضا علی کی آپ بیتی "اعمال نامہ" کی جستجو میں میری زندگی کے نو دس سال بیت گئے۔ قیامِ پاکستان کے سال سوا سال بعد کا ذکر ہے کہ "آج کل" دلی کے ایک پرانے شمارے میں "اعمال نامہ" پر ایک مفصل مضمون نظر سے گزرا۔ یہ مضمون اس قدر دلچسپ تھا کہ مجھے اصل کتاب دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ انھی ایام میں معلوم ہوا کہ یہ کتاب فلاں کالج کی لائبریری میں موجود ہے وہاں سے اس کو نکلوایا، پڑھا تو یک گونہ سرور حاصل ہوا اور دل میں بے اختیار یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش یہ کتاب اپنی ہوتی۔ ساتھ ہی ایک لمحے کے لیے یہ خیال بھی آیا کہ کیوں نہ اس کتاب ہی کو رکھ لیا جائے اور اس کی قیمت ادا کر دی جائے۔ اگرچہ کتب خانوں کی دنیا میں اس قسم کے اقدامات کو جائز اور درست سمجھ لیا گیا ہے، لیکن جب میں نے اپنی اس خود غرضی کو اخلاق، دیانت اور وسیع تر قومی مفادات کی کسوٹی پر رکھا اور پرکھا تو مجھے بڑی ندامت محسوس ہوئی۔ میں نے فوراً اس خیال کو ترک کر دیا اور کتاب واپس کر دی۔

اب مَیں نے اس کتاب کی فراہمی کے لیے بھاگ دوڑ شروع کی تو معلوم ہوا کہ یہ کتاب اپنی اشاعت کے سال ۱۹۴۳ء ہی میں نادر و نایاب کا مرتبہ حاصل کر چکی ہے، لیکن میرا حوصلہ پست نہ ہوا۔ مَیں ہر سال تین چار خط مختلف وقفوں سے کسی نہ کسی کتب خانے کو لکھتا رہتا۔ کہیں سے تو جواب ہی نہ آتا۔ کہیں سے آتا تو نفی میں آتا۔ "اعمال نامہ" کے ناشر جو آج کل کراچی میں کتابوں ہی کا کاروبار (کتاب محل) کر رہے ہیں۔ کو لکھا تو انھوں نے جواب دیا کہ "اعمال نامہ" کی کوئی جلد باقی نہیں ہے۔ بس اُس کی یاد باقی ہے اور ظاہر ہے کہ 'یاد' کا وی پی نہیں کیا جا سکتا"۔ ایسے ہی حوصلہ شکن جواب اور بھی آئے پھر بھی مَیں ہمت نہ ہارا۔ اس کش مکش میں ۱۹۵۶ء آ گیا۔ اس سال میرا تعارف "نظامی بک ایجنسی" بدایوں سے ہوا۔ ایک خط مَیں نے اُن کو بھی لکھ ڈالا تھا۔ اُن کا جواب ملا کہ "اعمال نامہ" کی ایک جلد مستعمل (سیکنڈ ہینڈ) ہمارے ہاں موجود ہے۔ قیمت سولہ روپے ہوگی (اصل قیمت آٹھ رُپے تھی) اور محصول ڈاک ڈھائی رُپے ہوگا"۔ مَیں نے اُسی روز تار دے دیا کہ کتاب میرے لیے محفوظ رکھ چھوڑیں۔ رقم شیخ مبارک علی صاحب (تاجر کتب لاہور) کو ارسال کر رہا ہوں۔ اس طرح "اعمال نامہ" کوئی نو دس برس کے بعد میرے کتب خانے میں پہنچی۔

مشاہدات

نواب ہوش یار جنگ (ہوش بلگرامی) کی خود نوشت داستانِ زندگی "مشاہدات" پر جب مَیں نے "صدق" میں مولانا عبد الماجد دریابادی کا طویل تبصرہ پڑھا تو بے تاب ہو گیا کہ اگر یہ کتاب مجھے نہ ملی تو میرا کتب خانہ کبھی مکمل نہ کہلا سکے گا۔ مَیں نے پاکستان اور ہندستان کے ہر بڑے تاجر کتب سے اس موضوع پر خط و کتابت کی، لیکن سوائے ناکامی اور نامرادی کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ "صدق" کے نائب مدیر اور ناظم الحاج حکیم عبد القوی دریابادی نے میرے خط کے جواب میں تحریر فرمایا کہ "مشاہدات" نہ صرف ضبط ہو چکی، بلکہ مصنف کی موت کا سبب بھی بن چکی ہے۔ جناب ضیاء الدین احمد برنی مدیر "کتابی دُنیا" کراچی نے جواب دیا کہ "مشاہدات" کراچی میں کہیں دست یاب نہیں ہوتی، البتہ اُس کا ایک نسخہ اُن کے ایک

دوست کے کتب خانے میں موجود ہے۔ وہ اُسے اپنے سے جُدا نہیں کرتے، جب کبھی مانگا
یہی جواب دیا کہ میرے ہاں تشریف لائیے، چائے پیجیے، کھانا کھائیے اور ساتھ ہی مشاہدات"
سے بھی دل بہلائیے۔ اِن اطلاعات نے میری آتش شوق کو اور بھڑکا دیا اور میری کوششیں
اُس کے حصول کے لیے تیز سے تیز تر ہو گئیں۔ آخر ایک عرصہ دراز کے بعد مکتبۂ نشاۃ ثانیہ
حیدر آباد دکن کے تعاون سے میرا یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا، گو قیمت اُس کی اُن کو بھی دُگنی
یعنی بیس رُپے دینا پڑی تھی، نواب ہوش یار جنگ کی زندگی کی یہ داستان خود اُن
کے قلم سے خوب تر ہے اُنھوں نے رام پور کے نواب سر حامد علی خاں اور حیدر آباد دکن
کے نواب میر عثمان علی خاں کے عشرت کدوں، عیش گاہوں اور درباروں کے متعلق جو کچھ
تحریر فرمایا، کاش یہی رنگ تمام کتاب پر غالب ہوتا۔ اُنھوں نے شمس العلما ڈاکٹر مولوی
سید علی بلگرامی مترجم "تمدنِ عرب" و "تمدنِ ہند"، بیگم بلگرامی، بابائے اُردو مولوی
عبد الحق، علامہ تاجور نجیب آبادی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبد الماجد دریابادی
کے متعلق اپنے تعلقات کی روشنی میں جو کچھ لکھا بہت ہی اچھا لکھا لیکن مہاراجہ سر کشن پرشاد
شادؔ اور نواب عماد الملک بلگرامی پر تو وہ پورا ایک باب ہی لکھ گئے۔ اس باب میں
اُنھوں نے اِن دونوں باکمال شخصیتوں کے رنگا رنگ مرقعے بہت ہی خوب صورتی اور
کمال چابک دستی سے کھینچے ہیں۔ افسوس کہ "مشاہدات" کا ایک بڑا حصہ اُنھوں نے حیدر آباد
دکن کی سیاسیات کی نذر کر دیا۔ یہاں وہ اس بُری طرح بہکے کہ اُنھوں نے "مجلس اتحاد
المسلمین" اُس کے قائدین اور رضا کاروں کی مذمت اور نام نہاد ہندوستانی پولیس ایکشن
کی تعریف کی۔ اس کی وجہ اُن کے حیدر آباد میں اُس زمانے کے ہندوستانی ایجنٹ جنرل مسٹر
کے۔ ایم۔ منشی سے دوستانہ تعلقات تھے۔ منشی نے اپنی کتاب END OF AN
ERA میں بڑی صاف گوئی سے لکھا تھا کہ پولیس ایکشن کے دنوں میں نواب
صاحب بھیس بدل کر رات کے دو دو بجے اُن کے پاس آتے تھے اور اُنھیں حالات سے
باخبر رکھتے تھے۔ اِن باتوں کے علاوہ نواب ہوش یار جنگ "مشاہدات" کے صفحات میں
اپنے مربی نظامِ دکن اور حیدر آباد کے بعض عمائدین کے خلاف اندرونِ خانہ اور خالص

ذاتی قسم کی چیزیں لے آئے۔ چناں چہ جب یہ کتاب منظرِ عام پر آئی تو اُس کی اِس قدر زبردست مخالفت ہوئی کہ مصنّف کو بعد میں متعدد مقامات پر اصل اوراق پھڑوا کر اُن کی جگہ نئے اوراق چھپوا کر لگوانے پڑے۔ جا بجا سطروں کی سطریں حذف کرنا پڑیں اور اُن پر نئی عبارتوں کی چٹیں چسپاں کروانا پڑیں۔ اس ردّ و بدل سے یہ کتاب غالباً اپنی نوعیت کی واحد کتاب بن گئی، لیکن اس تمام اہتمام کے باوجود مخالفت کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی اور آخر کار اس کتاب کو حیدر آباد میں ضبط کر لیا گیا۔ کتاب کی ضبطی سے مصنّف کو دلی صدمہ پہنچا اور چند دنوں بعد اُن کا انتقال ہو گیا۔

یادِ ایّام

"اعمال نامہ" اور "مشاہدات" کے حصول کی مہمات سے ذرا فارغ ہوا تھا کہ ایک اہم آپ بیتی اور سامنے آگئی۔ ۱۹۵۶ء ہی ذکر ہے، اِن دنوں لاہور کے مشہور ادبی مجلے 'نقوش' میں اُردو زبان میں خاکہ نگاری کے موضوع پر دہلی یونی ورسٹی کے پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب کا ایک طویل و بسیط مقالہ شائع ہوا تھا۔ جو بہت ہی بلند پایہ اور معلومات افزا تھا اور اس میں فاضل مقالہ نگار نے اس موضوع پر شائع ہونے والی بہت ساری کتابوں کا ذکر کیا تھا۔ ان کتابوں میں سے اکثر و بیشتر میری نظر سے گزر چکی تھیں، البتّہ ایک کتاب کے نام پر مَیں ٹھٹک کر رہ گیا کہ اِس کتاب کا مطالعہ تو کجا، اس کا نام بھی میں نے اب تک نہ سُنا تھا۔ یہ کتاب نوّاب حافظ سر محمد احمد سعید خاں چھتاری کی آپ بیتی "یادِ ایّام" تھی۔ نوّاب صاحب چھتاری انگریزی دَور میں مدّتوں یوپی کے ہوم ممبر رہے پھر ۱۹۳۳ء میں کچھ عرصے عارضی طور پر یو۔پی کے گورنر بھی مقرر ہوئے۔ اس لحاظ سے انھیں برِصغیر کا پہلا مسلمان گورنر متعین ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ بعد ازاں وہ ۱۹۴۴ء اور ۱۹۴۷ء میں ریاست حیدر آباد دکن کے صدرِ اعظم (وزیرِ اعظم) کی مسند پر بھی فائز رہے۔ ہاں تو میں کہ آپ بیتیوں کا عاشق نہیں، عاشقِ زار تھا "یادِ ایّام" کے حصول کے لیے بے چین ہو گیا۔ اُن دنوں ہندستان سے کتابوں کا حصول اتنا زیادہ مشکل نہ تھا۔ ہندستان کے مختلف

تاجرانِ کتب کا پاکستان کے تاجرانِ کتب سے لین دین تھا۔ وہ ایک دوسرے کے حساب میں رقمیں جمع کر لیتے تھے اور اس طرح ہندوستان سے کتابیں بہ آسانی آتی جاتی رہتی تھیں۔

"یادِ ایام" کے حصول کے سلسلے میں مَیں نے مختلف ہندوستانی اداروں کو لکھا لیکن یہ کتاب مجھے کوئی ادارہ بھی فراہم نہ کر سکا۔ آخر کار تین سال کی مسلسل اور ناکام خط و کتابت کے بعد مَیں نے نواب صاحب کو براہِ راست ایک عریضہ علی گڑھ کے پتے پر تحریر کیا جہاں وہ قیام فرما تھے اور اس میں اُن سے گزارش کی کہ وہ براہِ کرم مجھے "یادِ ایام" کی ایک جلد سے مُفتخر فرمائیں۔

میرا قیام اُن دنوں جہانیاں ضلع ملتان میں تھا۔ کوئی پندرہ بیس روز کے بعد پوسٹ مین نے مجھے ایک پیکٹ لا کر دیا جس پر ہندوستان کے ڈاک ٹکٹ چسپاں تھے۔ مَیں نے انھی دنوں حیدر آباد دکن کے پروفیسر الیاس برنی صاحب کو بھی ایک کتاب کی فراہمی کے لیے خط لکھا ہوا تھا، سوچا کہ شاید یہ وہ کتاب ہوگی، لیکن جب مَیں نے اس پیکٹ کو کھولا تو میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ یہ کتاب "یادِ ایام" تھی جو علی گڑھ سے جہانیاں تک معمولی پیکٹ کی صورت میں آئی تھی۔ یہ نواب صاحب کی میرے حال پر کمال مہربانی تھی کہ "یادِ ایام" اب میرے ہاتھوں میں تھی اور مَیں بڑے اشتیاق کے ساتھ اس کی فہرستِ مضامین پر نظر بھی ڈال رہا تھا۔ یہ دراصل "یادِ ایام" کی جلد اوّل تھی جو اُن کے سنِ ولادت ۱۸۸۹ء سے لے کر ۱۹۳۰ء تک کے حالات و واقعات پر مشتمل تھی اور اُس کے ہمراہ نواب صاحب کا مختصر سا گرامی نامہ بھی تھا۔

۱۹۶۴ء میں مجھے معلوم ہوا کہ "یادِ ایام" کی جلد دوم بھی شائع ہو گئی ہے۔ مَیں نے ایک عریضہ اُن کی خدمت میں بھی ارسال کر دیا۔ مَیں اُن دنوں ضلع ملتان کے ایک دُور افتادہ قصبے قطب پور میں بہ سلسلۂ ملازمت مقیم تھا۔ نواب صاحب نے اس مرتبہ بھی مجھ ناچیز پر نوازش فرمائی اور "یادِ ایام" کی جلد دوم جو مجلّد تھی مجھے پھر معمولی ڈاک ہی سے اس قریۂ ویراں میں مل گئی۔ نواب صاحب کی اِن پے در پے نوازشات سے مَیں بہت متاثر ہوا اور ہمیشہ کے لیے اُن کا گرویدہ ہو کر رہ گیا۔

عظمتِ رفتہ

اسی طرح ۱۹۵۳ء کا ذکر ہے جناب رئیس احمد جعفری کے ماہنامے "ریاض" کراچی میں ضیاء الدین احمد برنی صاحب کے مضامین جن کا موضوع پاک و ہند کی اہم شخصیات تھا نکل رہے تھے یہ مضامین میری طبیعت کو کچھ ایسے بھائے کہ میں برنی صاحب کو ایک توصیفی خط لکھ بیٹھا اور اُس میں اپنی اس آرزو کا اظہار کیا کہ اِن مضامین کو جلد ہی کتابی شکل دے دی جائے یہ قصہ بعد ازاں زلفِ محبوب کی مانند طویل ہوتا چلا گیا۔ اس موضوع پر باہمی مراسلت میں آٹھ سال سے زیادہ مدت صَرف ہو گئی اور کوئی ساٹھ ستر خطوط کا تبادلہ بھی ہوا کتاب "عظمتِ رفتہ" اپریل ۱۹۶۱ء میں چھپنا شروع ہوئی تو برنی صاحب نے اُس کے کچھ ابتدائی صفحات جو نیوز پرنٹ پر تھے میرے اشتیاق کے پیشِ نظر مجھے بھیج دیے۔ مَیں نے اُنھیں دیکھا تو میرے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ مَیں نے اُسی روز برنی صاحب کو لکھا کہ اگر آپ کی یہ عظیم کتاب نیوز پرنٹ پر چھپی تو میرے لیے اس سے بڑا المیہ اور کوئی نہ ہوگا۔ اُن کا جواب آیا کہ خاطر جمع رکھیے۔ یہ اوراق محض پروف ہیں۔ اصل کتاب آپ کے تخیّل سے کہیں زیادہ خوب صورت ہوگی۔ جولائی ۱۹۶۱ء میں آخر کار کتاب شائع ہو گئی۔ کیا گرد پوش، کیا جلد، کیا کاغذ، کیا ٹائپ، کیا نفسِ مضمون، ہر چیز اعلا و ارفع، اس کتاب کی ایک جلد مجھے ہدیۃً ملی اور ساتھ ہی محترم مصنّف کی طرف سے یہ اعزاز بھی کہ فی الحال اس کتاب کی پندرہ جلدیں شائع ہوئی ہیں۔ جن میں سے کچھ "آدم جی انعام" کے لیے رائٹرز گلڈ کو بھیجی جا رہی ہیں، ایک مولانا عبد الماجد دریا بادی کو، دوسری حضرت نیاز فتح پوری کو اور تیسری مجھ راقم الحروف کو۔ مجھے "عظمتِ رفتہ" کے متعلق پورا یقین تھا کہ ۱۹۶۱ء کا "آدم جی انعام" یہ کتاب جیت لے گی مگر لے گئیں جمیلہ ہاشمی "تلاشِ بہاراں" پر۔ سچ ہے ؂

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ کیوں نہ خوبیٔ قسمت پہ اپنی ناز کرے

بن کھلے مُرجھا گئے

چند اہم کتابوں کا ذکرِ جمیل جو چھپ نہ سکیں

زمانہ گزرتے دیر نہیں لگتی۔ پچیس تیس برس ہونے کو آئے، لیکن یہ جیسے کل ہی کی بات ہے۔ "فاران" کراچی کے اپریل ۱۹۵۲ء کے اس شمارے کے متعلق جو اس وقت میری نظروں کے سامنے میری میز پر پڑا ہوا ہے۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ میں نے اُسے کس قدر جذباتی انداز میں مقامی بک اسٹال سے خریدا تھا۔ اس کا سبب وہ مضمون تھا جو اِس میں "مشاہیر کے خطوط سید سلیمان ندوی کے نام" کے زیرِ عُنوان شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں متحدہ ہندوستان کے متعدد عمائدین کے خطوط جو انھوں نے کبھی مولانا سید سلیمان ندوی کے نام تحریر فرمائے تھے، شائع ہوئے تھے۔ مکاتیب نگار حضرات میں علامہ اقبال، گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو، ڈاکٹر راجندر پرشاد، نواب اِسمٰعیل خاں، سرشفاعت احمد خاں، نواب صدر یار جنگ مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، ڈاکٹر سید محمود، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا احمد سعید، مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا عبیداللہ سندھی شامل ہیں۔ مشاہیرِ ہند نے یہ تمام خطوط، اُردو زبان میں تحریر فرمائے تھے، حتیٰ کہ گاندھی جی کا خط بھی اُردو ہی میں تھا۔ ایک نادر و نایاب خط البتہ مشہور مستشرق پروفیسر ایڈورڈ براؤن کے قلم سے فارسی میں تھا۔ اِن خطوط کے پیش لفظ میں "فاران" کے فاضل مدیر حضرت ماہر القادری نے یہ مسرت افزا خبر سنائی تھی کہ یہ اور ایسے ہی بہت سے دوسرے خطوط عن قریب ایک مجموعے کی صورت میں شائع کیے جا رہے ہیں، لیکن افسوس صد افسوس اسی سال نومبر کے مہینے میں سید صاحب وفات پاگئے اور مکاتیب کا یہ بیش بہا ادر

بے مثال ذخیرہ پچیس تیس سال گزر جانے کے بعد بھی ابھی تک شائع نہ ہو سکا۔ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے صاحب زادے سید سلمان اِن دنوں سندھ یونی ورسٹی حیدر آباد (سندھ) میں ایک عہدۂ جلیلہ پر فائز ہیں۔ اُن کی تھوڑی سی توجہ اِن غیر معمولی خطوط کو گوشۂ گم نامی سے باہر لانے میں یقیناً ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ کاش وہ اس اہم کارنامے کو اب انجام دے ہی ڈالیں۔

اللہ مغفرت فرمائے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے دُنیائے علم و ادب پر بڑے احسانات ہیں۔ "سیرت النبی"، "سیرت عائشہ"، "ارض القرآن"، "نقوشِ سلیمانی"، "عمر خیام" اور "یادِ رفتگان" کے مصنف سے دل دادگانِ علم و ادب میں بھلا کون واقف نہیں۔ وفات سے کچھ عرصے پیشتر اُنھوں نے کراچی میں ایک ادارہ نشر و اشاعت "مکتبۂ الشرق" کے نام سے قائم فرمایا تھا جس کے زیرِ اہتمام اُن کی ایک نہایت ہی بلند پایہ اور دل پذیر کتاب "بریدِ فرنگ" شائع ہوئی تھی۔ "بریدِ فرنگ" سید صاحب کے اُن خطوط کا مجموعہ ہے جو اُنھوں نے تحریکِ خلافت کے زمانے میں لندن، پیرس اور دوسرے مقامات سے مولانا عبدالماجد دریا بادی اور چند دوسرے احباب کو تحریر فرمائے تھے، جب وہ مولانا محمد علی اور ڈاکٹر سید حسین کے ہمراہ ایک وفد کی صورت یورپ تشریف لے گئے تھے۔ سید صاحب نے اِن خطوط کو کچھ ایسی نُدرت اور جدّت سے ترتیب دیا تھا کہ اُن کا حُسن نکھر آیا اور اُن میں دیارِ غرب کے ایک علمی، ادبی اور سیاسی سفرنامے کا لطف محسوس ہونے لگا۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا نجّ وہ سانحۂ وفات اگر پیش نہ آتا تو اُمید تھی کہ "مشاہیر کے خطوط" بھی "بریدِ فرنگ" کی سی آب و تاب کے ساتھ اُنھی دنوں شائع ہو جاتے۔

"کتابوں کے اِنتظار میں عمر بیت گئی"

مطالعۂ کتب کا شوق تو مجھے لڑکپن ہی سے رہا، پھر بھی باقاعدگی سے میرے مطالعے کی عمر تیس پینتیس برس ضرور ہے۔ اس طویل عرصے میں جہاں مَیں نے مطبوعہ صورت میں اپنی پسندیدہ کتابوں کو فراموش نہ ہونے دیا، وہاں میرا ذہن اپنے گوشوں میں کچھ ایسی

کتابوں کی یادوں کو بھی محفوظ کرتا رہا جو میرے معیار اور مذاق کی تھیں اور اُس وقت زیرِ تجویز، زیرِ ترتیب، زیرِ تکمیل اور زیرِ طبع کی منزلوں میں تھیں۔ اُن کے انتظار میں زمانہ گزرنے لگا۔ دِنوں کے مہینے اور مہینوں کے سال بننے لگے، لیکن نہ یہ منزلیں طے ہونے میں آئیں اور نہ یہ کتابیں چھپیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ اِن کتابوں کی تعداد بھی بڑھنے لگی اور آہستہ آہستہ یہ تعداد پچاس ساٹھ تک جا پہنچی۔ اِن میں سے بعض کتابوں کا انتظار کرتے کرتے مجھے پندرہ پندرہ، بیس بیس اور تیس تیس سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے، مگر مَیں ابھی تک اُن کی اشاعت کے متعلق پُراُمید ہوں اور گاہے گاہے اِن کتابوں کے مصنّفین اور ناشرین سے خط و کتابت کرتا رہتا ہوں۔ دنیا بہ اُمید قائم ہے جب تک دم میں دم ہے مجھے اُن کا انتظار باقی رہے گا، اب سیّد سلیمان ندوی مرحوم کے یہ خطوط یاد آئے تو دل چاہا کہ اِن تمام کتابوں کی یادوں کو اپنے ذہن کے گوشوں سے نکال کر سینۂ قرطاس پر ثبت کر دوں اور اب یہی خواہش اس مضمون کی تخلیق کا محرک بن رہی ہے۔ اپنی ان محبوب کتابوں کا یہ تذکرہ میرے لیے تو دلچسپی کا باعث ہوگا ہی لیکن وہ لوگ بھی جنھیں کتابوں اور کتابوں کے ذکر سے وابستگی ہے اِسے پُرکشش ہی پائیں گے اور عجب نہیں کہ اِن سطور کا مطالعہ بشرطیکہ یہ سطور اُن کی نظر سے گزریں، ہمارے مصنّفین اور ناشرین حضرات کو بھی زیرِ تبصرہ کتابوں میں سے کچھ نہ کچھ کتابوں کی اشاعت کی جانب مائل کر دے۔ اِس تذکرے میں مَیں نے کچھ ایسے اہم اور قابلِ ذکر مضامین کی شمولیت بھی ناگزیر سمجھی ہے جو کافی پُرانے ہونے کے باوجود ابھی تک مختلف رسائل میں بکھرے ہوئے پڑے ہیں اور جن کی کتابی صورت میں دوبارہ اشاعت کا التزام ہمارے ادب میں بہت سی گراں قدر تصانیف کے عالمِ وجود میں لانے کا سبب بن سکتا ہے۔ میرے اِس مضمون کی آئندہ سطور میں کہیں بعض مقامات پر مرحوم مصنّفین کا ذکرِ خیر بھی ملے گا۔ جو اب بہرصورت ہماری دُعائے مغفرت کے مستحق ہیں۔

سوامی دیانند اور ستیارتھ پرکاش

وطنِ عزیز میں ایک صاحب حکیم اللہ بخش ہوا کرتے تھے۔ حکیم صاحب طب میں

شفاء الملک حکیم رضی الدین خاں بہادر کے شاگرد تھے اور اس فن کی باقاعدہ تکمیل کر چکے تھے، لیکن خدا جانے کیا وجہ ہوئی اُنھوں نے اِس فن کو پیشے کے طور پر نہ اپنایا۔ سلائی کر کے روزی کماتے تھے، شعر بھی کہتے تھے اور طالع تخلص کرتے تھے۔ حکیم صاحب فلسفہ، منطق اور مذاہبِ عالم پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ شاید اِسی سبب سے اُن کی طبیعت مُناظروں کی طرف مائل تھی، کیوں کہ مجھے جب کبھی اُن کی دُکان پر جانے کا اتفاق ہوتا، اُنھیں کسی نہ کسی عیسائی یا آریہ سماجی سے بحث و مباحثہ میں مصروف پاتا۔ اُنھوں نے آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی کی شرانگیز کتاب "ستیارتھ پرکاش" کے چودھویں باب جس میں سوامی جی نے قرآنِ حکیم پر ایک سو اُنسٹھ اعتراضات کیے تھے کا جواب محض فلسفے اور منطق کی رُو سے لکھا۔ مَیں نے کئی مرتبہ اُن کی اِس کتاب کے مسوّدے کو دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا لیکن جیسا کہ مصنّفین کی عادت ہوتی ہے اُنھوں نے ہمیشہ ٹال مٹول سے کام لیا۔ اُنھی دنوں (۱۹۴۳ء) میں صوبۂ سندھ کی حکومت نے جس کے وزیرِ اعظم سر غلام حسین ہدایت اللہ تھے "ستیارتھ پرکاش" کی ضبطی کے احکام صادر کیے۔ معاملہ نہایت اہم تھا، صوبے سے نکل کر پورے ملک میں پھیل گیا۔ آریہ سماجیوں نے آسمان سَر پر اٹھا لیا لیکن سر غلام حسین اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے اور اس بدنام زمانہ کتاب پر پابندی برقرار رہی۔ مَیں نے ان ایام میں بارہا حکیم صاحب سے اِصرار کیا کہ اب آپ کی کتاب کی اشاعت کا نہایت ہی موزوں وقت آگیا ہے، لیکن حکیم صاحب ٹس سے مَس نہ ہوتے۔ ۱۹۴۴ء میں حکیم صاحب وطن چھوڑ کر الور چلے گئے جہاں کچھ عرصے کے بعد اُن کا انتقال ہو گیا۔ اُن کی اس بیش قیمت کتاب کے مسوّدے کا کیا حشر ہوا اُسے خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

حکیم اللہ بخش طالع مرحوم کی مذکورہ بالا کتاب یقیناً اپنے موضوع پر ایک منفرد اور یکتا کتاب ہوتی، لیکن افسوس کہ یہ لاجواب کتاب مصنّف کے تساہل اور تغافل کا شکار ہو کر رہ گئی۔ یہ پہلی کتاب تھی جس کے ضائع ہونے کا مجھے ذاتی طور پر صدمہ ہوا۔ قحط الرجال اور علمی زوال کے اس عالم میں توقع نہیں کہ حال یا مستقبل میں ہمارے ہاں اس موضوع پر کوئی تحقیقی کام ہو سکے، کجا یہ کہ کوئی صاحب فلسفے اور منطق کی بنیادوں پر اب

یہ دینی خدمت سر انجام دینے پر آمادہ ہوں۔

اعمال نامہ: جلد دوم

"اعمال نامہ" کے متعلق بھی میرے یہی احساسات ہیں۔ سر سید رضا علی کی یہ باغ و بہار کتاب اردو آپ بیتیوں میں گلِ سر سبد کی حیثیت رکھتی ہے۔ "اعمال نامہ" کے سرورق پر گو اس امر کی وضاحت نہیں کی گئی تاہم "اعمال نامہ" اپنی موجودہ صورت میں دراصل جلد اول ہے۔ "اعمال نامہ" کی جلد دوم کے متعلق سید رضا علی صاحب نے "اعمال نامہ" کے آخر میں یہ سطریں تحریر فرمائی تھیں:

"اس خاتون (لیڈی رضا علی) کا تذکرہ کرنے کے بعد جو صحیح معنوں میں میری رفیقہ حیات اور محبوبہ تھی، کوئی اور ذکر کتاب کے اس حصے میں کرنا میرے جذبہ محبت کے منافی ہے۔ مجھے تسلیم ہے کہ میری زندگی کی کہانی اور محبت کی داستان نا تمام رہی۔ آخر "اعمال نامہ" ہے، کہاں تک اختصار سے کام لیا جائے۔ میرا شمار اُن لوگوں میں تھا جو بغیر پیے جھومتے ہیں۔ جو کچھ لکھ چکا ہوں، اُس کا سُرور شاید کتاب کا دوسرا حصہ تیار کرنے تک رہے۔ دوسرے حصے کے کافی اجزا کا مسوّدہ تیار ہے۔ بندگانِ خدا سے سر دست باتیں ہو چکیں۔ اب یادِ خدا کا وقت ہے ؎

پانی وُضو کو لاؤ، رُخِ شمع زرد ہے
مینا اُٹھاؤ، وقت اب آیا نماز کا

"اعمال نامہ" کے یہ الفاظ جب کبھی پڑھنے کا اتفاق ہوا، مجھے ہمیشہ دُکھ ہوا۔ کاش "اعمال نامہ" کا یہ دوسرا حصہ جس کا ذکر سید صاحب نے یہاں فرمایا ہے اُن کی زندگی ہی میں شائع ہو چکا ہوتا۔ "اعمال نامہ" کی جلد اول کو شائع ہوئے چالیس برس کے قریب گزر چکے اور سید صاحب کی وفات کو بھی چونتیس پینتیس سال ہونے کو آئے خدا جانے "اعمال نامہ" کی جلد دوم کا یہ مسوّدہ اب کن صاحب کے قبضے میں ہے اور وہ اسے شائع کیوں نہیں کر رہے ہیں۔ سوچتا ہوں کہیں یہ مسوّدہ ضائع تو نہیں ہو گیا' لیکن

ان تصورات سے فائدہ! سر سید رضا علی "اعمال نامہ" کی پہلی جلد کی اشاعت کے بعد کوئی پانچ سال زندہ رہے۔ تعجب ہے کہ وہ بھی جلد دوم کی اشاعت کا اس عرصے میں کوئی اہتمام نہ کر سکے۔ حیران کن بات یہ بھی ہے کہ "اعمال نامہ" کے پہلے ایڈیشن کے بعد اُس کے دوسرے ایڈیشن کے چھپنے کی بھی اب تک نوبت نہیں آئی، حالانکہ کتنے ہی لوگ ہیں کہ اُس کے دیدار کے مشتاق ہیں۔

تین اہم کتابیں

علی گڑھ کے ایک مشہور ادیب اور مصنّف مولوی محمد مقتدیٰ خاں شیروانی تھے۔ بہت دیر کی بات ہے، مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ نواب سر محمد مزمّل اللہ خاں شیروانی اور نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی سوانح حیات علاحدہ علاحدہ تحریر فرما رہے تھے، بلکہ ثانی الذکر کی تسوید و تہذیب میں تو مولانا ابوالکلام آزاد کی قلمی امداد بھی شامل تھی، کیوں کہ نواب صدر یار جنگ وہی بزرگ ہیں جن کو مولانا آزاد "غبارِ خاطر" اور "کاروانِ خیال" میں "صدیقِ مکرم" اور "صدیقی العزیز" جیسے القابات سے تخاطب فرماتے رہے ہیں۔ ان کتابوں کے ساتھ ساتھ وہ ایک اور کتاب یو۔پی کے اپنے زمانے کے مشہور سیاسی رہنما جناب تصدق احمد خاں شیروانی کے متعلق ڈاکٹر سید محمود صاحب سے بھی لکھوا رہے تھے۔ یہ کتابیں اگر چھپ جائیں تو ہمارے سوانحی ادب میں گراں قدر اضافہ ثابت ہوتیں، لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوا اور اب تو اُن کے چھپنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لیے کہ مولوی محمد مقتدیٰ خاں اور ڈاکٹر سید محمود دونوں انتقال فرما چکے ہیں۔

"میرا علی گڑھ": اشاعت کی تمنّا!

خان بہادر ڈپٹی حبیب اللہ خاں بہت پُرانے علیگ تھے۔ وہ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کے ابتدائی طلبہ میں سے تھے۔ کوئی بیس برس ہوتے، ننانوے سال کی عمر میں اُن کا انتقال ہوا۔ شاہجہان پور کے رہنے والے تھے، لیکن علی گڑھ سے گہری محبّت کی بنا پر

وطن چھوڑ کر علی گڑھ آ بسے تھے اور یہیں "ولایت منزل" کے نام سے اپنی کوٹھی بنا ڈالی تھی۔ خان بہادر صاحب مسلم یونی ورسٹی اور اُس کے معاملات پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے "حیاتِ آفتاب" کے زیرِ عنوان صاحب زادہ آفتاب احمد خاں سابق وائس چانسلر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی سوانح حیات بھی مرتب فرمائی تھی۔ وہ بہت دنوں سے اپنی آپ بیتی "میرا علی گڑھ" لکھ رہے تھے جس کا ایک باب "علی گڑھ کا کرکٹ" ۱۹۴۱ء میں الگ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ کرکٹ کے کھیل سے مجھے کوئی دل چسپی نہیں، لیکن یہ کتاب "علی گڑھ کا کرکٹ" واقعات کے لحاظ سے ایک پُر لطف کوشش ہے۔ "میرا علی گڑھ" کے موضوع پر میری بھی خان بہادر صاحب سے کئی سال مراسلت رہی۔ خرابیِ صحت کی وجہ سے وہ میرے خطوط کا جواب ہمیشہ دیر سے دیتے تھے، لیکن جواب سے نوازتے ضرور تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے میرے ایک خط کا جواب پورے چھے ماہ کے بعد عنایت فرمایا تھا۔ خان بہادر صاحب وفات پا گئے۔ میرا خیال ہے کہ "میرا علی گڑھ" کا مسودہ مکمل نہیں ہوا۔ یہاں اس حقیقت کا اظہار غالباً لطیفے سے کم نہیں کہ خان بہادر صاحب نے "علی گڑھ کا کرکٹ" میں ایک مقام پر "حیاتِ آفتاب" کا ذکر فرمایا اور اس کے آگے خطوطِ وحدانی میں یہ الفاظ تحریر فرمائے "جو زیرِ طبع ہے" آپ کو یہ سُن کر تعجب ہوگا اور شاید ہنسی بھی آئے کہ یہ "زیرِ طبع" کتاب "حیاتِ آفتاب" کم و بیش پندرہ سال کے بعد ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی۔

"یادِ ایام": جلد سوم

نواب حافظ سر محمد احمد سعید خاں صاحب چھتاری کی آپ بیتی "یادِ ایام" کی پہلی جلد جو ۱۹۳۰ء تک کے واقعات پر ختم ہو جاتی ہے، قیامِ پاکستان کے کچھ عرصے بعد علی گڑھ سے شائع ہو گئی تھی۔ چند سال بعد اس کتاب کی جلد دوم بھی جو ۱۹۴۳ء تک کے واقعات پر مشتمل تھی اشاعت پذیر ہوئی۔ لیکن جلد سوم جس کا نواب صاحب نے مجھے اپنے ایک گرامی نامے میں مژدہ سُنایا تھا کہ جلد ہی منظرِ عام پر آ رہی ہے کچھ ایسی مجبوریوں کا شکار ہوئی کہ بیس سال کے طویل انتظار کے بعد بھی اُس کی اشاعت کی نوبت نہ آئی اور اب تو کوئی

اُمید ہی باقی نہ رہی کہ نواب صاحب ہی مرحوم ہو گئے۔ اللہ مغفرت فرمائے۔

حیاتِ ماجدی

مولانا عبدالماجد دریابادی بہت ساری کتابوں کے مصنف ہیں۔ اُن کی تین کتابیں "محمد علی: ذاتی ڈائری کے چند اوراق"، "سفرِ حجاز" اور "مقالاتِ ماجد" تو میری پسندیدہ کتابوں میں سرفہرست ہیں، لیکن اُن کی سب سے زیادہ دلکش اور دل آویز کتاب اُن کی آپ بیتی "حیاتِ ماجدی" ہے جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے اور جس کے دو باب مدت ہوئی ماہنامہ "چراغِ راہ" کراچی میں میری نظر سے گزرے تھے۔ "حیاتِ ماجدی" کے مسودے کو مکمل ہوئے بیس بائیس سال گزر چکے ہیں لیکن یہ کتاب ابھی تک چھپنے میں نہیں آرہی ہے، کیوں کہ مولانا دریابادی نے اس کی اشاعت پر ایک بہت ہی عجیب سی پابندی عائد کی ہوئی ہے اور وہ یہ کہ "حیاتِ ماجدی" اُن کے جیتے جی ہرگز شائع نہ ہوگی۔ اپنی محبوب کتابوں کی اشاعت کے لیے میں نے کئی مرتبہ دعائیں بھی مانگی ہیں لیکن "حیاتِ ماجدی" کی اشاعت کے لئے تو میں دعا بھی نہیں مانگ سکتا۔ خدائے پاک مولانا عبدالماجد دریابادی کو خوش و خرم رکھے۔ (افسوس! مولانا دریابادی اب وفات پا چکے۔ لیکن اُن کی آپ بیتی اب شائع ہو چکی ہے۔)

میرے زمانے کی دِلّی

مُلّا واحدی صاحب ہلکا پھلکا اور شگفتہ لکھنے میں اپنی مثال آپ تھے۔ "حیاتِ سرورِ کائنات"، "میرے زمانے کی دِلّی" اور "حیاتِ خواجہ حسن نظامی" اُن کی بہترین تصانیف ہیں، لیکن یہ سب کی سب نامکمل ہیں۔ "حیاتِ سرورِ کائنات" کو وہ چھ جلدوں میں مکمل کرنا چاہتے تھے، لیکن صرف تین جلدوں کی تکمیل ہوئی۔ "میرے زمانے کی دِلّی" کی چار جلدوں کا مواد اُن کے پاس موجود تھا، لیکن اُس کی صرف ایک جلد ہی چھپی۔ "حیاتِ خواجہ حسن نظامی" کو بھی اُنھوں نے ۱۹۲۷ء تک کے واقعات پر ختم کر دیا، حالانکہ خواجہ صاحب کا انتقال ۱۹۵۵ء

میں ہوا۔ یوں اُنھوں نے اس سلسلے کو بھی اَدھورا چھوڑ دیا۔ پھر شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھنے لگے تو سولہ صفحات لکھ کر بس کر گئے۔ واحدی صاحب اپنی ایک پُرانی کتاب "مضامینِ واحدی" کا نیا ایڈیشن شائع کرنا چاہتے تھے، لیکن بس اعلان کر کے ہی رہ گئے۔ پہلے تو توقعات بھی تھیں کہ شاید کوئی کتاب چھپ ہی جائے، لیکن اُن کی وفات کے بعد تو امّید ہی ختم ہو کر رہ گئی۔ کاش ہمدرد فاؤنڈیشن جس نے کبھی اُن کی کتاب "تاثرات" کو شائع کیا تھا ان کتابوں کی اشاعت کے کام کو سنبھال لے۔

مسوّدہ گم ہو گیا

خواجہ حسن نظامی کے مسترشدین میں ایک صاحب عبدالنعیم خاں ہوتے تھے۔ وہ غالباً تاج کمپنی کراچی سے متعلق تھے۔ بہت عرصہ ہوا اُنھوں نے مرزا فرحت اللہ بیگ حضرت فلک پیما، ڈاکٹر غلام یزدانی، ملّا واحدی اور اسی قبیل کے دوسرے اہل قلم حضرات سے کوئی دس بارہ مضامین خواجہ حسن نظامی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر لکھوائے تھے۔ یہ مضامین لکھوانے کو تو لکھوا لیے گئے، لیکن مدت تک اُن کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ پھر ایک دن ایسا آیا کہ ان مضامین کا مُسوّدہ ہی نعیم صاحب سے گُم ہو گیا اور وہ بے چارے ہاتھ ملتے رہ گئے۔ ان مضامین کے لکھنے والے حضرات قریب قریب تمام کے تمام وفات پا چکے، لہٰذا ان مضامین کے دوبارہ لکھوائے جانے کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کاش یہ مضامین اُسی زمانے میں چھپ گئے ہوتے جب انھیں لکھوایا گیا تھا تو اُردو ادب بہترین تحریروں کے اس بے نظیر مجموعے سے محروم نہ ہوتا۔

نواب عماد الملک: سوانح حیات

نواب ہوش یار جنگ (ہوش بلگرامی) نے اپنی آپ بیتی "مشاہدات" میں نواب عماد الملک مولوی سیّد حسین بلگرامی کے متعلق ایک بہت ہی پیارا سا مضمون ان کی عقیدت اور محبت میں ڈوب کر لکھا تھا۔ اس مضمون میں ہوش صاحب نے ایک مقام پر بتایا تھا

کہ وہ نواب عماد الملک کے بارے میں ایک علاحدہ کتاب لکھ رہے ہیں' مشاہدات' کی اشاعت کے کچھ عرصے بعد ہی ہوش صاحب کا اچانک انتقال ہو گیا۔ نہ جانے نواب عماد الملک کی سوانح حیات کا پھر کیا بنا۔

سرسید پر ایک اہم کتاب؛

ماہنامہ' نئی تحریریں' لاہور (شمارہ ستمبر ۱۹۵۴) میں' منشی نجم الدین' کی غیر معمولی شخصیت پر ایک دل چسپ مضمون ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو کے قلم سے میری نظر سے گزرا تھا۔ آرزو صاحب اُردو کے سلجھے ہوئے ادیب ہیں اور' غالبیات' پر دقیق نظر رکھتے ہیں۔ منشی نجم الدین صاحب سرسید کے منشی تھے اور اُن کی بیٹھی میں رہتے تھے اُنھوں نے" بابائے علی گڑھ" کے ساتھ ایک طویل زمانہ گزارا تھا اور اُنھیں بہت ہی قریب سے دیکھا تھا۔ منشی نجم الدین کے پاس خطوط، اسناد اور دوسری نایاب تحریروں کے علاوہ علی گڑھ تحریک سے تعلق رکھنے والے اصحاب کی تصویروں کا بڑا نادر ذخیرہ موجود تھا جس میں سرسید، سید محمود، ان کے خاندان کے بعض اعزہ، اُن کے معاصرین اور احباب، کالج کے قدیم اساتذہ اور ممتاز اہلِ قلم حضرات کی بہت اچھی عکسی تصویریں تھیں۔ آرزو صاحب' منشی نجم الدین سے متعدد مرتبہ ملے۔ اس مضمون میں اُنھوں نے یہ خیال ظاہر فرمایا تھا کہ وہ سرسید کی زندگی پر ایک کتاب لکھیں گے جس میں مطبوعہ ماخذوں سے صرفِ نظر کر کے اُن اصحاب سے جیسے کہ منشی نجم الدین ہیں۔ سرسید کے ذاتی حالات اور اُن کی تحریک کے متعلق ایسی معلومات فراہم کریں گے جو صرف اُنھی بزرگوں کے سینوں میں پوشیدہ ہیں۔ یہ کام آرزو صاحب ہی کے کرنے کا تھا، مگر ابھی تک نہیں ہو سکا۔ ہو سکتا ہے کہ اُن کی دوسری مصروفیات اس راہ میں حائل ہو گئی ہوں۔ خدا کرے میرے یہ الفاظ آرزو صاحب تک پہنچ جائیں اور وہ اب اس کام کا بیڑا اُٹھا لیں۔

دو نہایت دل چسپ مسودات کا زیاں؛

جناب ضیاء الدین احمد برنی کے برادرِ بزرگ منشی عبدالقدیر دہلوی کا تحریکِ آزادی

سے دیرینہ تعلق رہا اور اُس کی پاداش میں اُنھوں نے عمرِ عزیز کا ایک حصہ قیدِ فرنگ میں گزارا۔ اس زمانے کی یادوں کو اُنھوں نے "جیل میں دو سال" کے عنوان سے لکھا اور دلّی کے ایک ناشر کے حوالے کیا۔ اُنھوں نے ایک دوسری کتاب "دلّی میں پچپن برس" لکھی اور وہ بھی اُنھی ناشر صاحب کو دے دی۔ یہ ۱۹۴۵ء کی بات ہے۔ یہ کتابیں ناشر کے واضح اعلان کے باوجود جب کئی سال تک نہ چھپیں تو مَیں نے منشی عبدالقدیر صاحب سے اِن کے اب تک شائع نہ ہونے کا سبب دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ ناشر صاحب پریس کے مقروض تھے۔ پریس کے مالک نے "جیل میں دو سال" کی تیار شدہ پلیٹوں کو دبا لیا اور کہا کہ قرض ادا کر دیجیے اور پلیٹیں لے جائیے۔ نہ اُن کے پاس پیسے ہوئے اور نہ کتاب واپس ملی اور چھپی اور اس طرح یہ کتاب اس تنازعے میں ہی ضائع ہو گئی۔ "دلّی میں پچپن برس" کے متعلق اُنھوں نے جواب دیا کہ یہ کتاب اب "دلّی میں پینسٹھ برس" کی صورت میں چھپے گی لیکن وقت گزرتا گیا اور کچھ بھی نہ ہوا حتیٰ کہ منشی صاحب ہی رحلت فرما گئے۔

مولانا غلام رسول مہرؔ: آپ بیتی

۱۹۵۹ء میں مَیں نے مولانا غلام رسول مہرؔ سے اُن کی زیرِ ترتیب کتاب "سرودِ رفتہ" کے نفسِ مضمون کے متعلق استفسار کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ "سرودِ رفتہ" اُن کی آپ بیتی ہے۔ مولانا مہرؔ نے میرے استفسار کے جواب میں تحریر فرمایا تھا کہ "سرودِ رفتہ" اُن کی سرگزشت نہیں، بلکہ علامہ اقبال کا وہ کلام ہے جو اُنھوں نے اس لیے قلم زد فرما دیا تھا کہ وہ اُن کے معیارِ بلند کے مطابق نہ تھا۔ اُنھوں نے مزید فرمایا کہ اُن کی سرگزشت تو نہیں، البتہ اُن کے دَور کی سرگزشت اِن شاء اللہ بہت جلد مکمل ہو جائے گی۔ اُس کی دو جلدیں ہوں گی۔ جلد اوّل ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء تک کے حالات پر مشتمل ہو گی اور دوسری جلد ۱۹۰۱ء سے ۱۹۴۷ء تک کے دور کا احاطہ کرے گی۔ اُنھوں نے مزید لکھا تھا کہ چوں کہ وہ خود ۱۹۲۱ء سے سیاسیات میں آ گئے تھے اور بعد کے تمام واقعات اُن کے سامنے گزرے ہیں اس لیے جلد دوم میں آپ بیتی کا رنگ ضرور ہو گا۔ مَیں نے

اپنی دل چسپی کی بنا پر ان کتابوں کا بھی انتظار کیا لیکن بوجوہ وہ شائع نہ ہو سکیں۔ دریں اثنا مولانا تہر بھی اپنے مولا سے جا ملے۔

آپ بیتی: جسٹس سیّد امیر علی

کراچی کے ایک اشاعتی ادارے "مکتبۂ خدامِ ملت" نے عرصہ ہوا ایک نادر و نایاب کتاب کا ترجمہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ کتاب جسٹس سیّد امیر علی مرحوم کی خود نوشت داستانِ زندگی تھی جو اُنھوں نے کبھی انگریزی میں لکھی تھی اور ابھی تک غیر مطبوعہ حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ ناشر کے پے در پے اعلانات سے اُس زمانے میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کتاب بہت جلد شائع ہو رہی ہے، لیکن بعد ازاں بدقسمت کتاب کچھ ایسی مشکلات سے دوچار ہوئی کہ چھپ ہی نہ سکی (یہ کتاب اب مکتبۂ اسلوب کراچی نے شائع کر دی ہے)

ایک اہم سفرنامہ

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنے مختصر سے سفرنامے "شرقِ اوسط میں کیا دیکھا" جو جنوری ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا تھا، کے پیش لفظ میں یہ تحریر فرمایا تھا کہ اُن کے اس سفرنامے کے اجمال کی تفصیل اُن کی اُس ڈائری میں ملے گی جو کئی سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور اور جو مصر، سوڈان، شام، شرقِ اُردن اور فلسطین کا مکمل سفرنامہ اور روزنامچہ اور وہاں کی زندگی، معاشرت، سیاست اور تعلیم کا اُبھرا ہوا خاکہ ہے۔ مولانا علی میاں کے اس دل غریب سفرنامے کا انتظار کرتے ہوئے ایک طویل مدت بیت گئی، لیکن ہنوز روزِ اوّل والا معاملہ ہے۔

ایک نہایت دل چسپ کتاب: "دربارِ دُربار"

بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے اپنی وفات سے کوئی ہفتہ بھر پیشتر اپنے ایک بیان میں حکیم اسرار احمد کریوی ناظم مطبوعات انجمن ترقی اُردو پاکستان کی خصوصی توجہ

حضرت صدق جائسی کی کتاب "دربارِ دُربار" کی جانب مبذول کرائی تھی کہ وہ اس کتاب کو جلد از جلد انجمن کی طرف سے شائع کرنے کا اہتمام کریں۔ بابائے اُردو کی وفات کو بیس بائیس برس گزر گئے، لیکن "دربارِ دُربار" کی اشاعت کا مسئلہ جُوں کا تُوں ہے۔ "دربارِ دُربار" یُوں تو فانی بدایونی کی حرماں نصیبی کی داستان ہے، لیکن بر سبیل تذکرہ اس کتاب میں متعدد دلچسپ اور پُر لطف واقعات ایسے بھی شامل ہو گئے ہیں جن کا تعلق میر محبوب علی خاں نظامِ دکن، میر عثمان علی خاں نظامِ دکن، پرنس اعظم جاہ، پرنس معظم جاہ، مرزا داغ، امیر مینائی، جلیل مانک پوری، جوش ملیح آبادی، ماہر القادری نجم آفندی اور کتاب کے مصنف صدق جائسی سے ہے۔ "دربارِ دُربار" سے مصنف کی مراد شہزادہ معظم جاہ جونیئر پرنس ریاست حیدر آباد دکن کا وہ دربار ہے جہاں مصنف کا ایک اعزازی مصاحب کی حیثیت سے آنا جانا تھا۔

سوانح حیات بابائے اُردو

بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی مفصل سوانح جس کے متعلق سُنا تھا کہ حکیم اسرار احمد کریوی ترتیب دے رہے تھے، کی اشاعت کی بھی اب کوئی صورت نظر نہیں آتی اِس لیے کہ حکیم صاحب بھی وفات پا چکے ہیں۔ یہ اہم کارنامہ اب دیکھیے کون انجام دیتا ہے۔

بابائے اُردو کے متعلق ایک اہم کتاب

حیدر آباد دکن کی ڈاکٹر بیگم قطب النسا ہاشمی نے کئی سال ہوئے "بابائے اُردو" کے نام سے بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے متعلق ایک کتاب ترتیب دی تھی۔ یہ کتاب اُن سے کراچی کے ایک ناشر نے حاصل کر لی، لیکن کئی سال تک اپنی فہرست کتب میں اس کتاب کا اشتہار دینے کے باوجود اسے شائع نہیں کیا۔ کوشش کے باوجود مجھے اس کتاب کی عدم اشاعت کا پس منظر معلوم نہ ہو سکا تاہم مصنفہ ناشر کے رویے کی شاکی ضرور پائی گئی ہیں۔

"خونِ بہا": ایک نامکمل کتاب

خان بہادر حکیم احمد شجاع نے اب سے کوئی تیس سال پیشتر اپنی آپ بیتی "خون بہا" میں بڑے پیارے اور خوب صورت انداز میں اپنی زندگی کے مشاہدات اور تاثرات پیش کیے تھے۔ اُن کی اس پُر لطف کہانی میں ضمناً کچھ ایسے واقعات اور شخصیات کا تذکرہ بھی آ گیا تھا جو ہماری قومی، مجلسی اور سیاسی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ حکیم صاحب بُنیادی طور پر ادیب ہیں اس لیے اِس رُوداد کا اُسلوبِ نگارش اور اندازِ بیان بہت ہی پُر کیف اور دِل کش ہو گیا ہے۔ "خوں بہا" کی زیرِ نظر جلد پر "جلد اوّل" لکھا ہوا نظر آتا ہے اور واقعات کے لحاظ سے وہ ۱۹۱۵ء میں اختتام پزیر ہو جاتی ہے۔ حکیم صاحب نہ صرف صاحب طرز ادیب تھے، بلکہ مجلسِ قانون ساز صوبہ پنجاب کے ڈپٹی سیکرٹری اور سیکرٹری اور مجلسِ قانون ساز صوبہ مغربی پاکستان کے سیکرٹری بھی رہ چکے تھے اور انھوں نے اپنی زندگی کا ایک طویل زمانہ سیاسی گہما گہمی میں بھی گزارا تھا۔ کاش وہ ۱۹۱۵ء کے بعد کی اپنی زندگی کی داستان بھی اسی انداز میں مرتب فرما دیتے تو اُن کا یہ دل نشیں تذکرہ یقیناً ادب و سیاست کا ایک حسین امتزاج ثابت ہوتا اور اُس کی اشاعت سے درونِ پردہ کے کچھ ایسے حالات و واقعات سامنے آتے جن سے حکیم صاحب کے سوا کوئی اور واقف نہ تھا۔

نعیم صدّیقی: جیل کی ڈائری

جماعت اسلامی کے رہنما اور ماہنامہ "سیارہ" لاہور کے فاضل مدیر جناب نعیم صدّیقی کو قادیانی تحریک کے سلسلے میں ۱۹۵۳ء کے ابتدائی ایام میں کچھ عرصے جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے رہنا پڑا تھا۔ جب وہ رِہا ہوئے تو انھوں نے ماہنامہ "چراغِ راہ" کراچی کے ایک خاص شمارے میں ایامِ اسیری کے متعلق اپنے کچھ تاثرات پیش کیے تھے۔ اس زمانے میں لاہور کے ایک ناشر نے اِعلان کیا تھا کہ وہ جلد ہی نعیم صدّیقی صاحب

کی جیل کی ڈائری کو ایک مستقل کتاب کے طور پر پیش کر رہے ہیں، لیکن بعد ازاں ایسا نہ ہوا اور اب تو امتدادِ زمانہ نے اِس اُمّید کو نومیدی ہی میں بدل دیا ہے۔ اس ضمن میں مشہور افسانہ نگار اور شاعر جناب احمد ندیم قاسمی کے اُن مضامین کا ذکر بھی کیا جاسکتا ہے جو "زندان و سلاسل" اور "مہر بہ لب" کے زیرِ عنوان "نقوش" لاہور میں کئی قسطوں میں اُس زمانے میں شائع ہوتے تھے جب وہ "راولپنڈی سازش کیس" میں سزایاب ہونے کے بعد رہا ہوئے تھے۔ اُنھوں نے "مہر بہ لب" کے نام سے اپنے زمانۂ اسارت کی یادوں کو ترتیب دے ڈالا تھا اور اس فکر میں تھے کہ یہ کتاب جلد شائع ہو جائے، لیکن پھر نہ جانے کیا حالات پیش آئے کہ یہ کتاب چھپتے چھپتے رہ گئی۔

مولانا ظفر علی خاں: سوانح حیات

برصغیر کے مشہور سیاسی رہنما اور شعلہ بیان شاعر مولانا ظفر علی خاں کی ابھی تک کوئی مفصل اور مبسوط سوانح حیات تحریر نہیں کی گئی گو اُن کی وفات کو پچیس برس سے زیادہ مدّت گزر چکی۔ اُن کی وفات کے بعد یہ معلوم ہوا تھا کہ اُن کے چھوٹے بھائی چودھری غلام حیدر صاحب اپنے برادرِ بزرگ پر قلم اٹھا رہے ہیں۔ چودھری صاحب، صاحبِ قلم بھی تھے اس لیے اُمید تھی کہ وہ اس کام کو سرانجام دے ڈالیں گے اور اُن کے قلم سے مولانا ظفر علی خاں کی ایک جامع اور باوقار سوانح عمری مرتّب ہو جائے گی لیکن افسوس کہ طویل انتظار کے باوجود یہ مرحلہ طے نہ ہو سکا۔

کراچی کی حسرت میموریل سوسائٹی مولانا فضل الحسن حسرت موہانی کی سوانح حیات پر ایک بلند پایہ کتاب شائع کرنے کی کوشش کر رہی تھی، لیکن بیسیوں برس گزر جانے کے بعد بھی اس کتاب کا تانا بانا تیار نہیں ہوا۔

شہاب نامہ

دس بارہ برس ہوئے مشہور ادیب اور حکومتِ پاکستان کے سابق سکرٹری

جناب قدرت اللہ شہاب نے اپنی آپ بیتی "شہاب نامہ" ماہنامہ "سیارہ ڈائجسٹ" لاہور میں بالاقساط شروع کی تھی جو بلا شبہ خاصے کی چیز تھی اور "سیارہ ڈائجسٹ" کے حلقۂ قارئین میں بڑی دلچسپی سے پڑھی گئی تھی۔ "سیارہ ڈائجسٹ" ہی میں اُنھوں نے مختلف عنوانات قائم کر کے اپنی اس آپ بیتی کی متوقع جھلکیاں بھی دکھائی تھیں۔ دو چار قسطیں شائع بھی ہوئیں، لیکن پھر غالباً اُن کی سیاسی مجبوریاں اس راہ میں حائل ہو گئیں اور اُنھوں نے اپنا قلم روک لیا۔ ("شہاب نامہ" حال ہی میں شائع ہو گئی ہے)

مکتبۂ جدید لاہور کی فہرستوں میں ایک مدت تک مولوی محمد امین زبیری کی کتابوں "تذکرۂ محسن" اور "تذکرۂ وقار" جو بالترتیب نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کے متعلق تھیں کا "زیرِ طبع" کے ضمن میں ذکر ہوتا رہا اور مکتبۂ مہر نیم روز کراچی اپنے تین سفرناموں "سفرِ انگلستان" "سفر نامہ امریکا" اور "نئے چمن نئی بہاریں" کی قریبی اشاعت کا یقین دلاتا رہا، لیکن مجھ ایسے شائقانِ جمال کے خرمنِ صبر و قرار میں آگ لگا کر میری یہ محبوب کتابیں نہ جانے کہاں چھپ گئیں۔ یہی شکوہ مجھے ملک دین محمد اینڈ سنز لاہور سے ہے جو جناب رئیس احمد جعفری کی کتابیں "دامانِ باغباں" اور "اربابِ نشاط" بیسیوں برس کی مدت گزر جانے پر بھی شائع نہیں کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر محمد باقر سابق صدر شعبۂ فارسی پنجاب یونی ورسٹی لاہور کی خود نوشت سرگزشت "لاہور سے لاہور تک" اور "لاہور سے لندن تک" جو دو ماہی "صحیفہ" لاہور میں بالاقساط شائع ہوتی رہی ہے، خوب سے خوب تر تھی اور اس امر کی پوری طرح متقاضی بھی کہ یہ شگفتہ داستان ایک کتاب کی صورت میں دوبارہ شائع ہو کر ہمارے ذوقِ مطالعہ کی تسکین کا سبب بنے، لیکن ایسا نہ ہوا۔

پروفیسر اقبال شیدائی: اہم آپ بیتی

ایک اور سلسلۂ مضامین جس کا تعلق تحریکِ خلافت اور تحریکِ ہجرت سے ہے، میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ میری مراد یہاں مشہور انقلابی، پروفیسر اقبال شیدائی کے اُن

بے شمار مضامین سے ہے جو ایک زمانے میں روزنامہ امروز، لاہور میں شائع ہوئے تھے۔ تحریک خلافت اور تحریک ہجرت کے متعلق "مشاہداتِ کابل و یاغستان" (مولانا محمد علی قصوری) "آپ بیتی" (کیپٹن ظفر حسن ایبک) اور "سرگزشتِ مجاہد" (غازی عبدالکریم چھرکنڈی) کے علاوہ بھی کوئی اور قابلِ ذکر آپ بیتی نظر نہیں آتی۔ ان حالات میں اگر شیدائی صاحب کی آپ بیتی بھی شائع ہو جاتی تو اس موضوع پر ایک قابلِ قدر اضافہ ثابت ہوتی۔

م۔ ش کے مضامین

لیجیے مشہور صحافی میاں محمد شفیع بھی بر وقت یاد آئے۔ بہت دنوں کی بات ہے ہفت روزہ "آفاق" لاہور میں 'میری جیل یاترا' کے عنوان سے کوئی ایک درجن قسطوں میں یہ داستان اُن کے قلم سے نکلی تھی جس کا تعلق اُس نازک دور سے تھا جب تحریک پاکستان اپنی جدوجہد کے آخری ایام میں داخل ہو رہی تھی۔ اس زمانے میں اُنھوں نے اپنے مخصوص انداز میں پنجاب کی بعض اہم سیاسی شخصیات کے خاکے بھی "آفاق" میں پیش کیے تھے۔ یہ سب چیزیں ادبی لحاظ سے بھی بہت بلند اور وقیع تھیں اور آج بھی اُن کی اس حیثیت میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے۔ میاں صاحب توجہ فرمائیں تو اُن کی ایک بہت ہی عمدہ اور قابلِ مطالعہ کتاب ان مضامین کے ایک مجموعے کی صورت میں منصۂ شہود پر آسکتی ہے اور پھر اُن کی مشہور و معروف "لاہور کی ڈائری" کا ایک انتخاب بھی اگر چھپ جاتے تو کیا کہنے!

مجھے جناب عبداللہ ملک کے وہ مضامین بھی یاد ہیں جو کچھ عرصہ قبل ہفت روزہ 'لیل و نہار' لاہور میں "یادوں کے مزار" بن کر شائع ہوتے رہے۔ "لیل و نہار" میں شیخ عبدالرحیم (علیگ) کے پُر لطف مضامین "نواب محسن الملک" "شیخ عبدالقادر" اور "مسعود نامی مرحوم" وغیرہ بھی بھولنے والی چیزیں نہیں۔ میری شدید خواہش ہے کہ یہ دل چسپ اور دل فریب مضامین جو یوں بکھرے پڑے ہوتے ہیں، جلد سے جلد خوب صورت اور خوش ادا کتابوں کی صورت میں یک جا ہو جائیں۔

"زندگانی کی گزرگاہوں میں"

ہاں، دو عمدہ کتابیں اور بھی میرے انتظار کے مراحل میں ہیں۔ پہلی کتاب "زندگانی کی گزرگاہوں میں" ہے۔ یہ ہمارے ملک کے نامور صحافی، کہنہ مشق شاعر اور ادیب مولانا نصراللہ خاں عزیز، مدیر "ایشیا" لاہور کی زندگی کی کہانی ہے جو گاہ گاہ ہفت روزہ "ایشیا" لاہور میں شائع ہوتی رہی ہے۔ دوسری کتاب حضرت حفیظ جالندھری کی "جنگ و آہنگ" ہے جو کبھی روزنامہ "جنگ" کراچی کے صفحات کی زینت بنتی رہی تھی۔ دیکھیے، یہ کتابیں کب منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی ہیں۔

نامور ادیب اور شاعر جناب جلیل قدوائی بھی ایک مدت سے اپنی سرگزشتِ حیات "حیاتِ مستعار" ترتیب دے رہے ہیں۔ خدا کرے کہ وہ اِسے جلد ہی منظرِ عام پر لانے میں کامیاب ہو جائیں۔ ("حیاتِ مستعار" کا ایک مختصر حصہ حال ہی میں شائع ہو گیا ہے)

"مراحلِ حیات"

ایک بہت ہی عجیب و غریب اور نہایت ہی دل چسپ کتاب "مراحلِ حیات" کا ذکر ابھی باقی ہے جس کی ترتیب و تدوین میں میرے اشتیاق، میرے اصرار اور میرے جذبات کا دخل ہے۔ یہ ضخیم کتاب میرے محترم مشفق مولانا حکیم محمد عبداللہ صاحب مالک دواخانہ سلیمانی جہانیاں ضلع ملتان کی ساٹھ سالہ زندگی کے متعدد واقعات، گوناگوں حادثات اور بوقلموں مشاہدات سے عبارت ہے۔ اس کتاب کا مسودہ کوئی پچیس تیس برسوں سے غیر مطبوعہ حالت میں پڑا ہوا ہے۔ حکیم صاحب کی زندگی میں مَیں نے بڑی کوشش کی کہ یہ کتاب شائع ہو جائے، مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ حکیم صاحب کے صاحب زادے جناب عبدالوحید صاحب سلیمانی ایک تعلیم یافتہ اور علم دوست انسان اور ایک تجربہ کار ناشر بھی ہیں، لیکن وہ بے چارے اپنے والدِ مرحوم کی اس یادگار آپ بیتی کو اس لیے اب تک شائع نہ کر سکے کہ فیصل آباد کے ایک صاحب اس کتاب کا مسودہ دبائے بیٹھے ہیں اور کوششِ بسیار کے باوجود اسے واپس کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ ایسے حالات میں سوائے افسوس کے اور کیا، کیا جا سکتا ہے۔

کتابیں اور قید خانے

قید خانوں میں اور قید خانوں پر تحریر کی جانے والی کتابیں"

مغل بادشاہ شاہجہاں کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ جب اُن کے بیٹے اورنگ زیب نے اُنھیں اختیاراتِ شاہی سے محروم کر کے آگرہ کے قلعے میں نظر بند کر دیا تو اُنھوں نے اس قیدِ تنہائی سے تنگ آ کر اورنگ زیب کو کہلا بھیجا کہ وہ اُن کے لیے چند طلبہ کا انتظام کر دے جن کی تعلیم و تدریس میں منہمک ہو کر وہ اپنے لمحاتِ فرصت آرام و عافیت سے گزار سکیں۔ یہ واقعہ خدا جانے کہاں تک صحیح ہے، تاہم یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ قید خانوں کی دُنیا ایک نہایت ہی محدود اور باہر کی دُنیا سے ایک بالکل ہی مختلف جگہ ہے جہاں انسان ایک معینہ مدت تک اپنے شب و روز گزارنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اُس کے پاس وقت اس قدر بے پناہ ہوتا ہے کہ وہ کاٹے نہیں کٹتا۔ فرصت کے اِن لمحاتِ فراواں کو بسر کرنے کے لیے اگرچہ مختلف اصحاب نے مختلف دلچسپیوں اور مشاغل کا سہارا لیا تاہم کتابوں نے قید خانوں کے گھٹے گھٹے ماحول کو نہ صرف سکون و اطمینان بخشا، بلکہ اُنھوں نے ڈستی ہوئی اِن تنہائیوں میں رفاقت کا پورا پورا حق بھی ادا کیا۔ ادیبوں شاعروں اور دوسرے اہلِ قلم حضرات نے جن میں ہمارے مذہبی اور سیاسی رہنما بھی شامل ہیں قید خانوں میں قیام کے دوران میں بڑے اہم اور بلند پایہ تخلیقی کارنامے انجام دیے، بلکہ یہاں اس امر کا اظہار کرنا غالباً مبالغہ نہ ہوگا کہ اگر یہ حضرات قید خانوں میں تشریف نہ لاتے تو اُن کی بعض علمی اور ادبی کاوشیں کبھی عالمِ وجود میں نہ آتیں اور خاص طور پر وہ کتابیں تو کبھی نہ لکھی جاتیں جو آج زندان و سلاسل کے موضوع پر ہمارے ادب کا

ایک وقیع، دل چسپ اور عبرت خیز حصّہ ہیں۔

بہادر شاہ ظفر قید خانے میں

۱۸۵۷ء کا جہادِ آزادی انگریزوں کی فتح اور مسلمانوں کی شکست پر منتج ہوا آخری مسلمان بادشاہ بہادر شاہ ظفر گرفتار کر لیے گئے اور انھیں دِلّی سے سیکڑوں میل دُور رنگون کے ایک غیر معروف مقام پر نظر بند کر دیا گیا۔ بادشاہ کا مقدر دیکھیے کہ محلات کے اِس مکین کو قسمت گھیر کر کہاں لائی۔ غم زدہ بادشاہ نے اپنی زندگی کے آخری پانچ برس قیدِ فرنگ میں اس مقام پر گزارے۔ اِن پانچ برسوں میں بادشاہ پر کیا گزری کون سی مصیبت انھوں نے یہاں نہیں جھیلی اور کون سا دُکھ انھوں نے یہاں نہیں اٹھایا۔ غالب کا یہ شعر جیسے اُن ہی کے لیے کہا گیا تھا ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

بہر حال تاریخ اس معاملے میں بالکل خاموش ہے۔ انگریز حکمرانوں نے تاریخ کے اس دَور پر اتنے دبیز اور تاریک پردے ڈال دیے ہیں کہ اب اس موضوع پر کوئی بھی محققانہ کاوش کام یاب ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ رنگون کے اِس قید خانے میں حسرت و یاس کے عالم میں اس شاعر بادشاہ نے جو غزلیں کہیں وہ اُس کے دوسرے کلام سے بالکل مختلف اور اپنے رنگ میں منفرد ہیں، بلکہ اُن میں سے بعض تو سراسر الہامی کیفیت کی حامل نظر آتی ہیں۔ بادشاہ کے مقطعے ؎

اتنا ہے بدنصیب ظفرؔ دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ مِلی کوئے یار میں

پسِ مرگ قبر پہ اے ظفرؔ، کوئی فاتحہ بھی کہاں پڑھے
وہ جو ٹوٹی قبر کا تھا نشاں اُسے ٹھوکروں نے مٹا دیا

اسی کیفیت کی خاص مثالیں ہیں اور اسی قسم کی دوسری غزلیں اسی قید خانے

کی یادگار ہیں اور یہ ایسا کلام ہے جو اُردو زبان کی شاعری میں زندہ و پائندہ رہے گا۔
خدا جانے یہ حقیقت ہے یا افسانہ، بہرحال کہا جاتا ہے کہ اس زنداں میں بادشاہ
کو قرطاس و قلم کی سہولتیں بھی میسر نہ تھیں اور کلامِ ظفر کا کافی حصہ اُن کے اِنتقال کے
بعد اس زنداں کی دیواروں پر کوئلے سے لکھا ہوا ملا تھا۔

علامہ فضلِ حق خیر آبادی اور "باغی ہندوستان"

۱۸۵۷ء کے اس ہنگامہ دار و گیر میں جن متعدد علما نے انگریزوں کے خلاف
جہاد کے فتوے پر دستخط کیے تھے، علامہ فضلِ حق خیر آبادی اُن میں سرِ فہرست تھے بلکہ
یہ فتویٰ مرتب ہی اُن کے قلم سے ہوا تھا، چناں چہ اُن پر بجرمِ بغاوت مقدمہ چلا
اور اُنھیں کالے پانی کی سزا ملی۔ علامہ فضلِ حق خیر آبادی نے کالے پانی میں "ثورۃ الہند"
کے زیرِ عنوان عربی زبان میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی داستان قلم بند کی۔ اس کتاب
کا ترجمہ "باغی ہندستان" ۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے بعد ہوا۔ مترجم عبدالشاہد خاں شیروانی
تھے اور اُس کا دیباچہ مولانا ابوالکلام آزاد کے قلم سے تھا۔

مجاہدینِ تحریکِ آزادی سے علی گڑھ کالج تک

۱۸۵۷ء میں اگرچہ انگریزوں نے برِصغیر کی حکومت پر قبضہ کر لیا تھا، تاہم رہنمایانِ
تحریکِ آزادی نے جن میں مولانا احمد اللہ شاہ، جنرل عظیم اللہ خاں، ملکہ حضرت محل، شہزادہ
فیروز شاہ، مولانا محمد جعفر تھانیسری، مولوی یحییٰ علی صادق پوری اور ڈاکٹر وزیر خاں خاص
طور پر شامل تھے، انگریزی حکومت کو چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ انگریزوں نے تحریکِ آزادی
کے رہنماؤں پر جبر و تشدد اور ظلم و تعدی کی اِنتہا کر دی، لیکن پھر بھی اس تحریک کو پوری
طرح دبانے میں کئی سال لگ گئے۔ متعدد علمائے کرام اور تحریکِ آزادی کے دوسرے
قائدین شہید کر دیے گئے۔ بعض کو کالے پانی کی سزا ملی، کچھ جلاوطن ہو گئے اور کچھ کو
حوالۂ زنداں کر دیا گیا۔ غرض اس پورے دور میں مسلمان من حیث القوم انگریزوں کے

انتقام کا نشانہ بنے رہے۔

بہرحال وقت گزرتا گیا۔ انگریزی حکومت کی جڑیں مضبوط ہوتی گئیں اور آخر کار وہ وقت آ گیا کہ سرسید کے علی گڑھ کالج میں تحریکِ آزادی کے مستقبل کے رہنماؤں نے جنم لیا اور ایک مرتبہ پھر وہ انگریزی حکومت کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑے ہو گئے۔ ہمارے ان علَم بردارانِ آزادی میں مولانا حسرت موہانی سرِ فہرست تھے۔

مولانا حسرت موہانی اور "قیدِ فرنگ"

مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی سیاسی اُفق پر اُس زمانے (۱۹۰۷ء) میں جلوہ گر ہوئے جب انگریزی عروج واقبال کا آفتاب اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ چمک رہا تھا۔ گاندھی جی جنوبی افریقہ میں وکالت کر رہے تھے۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی، دونوں بھائی ریاست بڑودہ کے محکمۂ افیون میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ مولانا ظفر علی خاں حیدرآباد دکن میں اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری کی کرسی سنبھالے ہوئے تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد اخبار "وکیل" امرتسر کی مسندِ ادارت کو زیب دے رہے تھے۔ مولانا حسرت موہانی "ہر امزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا" کے مصداق زمانۂ طالب علمی ہی میں "محمڈن اینگلو اورینٹل کالج" علی گڑھ کے انگریز پرنسپل سے ٹکرا چکے تھے اور تین مرتبہ اپنے آزادانہ خیالات کی بنا پر کالج سے نکالے جا چکے تھے۔

مولانا حسرت موہانی بلاشبہ وہ مردِ مجاہد ہیں جنھیں اس صدی کے مسلمان رہنماؤں میں سب سے پہلے جیل جانے کا شرف حاصل ہوا۔ اس زمانے میں قید خانوں میں درجہ بندیاں نہ تھیں اور اخلاقی اور سیاسی قیدیوں میں کوئی امتیاز روا نہ رکھا جاتا تھا، بلکہ بسا اوقات سیاسی قیدیوں سے اخلاقی قیدیوں کی نسبت کہیں زیادہ مشقت لی جاتی تھی، کیونکہ حکومتِ وقت کے "باغیوں" کے ساتھ کسی رعایت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ مولانا حسرت موہانی کا "جرم" اُن کے ماہنامے "اُردوئے معلیٰ" علی گڑھ میں اُس مقالے کی اشاعت تھی جس کا عنوان "مصر میں انگریزوں کی پالیسی" تھا۔ یہ مقالہ مولانا حسرت کے قلم سے نہ تھا۔ کس کے قلم کی

تنقیق تھا اس پر آج تک پردہ پڑا ہوا ہے۔ مولانا حسرت نے مضمون نگار کا نام نہ اُس وقت حکومت کو بتایا اور نہ بعد میں کسی اور کو، بلکہ اُس کی اشاعت کی تمام تر ذمے داری اپنے سر لے لی۔ چناں چہ اُن پر مقدمہ چلا اور ۲ دو سال قید بامشقت اور پانچ سو روپے جرمانے کی سزا ملی۔ یہ ۱۹۰۸ء کا قصہ ہے۔ انھیں الٰہ آباد جیل میں رکھا گیا اور وہ کوئی سال بھر روزانہ ایک من آٹا پیستے رہے۔ مولانا حسرت موہانی کا یہ شعر اُن کے اس زمانے کے احساسات کا بہترین ترجمان ہے ؎

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اِک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

اُن کی اسی غزل کا ایک اور شعر ہے ؎

جو چاہے سزا دے لو، تم اور بھی کھُل کھیلو
پر ہم سے قسم لے لو، کی ہو جو شکایت بھی

مولانا اپنے ایک اور شعر میں فرماتے ہیں ؎

کٹ گیا قید میں ماہِ رمضاں بھی حسرت
گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

اسی طرح اُن کی "کلیات" میں متعدد نظمیں اور غزلیں ایسی ملتی ہیں، جو اُنھوں نے مختلف جیلوں میں رہتے ہوئے کہی تھیں۔

مولانا محمد علی اور کلامِ جوہرؔ

ستمبر ۱۹۲۱ء میں مولانا محمد علی جوہر مع مولانا شوکت علی، مولانا حسین احمد مدنی، پیر غلام مجدد سندھی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، اور مولانا نثار احمد کان پوری گرفتار کر لیے گئے۔ انگریزی حکومت کی نظر میں اُن کا جُرم یہ تھا کہ اُنھوں نے ۹ جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی خلافت کانفرنس میں بہ حیثیت صدر باغیانہ تقریر کی تھی اور اس اجتماع میں اُنھوں نے یہ قرارداد منظور کروائی تھی کہ ہر مسلمان پر انگریزی فوج میں اس وقت نوکر رہنا،

بھرتی ہونا یا اس میں دوسروں کو بھرتی کرانا شرعاً حرام ہے اور مسلمانوں کا بالعموم اور علما کا بالخصوص یہ فرض ہے کہ اس باب میں شریعت کے احکام فوج کے مسلمان ملازموں تک پہنچائیں۔ چناں چہ ان تمام اصحاب کو گرفتار کر لیا گیا اور انھیں کراچی سنٹرل جیل میں رکھا گیا۔ مولانا محمد علی نے اسی جیل کی ایک کوٹھڑی میں بیٹھ کر اپنے خلاف جملہ الزامات کا تحریری جواب تیار کیا تھا۔ اس مقدمے میں مولانا محمد علی اور اُن کے رفقا کو دو دو سال قید کی سزائیں دی گئیں جن کی بازگشت پورے ملک میں

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی
ہم تو جانتے ہیں دو دو برس کو

کی صورت میں سنائی دی۔ مقدمے کا فیصلہ ہونے کے بعد مولانا محمد علی بیجا پور جیل تبدیل کر دیے گئے۔ "کلامِ جوہر" کا کافی حصہ اور اُن کی مشہور نعتیہ نظم

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں اُن سے خلوت میں ملاقاتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت،
اِک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

اسی جیل میں لکھی گئی تھی۔ اسی جیل میں قیام کے دوران میں اُنھوں نے تُرکی کی فتح کی خبریں سُنیں تو وہ گنگنا اُٹھے ؎

عالم میں آج دھوم ہے فتحِ مُبین کی
سُن لی خدا نے قیدیٔ گوشہ نشین کی

انھی ایام میں اُن کی صاحب زادی آمنہ بیگم بعارضۂ دِق صاحبِ فراش ہوئیں تو باپ کی زبان سے نکلا ؎

مَیں ہوں مجبور، پر اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے مَیں دور سہی، وہ تو مگر دور نہیں
اِمتحاں سخت سہی، پر دلِ مومن ہی وہ کیا
جو ہر اِک حال میں اُمّید سے معمور نہیں

مولانا جوہر کی یہ پوری نظم بڑی درد انگیز اور جاں گداز ہے اور اُردو شاعری میں بلا مبالغہ اپنی مثال آپ ہے بیجاپور جیل ہی میں مولانا محمد علی نے اپنا ایک اور کارنامہ بھی انجام دیا اور وہ اُن کی خودنوشت سوانح حیات MY LIFE : A FRAG- MENT کی ترتیب و تسوید ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور قول فیصل

علی برادران اور اُن کے جلیل القدر رفقا کی گرفتاری کا ردِّ عمل کلکتے میں مسلمانوں کے ایک عظیم الشّان جلسے کے انعقاد کی شکل میں ہوا۔ اِس اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمایا کہ جس قرار داد کی بِنا پر علی برادران گرفتار کیے گئے ہیں، وہ اسلام کا ایک مشہور و معروف مسئلہ ہے اور ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اس کا اعلان کرے۔ وہ ریزولیوشن دراصل میرا ہی تیار کیا ہوا تھا اور میری ہی صدارت میں سب سے پہلے اسی کلکتے کے ٹاؤن ہال میں منظور ہوا تھا۔ مَیں اُس سے بھی تفصیل اور صفائی کے ساتھ اس وقت اس کے مضمون کا اِعلان کرتا ہوں۔ یہ سی آئی۔ ڈی کے رپورٹر بیٹھے ہیں اور مَیں انھیں کہتا ہوں کہ حرف بہ حرف قلم بند کریں۔ اگر یہ جُرم ہے تو گورنمنٹ کو یاد رکھنا چاہیے کہ اس کا ارتکاب ہمیشہ جاری رہے گا۔" اس تقریر کے مًعا بعد مولانا آزاد کو گرفتار کر لیا گیا اور انھیں علی پور (کلکتہ) جیل میں رکھا گیا۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ایڈیٹر اخبار "آزاد ہند" کلکتہ بھی اسی جیل میں مولانا آزاد کے ساتھ تھے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے اصرار پر مولانا آزاد نے اپنے حالات اپنے سِن ولادت ۱۸۸۸ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک ملیح آبادی صاحب کو تحریر کروا دیے۔ اس طرح کہ مولانا آزاد بولتے جاتے تھے اور ملیح آبادی صاحب لکھتے جاتے تھے اور یوں کتاب "ابوالکلام کی کہانی خود اُن کی زبانی" کا مسودہ اس جیل میں عالم وجود میں آ گیا۔ اپنے مقدمے کے سِلسلے میں اُنھوں نے انگریزی عدالت میں ایسا معرکہ آرا اور ولولہ انگیز بیان دیا کہ انگریز جج اُن کی بے باکی اور جراَتِ ایمانی پر حیران و ششدر رہ گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے اس بیان پر مشتمل

کتاب "قولِ فیصل" یقیناً ایک ایمان افروز اور زندۂ جاوید کتاب ہے اور مولانا آزاد نے اپنا یہ مکمل بیان علی پور جیل ہی میں مرتب کیا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور "غبارِ خاطر"

۱۹۴۲ء میں انڈین نیشنل کانگرس کی تحریک "ہندوستان چھوڑ دو" کے سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد کو جب وہ انڈین نیشنل کانگرس کے صدر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے کانگرس کی مجلسِ عاملہ کے دوسرے ارکان کے ہمراہ گرفتار کرکے احمد نگر جیل بھیج دیا گیا۔ یہی وہ جیل ہے جہاں رہتے ہوئے مولانا آزاد نے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے نام اپنے وہ مشہور و معروف خطوط تحریر فرمائے جو بعد ازاں "غبارِ خاطر" اور "کاروانِ خیال" کی شکل میں اشاعت پزیر ہوئے۔ میری تحقیق کے مطابق مولانا ابوالکلام آزاد کی شہرۂ آفاق "تفسیر ترجمان القرآن" کے بعض اجزا بھی مختلف جیلوں میں ہی لکھے گئے تھے۔

چودھری افضل حق: "زندگی" اور "محبوبِ خدا"

مجلسِ احرارِ اسلام کے رہنما چودھری افضل حق کی بلند پایہ کتاب "زندگی" گورکھپور جیل میں اُن کے ایامِ اسیری کی یادگار ہے۔ اس کتاب کو قبولیتِ عامّہ کا جو شرف حاصل ہوا اُس سے سب ہی واقف ہیں۔ "زندگی" غالباً ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ اس سال پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی نے جن کتابوں کو انعام سے نوازا "زندگی" اُن میں سرِ فہرست تھی اور اُس پر پیش کردہ انعام کی رقم مبلغ پانچ صد روپیہ تھی۔ چودھری افضل حق مرحوم کی دوسری مشہور کتاب "محبوبِ خدا" ہے جو حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلّم کی سیرتِ مبارکہ ہے اور اُسے اُردو زبان کی کتبِ سیرت میں خاص مرتبہ حاصل ہے۔ چودھری صاحب کی یہ کتاب ملتان اور راولپنڈی کی جیلوں میں مرتب ہوئی تھی۔

مولانا ظفر علی خاں اور اُن کے مجموعہ ہائے کلام

مولانا ظفر علی خاں نے تمام زندگی غیر ملکی سامراج کے خلاف عَلمِ جہاد بلند رکھا۔ اُنھوں نے اِس "جرم" کی پاداش میں سال ہا سال قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، لیکن انگریزی حکومت کے سامنے اپنا سَر خم نہ کیا۔ مولانا ظفر علی خاں آتش بیاں خطیب اور فقید المثال صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ممتاز شاعر بھی تھے۔ مولانا بدیہہ گوئی کے بادشاہ تھے اور حُقّے کے کش کے ساتھ ساتھ شعر کہتے تھے۔ اُن کے مجموعہ ہائے کلام "بہارستان" "نگارستان" اور "چمنستان" کی بہت سی نظمیں پسِ دیوارِ زنداں ہی کہی گئی تھیں، بلکہ اُن کے ایک اور مجموعۂ کلام "حبسیات" کی تو تمام کی تمام نظمیں منٹگمری جیل اور لاہور سنٹرل جیل میں قیام کی ہی مرہونِ منّت ہیں۔ منٹگمری جیل میں اُنھوں نے کچھ مضامین کا اُردو میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ یہ مضامین اُن کے ایامِ اسیری ہی میں جیل سے برآمد ہوئے اور "زمیندار" میں "نقّاش" کے قلمی نام سے چھپے تھے۔

گاندھی جی اور "تلاشِ حق"

گاندھی جی کی خود نوشت سوانحِ حیات STORY OF MY EXPERIMENTS WITH TRUTH کا ایک بڑا حصّہ یرودا جیل میں مکمل ہوا جہاں گاندھی جی اپنے ایامِ اسیری گزار رہے تھے۔ اُن کی اس انگریزی کتاب کا اُردو ترجمہ بعد ازاں جامعہ مِلّیہ اسلامیہ دِلّی کے پروفیسر سیّد عابد حُسین نے "تلاشِ حق" کے زیرِ عنوان دو جلدوں میں کیا اور مکتبۂ جامعہ نے اُسے شائع کیا تھا۔

پنڈت جواہر لال نہرو: "میری کہانی" اور "تلاشِ ہند"

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی زندگی کا ایک حِصّہ قید و بند کی حالت میں گزارا تھا۔ قید خانوں میں لمحاتِ فرصت بسر کرنے کے لیے اُن کے مشاغل میں سے ایک مشغلۂ تصنیف و تالیف بھی تھا۔ چناں چہ اُن کی آپ بیتی "میری کہانی" کی ابتدا ڈیرہ دون جیل میں ہوئی۔

اُن کی دوسری کتاب "تاریخ عالم کی جھلکیاں" جو اُن کی صاحب زادی اندرا کے نام اُن کے خطوط پر مشتمل ہے، نینی، بریلی اور ڈیرہ دون کی جیلوں میں قیام کے دوران میں لکھی گئی تھی۔ اُنھوں نے اپنی ایک اور کتاب "تلاشِ ہند" قلعۂ احمد نگر کے جیل خانے میں اپریل ۱۹۴۴ء میں لکھنی شروع کی اور کوئی چھے ماہ بعد اسی سال ستمبر کے مہینے میں اُنھوں نے اس کتاب کا مسودہ مکمل کر لیا۔

ڈاکٹر سیّد محمود اور "ارمغانِ آلام"

بھارت کے سابق نائب وزیر خارجہ ڈاکٹر سیّد محمود بھی مولانا آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کے ہمراہ احمد نگر جیل میں مقیم تھے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم سیاست داں ہونے کے ساتھ ساتھ شعر و سخن کا اعلا ذوق رکھتے تھے۔ اُنھوں نے اس قید خانے میں عربی، فارسی، اُردو اور ہندی کے اپنے پسندیدہ اشعار کا ایک اِنتخاب مرتب کیا تھا جو اُن کی رہائی کے بعد "ارمغانِ آلام" کے نام سے شائع ہوا تھا۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد اور "اپنی کہانی"

ڈاکٹر راجندر پرشاد سابق صدر بھارت ۹ر اگست ۱۹۴۲ء سے لے کر ۱۴ر جون ۱۹۴۵ء تک بانکی پور (پٹنہ) جیل میں رہے۔ اس جیل میں اُنھوں نے تحریکِ پاکستان کا خاص طور پر مطالعہ کیا اور اس تحریک پر جو کتابیں بھی اُن کو دست یاب ہو سکتی تھیں، اُنھوں نے جیل کی چار دیواری میں اپنے لیے فراہم کیں۔ دراصل وہ تحریکِ پاکستان کے متعلق اپنے زاویۂ نگاہ سے ایک محققانہ کتاب لکھنے کی فکر میں تھے۔ اُن کی یہ کتاب جو بعد ازاں شائع ہوئی INDIA DIVIDED تھی جس میں اُنھوں نے ہندو مسلم مسئلے کا مسلمانوں کی آمد سے لے کر دورِ حاضرہ تک کے طویل عرصے کا جائزہ لیا تھا۔ کوئی شک نہیں کہ اُنھوں نے اس مسئلے پر لاتعداد حوالوں کی زبان میں بات چیت کی ہے، لیکن انڈین نیشنل کانگرس کے اس ممتاز رہنما سے یہ توقع رکھنا عبث تھا کہ اُس کے قلم سے کوئی

لفظ مسلمانانِ ہند کی اس عظیم تحریک کی تائید و موافقت میں نکلے گا۔ INDIA DIVIDED کا مسوّدہ مکمل کرنے کے بعد انھوں نے اسی جیل میں اپنی آپ بیتی "اپنی کہانی" جسے وہ انگریزی زبان میں لکھ رہے تھے کا ایک بڑا حصّہ بھی قلم بند کیا تھا۔

مسز وجے لکشمی پنڈت: "میری ڈائری"

پنڈت جواہر لال نہرو کی ہمشیرہ مسز وجے لکشمی پنڈت کو بھی "ہندستان چھوڑ دو" تحریک کے دوران میں گرفتار کیا گیا تھا۔ انھوں نے اپنی اسیری کا زمانہ ۱۲/ اگست ۱۹۴۲ء تا ۱۱/ جون ۱۹۴۳ء نینی (الٰہ آباد) جیل میں گزارا۔ اس جیل میں اُن کے ایامِ اسیری کیسے بسر ہوئے، اُن کی ہلکی پھلکی رُوداد اُنھوں نے اپنی کتاب MY DIARY میں تحریر کی تھی۔ اس کتاب کا اُردو ترجمہ "میری ڈائری" قیامِ پاکستان سے کافی عرصے پہلے لاہور سے شائع ہوا تھا جس کے مترجم راجندر نام کے کوئی صاحب تھے۔ اُنھوں نے اپنی کتاب کے ایک مقام پر جیل خانے کی چائے کا ذکر کرتے ہوئے بڑے مزے سے لکھا تھا کہ "میرا چائے کا تجربہ بڑا متنوع ہے۔ میں نے میڈم چیانگ کائی شک کی بھیجی ہوئی اعلا درجے کی خوشبودار چائے سے لے کر اس شربت جیسی دو غلی چائے کا استعمال بھی کیا ہے جو انتخابات کے دوران میں نگلنی پڑتی ہے، لیکن جیل کی چائے ایسی کوئی چائے میں نے نہ دیکھی ہے، نہ پی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کوئی خاص قسم کی اور مہلک چائے ہے جو ہمارے بد نصیب قیدیوں کے لیے کاشت کی جاتی ہے۔ اگر میں جیل خانے کے افسران کو جیل کے راشن پر ایک ہفتہ گزارا کرنے پر مجبور کرسکوں تو مجھے بڑا لطف آئے۔"

فیض اور "دستِ صبا"

فیض احمد فیض کے دوسرے مجموعۂ کلام "دستِ صبا" کی اکثر و بیش تر غزلیں اور نظمیں حیدر آباد سنٹرل جیل میں کہی گئی تھیں جہاں وہ راولپنڈی سازش کیس کے ایک ملزم کی حیثیت سے زمانۂ اسارت گزار رہے تھے۔ اُن کے تیسرے مجموعۂ کلام "زنداں نامہ"

کا تمام کا تمام شعری اثاثہ منٹگمری جیل اور لاہور سنٹرل جیل میں اُن کے قیام کا نتیجہ ہے۔

مولانا مودودی: اُن کی چند تصانیف

اکتوبر ۱۹۴۸ء میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی پنجاب سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کیے گئے۔ مولانا مرحوم نے دو سال کے قریب ایامِ اسیری ملتان کے نیو سنٹرل جیل میں بسر کیے۔ انھوں نے اس عرصے میں نہ صرف اپنی تفسیر "تفہیم القرآن" جلد اوّل و دوم اور اپنی دوسری تصانیف "تفہیمات" جلد دوم "رسائل و مسائل" اسلام میں مرتد کی سزا" اور "نشری تقاریر" پر نظرِ ثانی کی، بلکہ "مسئلہ ملکیتِ زمین" اور "سود" جلد دوم کے مسودات بھی پایۂ تکمیل کو پہنچائے۔ جماعتِ اسلامی کے اُس دور کے ایک دوسرے رہنما مولانا امین احسن اصلاحی نے بھی اسی جیل میں اپنی دو کتابیں "پاکستانی عورت دوراہے پر" اور "دعوتِ دین اور اُس کا طریقِ کار" مرتب کیں۔

شعرا اور قید خانے

احمد ندیم قاسمی کے مجموعہ ہائے کلام "شعلۂ گل" اور "دشتِ وفا" کی بعض غزلیں، کوثر نیازی کے مجموعۂ کلام "زرِ گل" اور نعیم صدیقی کے "شعلۂ خیال" کی تمام کی تمام غزلیں اور نظمیں قیامِ زنداں ہی کا شاخسانہ ہیں، بلکہ نعیم صدیقی نے تو کتاب "شعلۂ خیال" کا سرِ عنوان ہی اپنے اس شعر کو قرار دیا ہے:

آخر ہے کس کے بس میں مرا شعلۂ خیال
سنگین و آہنی مرا زنداں ہوا کرے

مولانا ابوالکلام آزاد: جیل کے معمولات

مشاہیرِ ملک اور عمائدینِ قوم کے مشاغل قید خانوں کی آہنی سلاخوں کے پیچھے کس نوعیت کے تھے اور اُن میں کتابوں کو کیا اہمیت اور فوقیت حاصل تھی، اُن کا سرسری

جائزہ لینے کے لیے ہمیں چند واقعات کا سہارا بھی لینا پڑے گا۔ حافظ علی بہادر خاں ایڈیٹر 'دورِ جدید' دِلّی مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق اپنے مضمون میں تحریر فرماتے ہیں کہ نینی سنٹرل جیل الہ آباد کے حبس بارک میں مولانا آزاد کو قید کیا گیا تھا وہاں حُسنِ اتفاق سے مجھے مولانا کی دن رات کی معیت نصیب ہوگئی تھی۔ مولانا کا معمول تھا کہ مَیں اور وہ چار بجے صبح اُٹھتے، مولانا اپنے ہاتھ سے چائے تیار کرتے اور پینے کے لیے مجھے ضرور بلاتے۔ دو دو کپ پی کر ہم الگ ہوجاتے اور اپنا اپنا مطالعہ شروع کر دیتے۔ مولانا صبح سے شام تک صرف انگریزی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے، البتہ صبح کے چار بجے 'ترجمان القرآن' کا فائل لے بیٹھتے اور اُس کے بعض مسائل پر غور کرتے تھے۔ اِس کے بعد اُن کے مطالعے میں والٹیئر، روسو، نطشے، گوئٹے اور متعدد سیاسی لیڈروں کے سوانح حیات رہتے تھے۔ جیل کی زندگی میں مولانا کے تبصرے، لطیفے اور پند و نصائح سُننے کے متعدد مواقع ملتے تھے۔ دو وقت کھانے کی میز پر، ایک وقت ناشتے کے ساتھ اور ایک بار شام کو پانچ بجے کی چائے پر، علاوہ بریں جب اخبارات پڑھ چکتے تھے تو اُس روز کی خبروں پر بھی رائے زنی ہوتی تھی۔ پھر شام کو ہم لوگ بیڈمنٹن کھیلتے اور مولانا کوئی کتاب لے کر برآمدے میں آ بیٹھتے اور کھلاڑیوں کو داد دیتے۔ اس وقت کبھی شطرنج بھی جم جاتی تھی۔

میانوالی جیل: پُرلطف محفلیں

مولانا عبدالمجید سالک ۱۹۲۲ء میں تحریکِ خلافت کے سلسلے میں میانوالی جیل میں اسیر تھے۔ اس جیل میں نہ صرف وہ، بلکہ مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا اختر علی خاں، مولانا داؤد غزنوی، مولوی لقاء اللہ پانی پتی، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولوی عبدالعزیز انصاری بھی مقید تھے۔ سالک صاحب مولانا احمد سعید کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ ایک بلند پایہ عالمِ دین اور شیوہ بیان خطیب ہونے کے باوجود ہم لوگوں میں بیٹھ کر دن بھر لطیفہ بازی کیا کرتے تھے، بلکہ جب ہم لوگ رات کو وقت گزاری

اور تفریح کے لیے قوّالی کرتے تو مولانا اس مجلس میں صدر کی حیثیت سے متمکّن ہوتے۔
مولانا داؤد غزنوی اور مولوی عبدالعزیز انصاری بعض اوقات حال کھیلتے کھیلتے مولانا
کی تو ند پر جا پڑتے، مولانا ہنستے بھی جاتے اور بُرا بھلا بھی کہتے جاتے۔ ایک دفعہ ہم نے
مولانا کو ایک گیت سُنانے پر مجبور کر دیا۔ مولانا نے بڑے مزے لے کر گایا۔ یہاں ہماری
زندگی کا ایک خاص انداز شروع ہوا۔ مَیں نے اور عبدالعزیز انصاری صاحب نے مولانا
احمد سعید سے عربی صَرف و نحو، ادب اور منطق کا سبق لینا شروع کیا۔ ایک آدھ گھنٹے پڑھ
لیتے، پھر ایک دو گھنٹے آموختہ دوہراتے اور اُردو سے عربی میں ترجمہ کر کے مولانا کو
دکھلاتے۔ مولانا کا اندازِ تدریس اگرچہ وہی اساتذۂ قدیم کا سا تھا، لیکن وہ اس میں خلوص
دل آویزی پیدا کر دیتے تھے جس میں بیزاری اور ناگواری کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا اور
ہم لوگ بے تکان پڑھتے چلے جاتے تھے۔

اکابرینِ جماعتِ اسلامی: جیل کی زندگی

جماعتِ اسلامی پاکستان کے سابق امیر میاں طفیل محمد نے جو اکتوبر ۱۹۴۸ء میں قیّم
جماعتِ اسلامی کی حیثیت سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی کے
ساتھ گرفتار ہوئے تھے، کوئی بیس ماہ کا عرصہ نیو سنٹرل جیل ملتان میں گزارا۔ اُن کا معمول یہ
تھا کہ علی الصبح نمازِ فجر ادا کرتے اور جیل کے احاطے میں چہل قدمی اور ورزش کرتے۔ غسل اور
ناشتے کے بعد مولانا مودودی سے کم و بیش ایک گھنٹے قرآن مجید پڑھتے اور پھر دوپہر تک
قرآن مجید کے حواشی نوٹ کرتے اور اگلے سبق کی تیاری کرتے۔ اُس وقت مولانا مودودی
اور مولانا اصلاحی اپنے مطالعے میں مصروف رہتے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد نمازِ ظہر
اور پھر اخبارات اور عام مطالعہ ہوتا جس کا سلسلہ کافی عرصے رہتا۔ عصر کے بعد چائے کا
شغل ہوتا۔ مغرب کی نماز کے بعد کھانا کھاتے اور اُس کے بعد تبادلۂ خیالات اور مسائل
حاضرہ پر گفتگو اور تبصرہ ہوتا۔ پھر عشا کی نماز پڑھ کر سو جاتے۔ ایک اور مقام پر انھوں
نے لکھا کہ ہمارے وارڈ میں ایک بہت بڑی تعداد جنگلی کبوتروں کی بھی آباد تھی۔ مولانا

اصلاحی نے ان کبوتروں کو پالنا شروع کر دیا۔ جتنی دال ہمیں ملتی، اُس کا بڑا حصّہ مولانا اصلاحی اپنے کبوتروں کو کھلا دیتے، لیکن ہمارے نزدیک وہ سلویٰ کے حکم میں تھے اِس لیے ہم نے اُن کو پکڑ پکڑ کر کھانا شروع کر دیا۔ چناں چہ ۵۰-۱۹۴۹ء کی سردیوں میں کم ہی کوئی ہفتہ ایسا گزرا ہوگا جس میں ہم کم سے کم ایک مرتبہ کبوتر پلاؤ نہ کھاتے ہوں۔ مولانا اصلاحی پکڑنے میں تو ہماری مدد نہ کرتے، البتہ پلاؤ خوب شوق سے کھاتے تھے۔ جیل میں ہمارے دوسرے مشاغل پھولوں اور خربوزوں کی کاشت تھے۔ اس کے علاوہ اپنے وارڈ کے باغیچے میں اور اُس کے باہر ہم نے چودہ درخت بھی لگائے جو ہماری رہائی تک خاصے پرورش پا چکے تھے۔

قید و بند کا موضوع: چند اہم کتابیں

اُردو ادب میں زندان و سلاسل کے موضوع پر کتابوں کی تعداد چنداں حوصلہ افزا نہیں، تاہم قید و بند کی یہ داستانیں نہ صرف دل کش اور پُر لطف ہیں، بلکہ اپنے دامن میں سامانِ عبرت بھی سمیٹے ہوتے ہیں۔ "کالا پانی" اس موضوع پر پہلی کتاب ہے جسے مولانا محمد جعفر تھانیسری نے ۱۸۸۵ء کے لگ بھگ قیدِ فرنگ سے رہائی کے بعد تحریر فرمایا تھا۔ محترم مصنّف اُس جنگ آزادی کے اہم کردار ہیں جو فرنگی اقتدار کے خلاف پوری ایک صدی لڑی گئی۔ اُنھوں نے اس کتاب میں انگریز کے جبر و استبداد کی ایک ایسی ناقابلِ فراموش اور زندۂ جاوید داستان بیان کی ہے جسے پڑھ کر ایک طرف فرنگی حاکموں کے ظلم و ستم کا صحیح اندازہ ہوتا ہے تو دوسری طرف مجاہدینِ حریت کی مظلومیت، بے کسی، ایثار اور اعلا کردار کے صحیح نقش و نگار سامنے آجاتے ہیں۔ "کالا پانی" نام کی ایک دوسری کتاب مشہور ہندو مہا سبھائی لیڈر بھائی پرمانند کے قلم سے بھی ہے جس میں اُنھوں نے جزیرہ انڈمان میں اپنی قید و بند کے حالات سے پردہ اُٹھایا ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے ۱۹۰۸ء میں الٰہ آباد جیل میں جو کچھ وارداتیں اُن پر گزریں اُنھیں اپنی رہائی کے بعد "مشاہداتِ زنداں" کی صورت میں لکھا تھا۔ "مشاہداتِ زنداں" کا ایک نیا

ایڈیشن کافی طویل عرصے کے بعد "قیدِ فرنگ" کے نام سے کراچی سے شائع ہوا تھا جس میں مولانا حسرت کی شخصیت پر مولانا سید سلیمان ندوی کا مضمون بھی شامل تھا۔ مشہور سیاسی تحریک "ریشمی رومال" کی صدائے بازگشت ۱۹۱۵ء میں سرزمینِ حجاز میں سُنی گئی۔ جہاں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی بہ ارادۂ حج مقیم تھے۔ شریفِ مکہ نے شیخ الہند کو گرفتار کر کے انگریزوں کی خواہش کے مطابق اُن کے حوالے کر دیا اور وہ اُنھیں جزیرۂ مالٹا لے گئے۔ وہاں اُنھیں جن مصائب و آلام سے گزرنا پڑا اُن کے ذکر سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس دورِ ابتلا میں شیخ الہند کے ہمراہ اُن کے شاگرد مولانا حسین احمد مدنی بھی تھے جنھوں نے "سفرنامۂ اسیرِ مالٹا" کے عنوان سے اس روح فرسا اور جاں گداز داستان کو رقم کیا۔

زعیم الاحرار چودھری افضل حق نے اپنی آپ بیتی "میرا افسانہ" میں جہاں اپنی زندگی کے دل چسپ اور پُرلطف واقعات کا ذکر کیا ہے وہاں اُن کے جیل خانے کے متعلق تاثرات ناقابلِ فراموش حد تک عبرت ناک ہیں۔ اُن کی دوسری کتاب "دُنیا میں دوزخ" کا تعلق بھی اسی دُنیا سے ہے جسے جیل خانہ کہتے ہیں۔ ممتاز صحافی اور طنز نگار ابراہیم جلیس کے ایام اسیری جو اُنھوں نے قیامِ پاکستان کے اوائل میں کراچی سنٹرل جیل میں گزارے کی رُوداد "جیل کے دن اور جیل کی راتیں" جیل کی زندگی اور وہاں کے ماحول پر بھرپور اور جاندار تبصرہ ہے۔ حمید اختر کی "کال کوٹھڑی" اور عنایت اللہ کی "اُس بستی میں" پسِ دیوارِ زنداں کے مشاہدات و واردات کی بہترین عکاس ہیں۔ ریاض الرحمٰن ساغر نے "سرکاری مہمان خانہ" میں جرم و سزا کا ایک نئے زاویے سے جائزہ لیا ہے، اگرچہ اندازِ بیاں بہت شوخ ہو کر رہ گیا ہے۔ مجلسِ احرارِ اسلام کے جلسوں کو اپنے کلام سے گرمانے والے جانباز مرزا نے بھی اپنی آپ بیتی "آتش کدہ" میں قید و بند کی صعوبتوں کا ذکر کیا ہے۔ مجلسِ احرارِ اسلام کے شعلہ بار خطیب آغا شورش کاشمیری کا شمار جنگِ آزادی کے اُن جیالوں میں ہوتا ہے۔ جنھیں انگریزی حکومت نے عمر کے مختلف اَدوار میں مدتوں محبوس رکھا۔ اُن کی آپ بیتی "پسِ دیوارِ زنداں" بلاشبہ ایک وقیع اور باوقار کتاب ہے جسے پوری دل چسپی کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے۔ پیر محمد قاسم شاہ (گدی پیر سرحدی) کی مختصر سی کتاب "سرگزشتِ زنداں" بھی اس موضوع پر خاصا جاذب

توجہ مواد فراہم کرتی ہے۔ "مکاتیبِ زنداں" میں میاں طفیل محمد سابق قیم جماعت اسلامی کا مضمون "گرفتاری سے رہائی تک" جیسانی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ پروفیسر خورشید احمد کی کتاب "تذکرۂ زنداں" زندان و سلاسل کے موضوع پر ایک دل چسپ اور پُرلطف کاوش ہے مصنف کا تعلق جماعتِ اسلامی سے ہے اور وہ اس جماعت کے اُن اہم رہنماؤں میں شامل تھے جنھیں جنوری ۱۹۶۴ء میں جماعت کے غیر قانونی قرار دیے جانے پر حوالۂ زنداں کر دیا گیا تھا۔ ادبی رسائل میں مطبوعہ مضامین میں م۔ش کا "میری جیل یاترا"، احمد ندیم قاسمی کا "زندان و سلاسل" اور "مہر بہ لب" اور نعیم صدیقی کی "جیل کی ڈائری" کو ہر لحاظ سے دل کش اور دل آویز کہنا چاہیے۔

یہ تو تھیں وہ کتابیں اور مضامین جن کا تعلق ہمارے ملک کی مختلف جیلوں اور قید خانوں سے ہے۔ اب ایک انوکھی کتاب "قید یاغستان" کے متعلق سُنیے جس میں لاہور کے میاں محمد اکرم اور اُن کے ایک ہندو رفیق نے حبسِ بیجا کی ایک ایسی دل دوز اور بھیانک کہانی دُہرائی ہے جسے پڑھ کر انسان کا دل دہل جاتا ہے۔ میاں محمد اکرم اور اُن کے ساتھی کو ۱۹۱۰ء میں قبائلی ہتوں سے اغوا کر کے یاغستان لے گئے تھے اور وہاں اُنھیں قید کر ڈالا تھا۔ اِس قیدِ ستم سے اُنھوں نے کیسے راہِ فرار اختیار کی اور کن کن مصائب اور دشواریوں کے بعد وہ صوبۂ سرحد میں داخل ہوئے، اِن تمام واقعات نے اس کتاب کو ایک لرزہ خیز اور دہشت ناک داستان میں تبدیل کر دیا ہے۔

قید خانے اور مجموعہ ہائے خطوط

قید خانوں سے تحریر کیے جانے والے خطوط و مکاتیب کے جو مجموعے بعد ازاں مرتب ہو کر منظرِ عام پر آئے اُن میں "غبارِ خاطر" اور "کاروانِ خیال" (مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط) "مکاتیبِ زنداں" (مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی اور میاں طفیل محمد کے خطوط) "نقشِ زنداں" (کامریڈ سجاد ظہیر کے خطوط) "نقشِ زنداں"

(مولانا محمد علی سیالکوٹی کے خطوط) اور "لمعاتِ زنداں" (جماعت اسلامی کے ایک رہنما خرم جاہ مراد کے خطوط) شامل ہیں۔ اِن کے علاوہ پروفیسر محمد سرور نے مولانا محمد علی کے جیل سے تحریر کیے ہوئے خطوط کا ایک مجموعہ "مکاتیب محمد علی" مرتب کر کے شائع کیا تھا۔

تاریخِ جرم و سزا

تاریخِ جرم و سزا کے موضوع پر جانباز مرزا کی کتاب "بڑھتا ہے ذوقِ جرم" شائع ہو چکی ہے جسے زیادہ سے زیادہ ایک مبتدی کی کاوش قرار دیا جانا چاہیے، وگرنہ مولانا امداد صابری کی کتاب "تاریخ جرم و سزا" ہی ایک ایسی کتاب ہے جسے اس موضوع پر حرفِ آخر کا مرتبہ حاصل ہے۔

جلوہ ہائے رنگ رنگ

اردو سفر نامے : ایک جائزہ

بیٹھ کر سیرِ دو جہاں کرنا
یہ تماشا کتاب میں دیکھا

سفر خوب ہے، لیکن سیرِ دو جہاں کے تماشے سے پوری طرح کیف اندوز ہونے کے لیے لازم ہے کہ زیرِ نظر کتاب ایک سفر نامہ ہو۔ سفر نامے میں جہاں ہمیں ایک دل کش ناول کا سا لطف محسوس ہوتا ہے وہاں اس کی اہمیت اور افادیت ایک ناول پر کہیں مستزاد ہیں۔ سفر نامے میں ہمیں نہ صرف نت نئے تجربات اور گوناگوں مشاہدات سے سابقہ پڑتا ہے، بلکہ اُس کے اوراق ہمیں مختلف ممالک اور اقوام کے عروج و ترقی کی رفتار، اُن کے خصائص و خصائل، تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت، رسم و رواج، علم و دانش اور دیگر اہم اور ضروری کوائف سے بھی روشناس کراتے ہیں جن کے روشن رُخ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں خوش گوار انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔

اُردو ادب میں سفر نامے کے عنوان پر شائع ہونے والی کتابوں کی تعداد اگرچہ امید افزا نہیں تاہم ہر سال کچھ نہ کچھ سفر نامے منظرِ عام پر آ ہی جاتے ہیں، چند اچھے سفر نامے جن کے مطالعے کا مجھے اتفاق ہوا یہ ہیں :

سفر نامہ حکیم ناصر خسرو، سفر نامہ ابنِ بطوطہ، سفر نامہ ابنِ جُبیر، سفر نامہ یوسف کمبل پوش، مسافرانِ لندن (سر سید احمد خان) سفیرِ اودھ (مولوی مسیح الدین خان) کالاپانی (مولانا محمد جعفر تھانیسری) سفر نامہ یورپ (مولوی محبوب عالم) سفر نامہ حجاز (مرزا حیرت دہلوی)، سفر نامہ حجاز، مصر و شام (خواجہ حسن نظامی)، سفر نامہ پاکستان (خواجہ حسن نظامی)

سفرنامہ روم مصر و شام (علامہ شبلی)، سفرنامہ حجاز (نواب سلطان جہاں بیگم)، سبیل الرشاد (قاضی محمد سلیمان منصور پوری)، صراط الحمید (پروفیسر الیاس برنی)، سفر سعادت (منشی امیر احمد علوی)، دیارِ عرب میں (مولانا مسعود عالم ندوی)، سفرنامہ بلادِ اسلامیہ (نواب بہادر یار جنگ)، کاروانِ حجاز (مولانا ماہر القادری)، دو ہفتے ترکی میں (مولانا ابو الحسن علی ندوی)، شرقِ اوسط میں کیا دیکھا (مولانا ابو الحسن علی ندوی)، سفرِ حجاز (مولانا عبدالماجد دریابادی)، پردیس کی باتیں (مرزا حسین احمد بیگ)، لندن سے آداب عرض (آغا محمد اشرف) دیس سے باہر (آغا محمد اشرف)، مسافر کی ڈائری (خواجہ احمد عباس)، سفر نصیب (مختار مسعود)، نقشِ فرنگ (قاضی عبدالغفار)، ساحل و سمندر (پروفیسر احتشام حسین)، بریدِ فرنگ (سید سلیمان ندوی)، مقامِ خلافت (سر شیخ عبدالقادر) لینن گراڈ یا سمرقند (عشرت علی صدیقی) مشاہداتِ کابل و یاغستان (مولانا محمد علی قصوری) دِلّی کا پھیرا (ملا واحدی)، نقوش و تاثرات (مفتی محمد شفیع) اندرونِ ہند (خالدہ ادیب خانم)، طوفان سے ساحل تک (علامہ محمد اسد)، سفرنامہ یورپ و امریکا (نواب لیاقت جنگ)، یورپ میں چار ہفتے (شورش کاشمیری) دو مسافر دو ملک (حکیم مسعود احمد برکاتی)، ارضِ پاک سے دیارِ فرنگ تک (عبادت بریلوی)، سفرنامہ ارض القرآن (مولانا محمد عاصم)، سات سمندر پار (بیگم اختر ریاض) دھنک پر قدم (بیگم اختر ریاض)، عروسِ نیل (سلطانہ آصف فیضی)، سفرنامہ بغداد (مولوی محبوب عالم)، سیاحت فتح خانی (نواب فتح علی خاں قزلباش)، سیاحت نامہ برنیئر (ڈاکٹر برنیئر)، یورپ نامہ (حکیم محمد سعید)، جرمنی نامہ (حکیم محمد سعید)، سوئیٹزرلینڈ میں میرے شب و روز (حکیم محمد سعید)، ماہ و روز (حکیم محمد سعید) ایک مسافر چار ملک (حکیم محمد سعید)، شب و روز (حکیم محمد سعید)، کوریا کہانی (حکیم محمد سعید)، ماہِ سعید (حکیم محمد سعید)، حریم دیدہ و دل (محمد عارف)، دجلہ (شفیق الرحمن)، زہے روانیٔ عمرے کہ در سفر گزرد (مختار الدین احمد)، اے آبِ رودِ گنگا (رفیق ڈوگر)، ہندیاترا (ممتاز مفتی)، لبیک (ممتاز مفتی)، زمین اور فلک اور (انتظار حسین)، دنیا مرے آگے (جمیل الدین عالی)، تماشا مرے آگے (جمیل الدین عالی) گردش میں پاؤں (فخر زماں)

پیرس ۲۰۵ کلومیٹر (اختر ممونکا)، گوشۂ وطن بریں (مسعود سلطان)، دیکھ لیا ایران (افضل حسین علوی)، راہِ راست (بشریٰ رحمن)، اجنبی اپنے دیس میں (سید شوکت علی شاہ)، ترچی وادی وادی گھوموں (ظہیر قریشی)، موسموں کا عکس (جمیل زبیری)، دید و باز دید (فرمان فتح پوری) سفرنامۂ ایران (اسعد گیلانی) انقلابِ ایران (ارشاد احمد حقانی)، زیتون کے سائے (جلال الدین احمد صدیقی)، نور کی ندیاں (احمد خاں درانی)، سفرِ حجاز (مولانا غلام رسول مہر) دیکھا ہندوستان (حسن رضوی)، خوابوں کے جزیرے (پروین عاطف)، زمان و مکان اور بھی ہیں (حمزہ فاروقی)، آج بھی اُس دیس میں (حمزہ فاروقی)، سفر آشوب (حمزہ فاروقی) سیاحت نامہ (سیادت بریلوی)، خوابِ سفر (منیر فاطمی) گرد بار (منیر فاطمی)، نیل سے فرات تک (محمد اقبال انصاری)، بھارت یاترا (حنیف چودھری)، کرن تتلی اور بگولے (پروین عاطف)، سیاحت نامہ (ماہر القادری)، سُفتیں کیسی (بلقیس ظفر)، میرے بھی سفرنامے (نجم افتخار راجا) دی یاترا (ابنِ کلیم)، مجُو ۔ جج ڈاکٹرائے. آر خالد) اور سیاحتِ ملبدی (مولانا عبدالماجد دریا بادی)

سرزمینِ مقدس کا ایک مختصر مگر دل آویز سفرنامہ

اب ہم ان میں سے بعض سفرناموں کے دلچسپ مقامات پیش کرتے ہیں۔ سفرناموں کی اس باغ و بہار محفل میں ہم سب سے پہلے تبرکاً جناب محمد اشفاق انعام الٰہی کے تاثراتِ سفرِ حجاز "حرم کعبہ نیا، بُت بھی نئے، تم بھی نئے" کا تعارف کراتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "سترہ سال کے طویل وقفے کے بعد حرمین میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی اور وہاں کے انوار و تجلیات کی دنیا میں چند روز گزارنے کا موقع ملا۔ تقریباً بارہ سال سے حرمین کی توسیع کا کام جاری ہے۔ مدینہ منورہ میں مسجدِ نبوی اور حرم کی نئی توسیع بڑی حد تک مکمل ہو چکی ہے۔ مکہ معظمہ میں حرم شریف میں کام ابھی تک جاری ہے اور تقریباً چھے سات سال تک مزید جاری رہے گا۔ توسیع حقیقت میں شاندار ہے اور نہ صرف وقت کی ضروریات سے مطابقت رکھتی ہے، بلکہ اپنی شان و شوکت کے لحاظ سے بھی بڑی پُرشکوہ ہے۔ یہ تمام کام مرحوم شاہ ابنِ سعود اور اُن کے فرزندان ذی وقار شاہ سعود مرحوم، خصوصاً شاہ فیصل شہید کی قوتِ عمل اور خدمتِ حرمین کے جذبے کا بہت عمدہ مظہر ہیں۔ کہتے ہیں کہ جو

مکانات اور بازار اس عظیم الشان توسیع کے لیے خالی کرائے گئے اور حکومت نے جن پر قبضہ کیا اُن کا معاوضہ اس قدر فراخ دلی سے مالکان کو ادا کیا گیا ہے کہ بعض حالات میں ۵ ہزار ریال ایک ایک گز کے دے دیے گئے اور اس طرح لوگوں کو لاکھوں روپیہ معاوضہ ملا اور یہ اس قدر ملا کہ لوگ دعائیں کرنے لگے کہ کسی توسیع کے پروگرام میں اُن کی دکان یا مکان بھی آجائیں۔ دولت کی اس فراوانی کے باعث نئی نئی عمارتیں تمام مکہ معظمہ میں تعمیر ہو رہی ہیں جن میں کئی بارہ بارہ منزلہ ہیں، بلکہ اس سے بھی اُونچی ہیں۔ نئی تعمیر کا یہ سلسلہ جس طریقے سے جاری ہے ابھی برسوں تک جاری رہے گا۔ مدینہ منورہ میں بھی یہی صورتِ حال قائم ہے اور نئی بستیاں شہر کے باہر تعمیر ہوتی جا رہی ہیں۔ مدینہ منورہ میں حرم کے ہر طرف قیام خانے اور ہوٹل تعمیر ہو گئے ہیں جن کے باعث حرم میں حاضری اور نماز میں شمولیت انتہائی آسان ہو گئی ہے۔ مکہ معظمہ میں اس قسم کی عمارتیں حرم کے نزدیک ہونے کے باوجود یہ دُوری اور نزدیکی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اس لیے کہ یہاں "کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے" اور حرم کی توسیع کے بعد چوڑے چکلے بازار اور راستے دُوری اور نزدیکی کا مفہوم تبدیل کر چکے ہیں۔ اس صورتِ حال کو آسان بنانے کے لیے موٹروں کا ایک جمِ غفیر ہے جو معمولی معاوضے پر شہر کے کسی بھی حصے سے آپ کو حرم پہنچا دیتا ہے اور ایک ہی معاوضہ ہر جگہ اور ہر فاصلے کے لیے طلب کرتا ہے۔ حج کے لیے عرفات کو روانگی سے قبل اور واپسی پر منیٰ میں قیام ایک لازمی جز ہے اور تقریباً پانچ دن قیام منیٰ میں ضروری ہے۔ معمولی مکانات منیٰ میں ہمیشہ سے موجود تھے۔ اب نئی تعمیرات نے صورت یہاں بھی تبدیل کر دی ہے اور بعض عمارتیں اس قدر وسیع تیار ہوئی ہیں کہ ان کا کرایہ ہر سال تقریباً ڈیڑھ لاکھ ریال ہوتا ہے یعنی محض چار یا پانچ روز قیام کے لیے۔ اگرچہ ہماری حاضری حج کے کئی ماہ بعد ہوئی مگر حرمین میں لوگوں کا معقول ہجوم تھا۔ ہر ملک کے باشندے موجود تھے اور ہم نے دن رات کے کسی بھی حصے میں حرم میں حاضری دی تو لوگوں کو طواف و نماز میں مشغول پایا۔"

مدینہ منورہ کی حاضری بذریعہ موٹر ہوئی اس طرح بعض مقامات جیسے میدانِ بدر

دیکھنے اور ان کے قریب سے گزرنے کا موقع نصیب ہوا۔ مدینہ منورہ کے قریب کافی باغات ہیں اور کھجوروں کے بکثرت درخت ہیں اور بڑا ہی دل کش نظارہ پیش کرتے ہیں۔ حرم نبوی میں کافی توسیع ہوئی ہے اور بڑے خوب صورت انداز میں ہوئی ہے، لیکن مسجد نبوی کا حسن کچھ اور ہی چیز ہے۔ وہ حصہ جو روضۂ مبارک سے ملحق ہے اور جس میں ریاض الجنۃ والا ٹکڑا بھی شامل ہے وہاں لوگ ہمیشہ کی طرح جگہ لینے کے لئے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں مصروف نظر آتے۔ مسجد نبوی کے انوار سے معمور اور مدہوش کن ماحول میں کچھ اپنے متعلق غور کرنے اور اُس کے اظہار کا خیال تھا مگر روضۂ مبارک کی قربت کے بعد اندازہ ہوا کہ یہ اس قدر آسان کام نہ تھا کیسی حکایت، کن الفاظ میں اور کس منہ سے! نہ الفاظ ساتھ دیتے تھے نہ زبان حقیقت یہ ہے کہ اسی احساس کی شدت میں حاضری ہوئی اور ایک بے پناہ تشنگی میں واپسی۔

حرم کعبہ کا معاملہ کچھ اور ہی ہے۔ رات کی تاریکی تو اب نہیں، بجلی کی روشنی میں حرم کی طرف قدم اُٹھ رہے ہیں، موٹریں اس وقت بند ہو چکی ہیں اس خاموش ماحول میں اقبال کے "جواب شکوہ" کا یہ مصرعہ ذہن میں اُبھرا ؎

حرم کعبہ نیا بُت بھی نئے تم بھی نئے

رفیقِ سفر نے کہا "یہ کیا بات ہوئی کعبہ قدیم بھی ہے اور عظیم بھی" میں نے کہا غالباً اسی احساسِ قدیم اور عظیم کی شدت نے علامہ سے یہ شعر کہلوایا ہے، مگر اس وقت بہت سی نئی تبدیلیاں جو دُنیا میں رونما ہوئی ہیں اُن سے ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کا "وادیٔ غیرِ ذی زرع" میں بسایا ہوا یہ شہر بھی متاثر ہوا ہے۔ یہاں ریڈیو اسٹیشن ہیں، ٹیلے وژن ہیں، ریفریجریٹر ہیں، ایئر کنڈیشنڈ مکانات ہیں، اور ہزاروں دیگر اشیا جو ہماری ضروریات زندگی میں شامل ہوتی جا رہی ہیں، موجود ہیں۔ ان حالات کے پیشِ نظر میرے ذہن میں علامہ کا یہ مصرعہ آ گیا۔ بہر حال یہ ایک عارضی کیفیت تھی جو جلد ختم ہو گئی۔ دل مسجد حرام میں داخلے اور کعبے کی زیارت کے لئے بے چین تھا زبان دُعا میں مشغول تھی کہ اے اللہ اس گھر کی عزت اور بزرگی زیادہ کر۔ اللہ کا یہ گھر اور اُس کے انوار و تجلیات ان سب باتوں سے بے نیاز

ہیں۔ لوگ کہیں سے آئیں، کسی حال میں آئیں، اگر اُن کی حاضری رسول کریمؐ کی اطاعت کے تحت ہے، اگر مقصد وہی ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے اپنے کلامِ پاک میں دیا ہے اور جس کی عملی تعلیم اُس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے تو نتائج آج بھی وہی ہو سکتے ہیں جو ہمیشہ سے ہوتے آئے ہیں اور اگر یہ نہیں ہے تو ؎

اگر آلودۂ احرام غیری
ہمہ گر کعبہ باشی ننگ دیری

ارضِ مقدس کے دیہات میں

ارضِ مقدس کے سفرناموں میں ہمیں مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے اِس اسلامی مملکت کے بڑے بڑے شہروں مثلاً ریاض، جدہ، مکّہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی ایسی متعدد تصاویر دستیاب ہوتی ہیں جن میں اس سرزمین محترم کے تہذیبی، اخلاقی اور معاشرتی نقوش پوری طرح جلوہ گر ہوتے ہیں، لیکن شاذ ہی کبھی ایسے مواقع آئے کہ کسی مسلمان سیاح نے یہاں کے دیہات میں بھی جھانک کر دیکھا ہو اور دُنیا کو اُن کی جھلک دکھائی ہو۔ الحمدللہ کہ ہندوستان کے عربی زبان کے ایک ریسرچ اسکالر جناب عبداللہ عبّاس ندوی کو یہ توفیق نصیب ہوئی۔ وہ اِن دیہات میں پہنچے، مختلف الخیال لوگوں سے ملے اور اُن کے متعلق اپنے تاثرات یوں بیان کیے:

"میں یہاں لسانی تحقیقات LINGUISTIC RESEARCH کے سلسلے میں پندرہ روز رہا۔ میں نے بارہ مواضعات کا دَورہ کیا۔ یہاں کے ہفتہ واری بازار دیکھے۔ اُن کے چوپالوں میں گیا۔ مزارعین سے اُن کے کھیتوں میں جا کر ملا۔ اُونٹ اور بھیڑ چرانے والوں سے اُن کی وادیوں میں ملاقات ہوئی، مگر کسی کو کسی حال میں بھی نماز سے غافل نہیں پایا۔ ہر نماز اوّل وقت میں اور جماعت کی پابندی کے ساتھ۔ ایک دن موضع مندق پہنچا تو وہاں بازار کا دن تھا۔ بھیڑ، بکریاں، اونٹ، کپڑے، عبائیں، انگور، غلّہ، کھاد، چاندی کے زیور، زیتون کا تیل اور اسلحہ سب کچھ غیر منظم طریقے پر موجود تھے جیسا کہ دیہاتی

بازاروں میں ہر جگہ ہوتا ہے۔ ایک ٹیلے پر سے دیکھا تو بازار کی تنگ سڑک آدمیوں اور جانوروں سے بھری نظر آتی۔ سر ہی سر نظر آرہے تھے۔ اتنے میں ظہر کی اذان ہوئی اور مجمع اس طرح پھٹ گیا جیسے سوائے سامان اور جانوروں کے یہاں کوئی بنی آدم آباد ہی نہ تھا۔ مکہ مکرمہ میں تو آپ کو شاذ و نادر ہی کوئی عرب ایسا نظر آئے گا جس کے چہرے پر ڈاڑھی ہو، لیکن یہاں اس کے برعکس شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جو بغیر ڈاڑھی کے نظر آئے اور اگر مل بھی گیا تو وہ شہر سے آیا ہو گا یا کسی سرکاری دفتر میں متعین ہو گا۔ عورت تو بڑی چیز ہے کسی کم سن لڑکی کی ایک انگلی بھی بے پردہ کہیں نظر نہیں آئے گی۔ یہ بات نہیں کہ عورتیں باہر نہ نکلتی ہوں۔ وہ گھر کے کام دھندوں کے علاوہ مشکوں میں پانی بھر کر لاتی ہیں۔ اپنے محرموں کا ہاتھ بٹانے کے لیے کھیتوں میں موجود رہتی ہیں، مگر گہرے پردے کے ساتھ۔ کئی سال ہوئے ایک مصری مدرس نے کسی عورت کی طرف بری نگاہ ڈالی تھی تو اس کو اس عورت نے اپنی دستی بندوق سے ہلاک کر دیا تھا۔"

بچوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق عباس صاحب نے لکھا تھا کہ "مجھے بلجرشی میں ایک سرکاری مدرسے کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جماعتوں میں جا کر اندازِ تعلیم اور دفتروں میں آکر نصابِ تعلیم کو دیکھا۔ دینی مضامین کے علاوہ جغرافیہ، الجبرا، حساب اور تاریخ کے مضامین بھی تھے اور اُن کے ساتھ دو مضامین نئے بھی دیکھے اور وہ نشانہ بازی اور شہسواری تھے۔ لوگوں نے بتایا کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کا نشانہ بالکل صحیح ہوتا ہے اور شہسواری میں طلبا کافی دل چسپی لیتے ہیں۔ میں نے درجہ پنجم کے ایک طالب علم سے پوچھا کہ "تم ورزش کرتے ہو؟" اُس نے "ہاں" میں جواب دیا۔ پوچھا "فٹ بال کھیلتے ہو؟" اُس نے کہا کہ "فٹ بال کے لیے ہمارے ہاں زمین موزوں نہیں دوسرے یہ کھیل غیروں کا ہے۔ ہمارا کھیل نشانہ بازی اور شہسواری ہے۔" اس جواب سے دل بہت خوش ہوا اور میں نے اساتذہ کو دل کھول کر داد دی۔"

ایران کے سفر کی ایک جھلک[4]*

سید اصغر تبیین جنھوں نے آر۔سی۔ڈی R.C.D. سے منسلک ہو کر ایران میں

اپنی زندگی کے کچھ لمحات گزارے ہیں سرزمینِ حافظ و خیّام کے بارے میں اپنے احساسات کا اظہار اِن الفاظ میں کرتے ہیں: "ایران کا دارالخلافہ تہران مشرقی ممالک کا شہر معلوم نہیں ہوتا" بلکہ یورپین ملکوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہاں کی عمارتیں، لوگوں کی شکلیں، لباس چال ڈھال، وضع قطع، غرض ہر چیز یورپین ہے۔ آداب فرانسیسی ہیں۔ زبان میں اکثر الفاظ بھی فرانسیسی کے رائج ہیں۔ خوراک بھی انگریزی طرز کی استعمال کرتے ہیں۔ جگہ جگہ سینڈوچ کی دکانیں ہیں جن پر اکثر عورتوں اور مردوں کا جمگھٹا رہتا ہے۔ ان لوگوں نے اپنی موسیقی کی طرز بھی بدل دی ہے۔ صرف ایک چیز پر سختی سے پابندی ہے اور وہ جدید فارسی زبان ہے۔ تمام دفاتر میں فارسی ہی لکھی اور بولی جاتی ہے۔ کاروبار میں بھی اس کا استعمال ہے یہاں تعطیل جمعے کو ہوتی ہے۔ یہاں کے لوگ عہدِ قدیم سے قدرتی مناظر کے پرستار ہیں۔ موسیقی سے بھی خاص لگاؤ ہے۔ قدرت نے اُنھیں حُسن صحت اور دولت سے فراوانی کے ساتھ نوازا ہے۔ عورت مرد مساوی طور پر محنت کرتے ہیں اور کام کے اوقات میں بے کار باتیں نہیں کرتے۔ ضابطے اور قاعدے کی پابندی ان کے مزاج میں رچ گئی ہے۔ بسوں میں سوار ہونے کے لیے قطاریں لگتی ہیں۔ ایک دفعہ مَیں بس کے انتظار میں کھڑا تھا کہ ایک ضعیفہ بھی میرے پاس آ کھڑی ہوئی۔ جب بس آئی تو مَیں نے چاہا کہ ضعیفہ مجھ سے پہلے بس میں سوار ہو جائے لیکن وہ نہ مانی اور جب تک مَیں اپنی باری کے مطابق بس میں سوار نہ ہو گیا وہ نہ چڑھی۔ پاکستانیوں کے متعلق یہاں کے لوگوں میں محبت کے بے پناہ جذبات ہیں۔ ایک دن میں ہوٹل میں کھانا کھانے کے لیے گیا تو اس کے منیجر نے میرے وطن کے متعلق دریافت کیا۔ پاکستان سے میرے تعلق کو سُن کر وہ بے حد خوش ہوا۔ اور فرطِ مسرت میں ایک سالم مرغی کا سُوپ مجھے پیش کیا۔ جب مَیں نے پیسے دینے چاہے تو لینے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ آپ میرے مہمان ہیں۔ تہران میں گرمی لاہور اور کراچی سے بہت کم ہے۔ رات کو کافی خنکی ہو جاتی ہے۔ یہ شہر کوئٹے کی طرح ہے۔ ویسا ہی موسم ہے، البتہ دن کے وقت سخت دھوپ ہو جاتی ہے۔ یہاں کپڑوں کی دُھلائی بہت مہنگی ہے۔ ایک معمولی قمیص کی دُھلائی ڈیڑھ رُپیہ ہے ویسے یہاں کپڑے دھونے میں بہت آسانی ہے۔ بیسن BASIN میں آسانی سے دُھل

جاتے ہیں۔ اِستری موجود ہے، وہ کر لیتے ہیں۔ ایران کا سکہ ریال ہے۔ ایک ریال سے دس ریال تک سکے چلتے ہیں۔ اس سے زیادہ مقدار کے لیے نوٹ جاری کیے ہوئے ہیں۔ مثلاً سَو ریال ۵۰۰ ریال وغیرہ۔ سرکاری طور پر ایک ریال پاکستانی ایک آنے یا چھے اعشاری سکے کے برابر ہے۔

علامہ اقبال کے مشاہداتِ سفر

۱۹۰۵ء میں حضرت علامہ اقبال نے انگلستان میں اعلا تعلیم حاصل کرنے کے لیے رختِ سفر باندھا۔ اس سفر کے حالات اگرچہ اُنھوں نے ایک مستقل سفرنامے کی صورت میں تو قلم بند نہیں کیے۔ تاہم انھوں نے دورانِ سفر اپنے مختلف احباب کو خطوط ضرور لکھے جن میں انھوں نے بڑے دل چسپ انداز میں اُنھیں اپنے مشاہداتِ سفر سے روشناس کرایا۔ اپنے اس سفر کی ابتدا میں اُنھوں نے ایک طویل خط بحری جہاز سے اپنے ایک دوست مولوی انشاء اللہ خاں مدیر "وطن" لاہور کو لکھا۔ انھوں نے اپنے اس خط میں لکھا کہ "عدن میں قدیم ایرانی بادشاہوں کے بنائے ہوئے تالاب موجود ہیں اور یہ اس طرح بنائے گئے ہیں کہ ایک دفعہ کی بارش کا تمام پانی ہر جگہ سے ڈھل کر ان میں جا گرتا ہے۔ چوں کہ ملک خشک ہے اس واسطے ایسی تعمیر کی سخت ضرورت تھی۔ مَیں بوجہ گرمی کے اور نیز قرنطینہ کے عدن میں سیر نہ کر سکا اور انجینیری کے اس حیرت ناک کرشمے کو نہ دیکھ سکا۔ جب ہم سویز پہنچے تو مسلمان دکان داروں کی ایک کثیر تعداد ہمارے جہاز پر آموجود ہوئی اور ایک قسم کا بازار تختۂ جہاز پر لگ گیا۔ اِن لوگوں کی فطرت میں میلانِ تجارت مرکوز ہے اور کیوں نہ ہو۔ ان ہی کے آباو اجداد تھے جن کے ہاتھوں میں کبھی یورپ اور ایشیا کی تجارت تھی۔ سلیمان اعظم بھی ان ہی میں ایک شہنشاہ تھا جس کی وسعتِ تجارت نے اقوامِ یورپ کو ڈرا کر اُن کو ہندوستان کی ایک نئی راہ دریافت کرنے کی تحریک کی تھی۔ کوئی پھل بیچتا ہے۔ کوئی پھول بیچتا ہے۔ کوئی پوسٹ کارڈ دکھاتا ہے۔ کوئی مصر کے پُرانے بُت فروخت کرتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ یہ ذرا سائیٹ اٹھارہ ہزار برس پہلے کا ہے۔ غرض کہ یہ لوگ گاہکوں کو قید کر لیتے ہیں اور کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔ انھی لوگوں میں ایک شعبدہ باز بھی ہے جو ایک مُرغی کا بچہ

ہاتھ میں لیے ہے اور کسی نامعلوم ترکیب سے ایک کے دو بنا کر دکھاتا ہے۔ ایک نوجوان مصری دکان دار سے مَیں نے سگریٹ خریدنے چاہے۔ باتوں باتوں میں مَیں نے اس سے کہا کہ مَیں مسلمان ہوں مگر چوں کہ میرے سر پر انگریزی ٹوپی تھی، اُس نے ماننے میں تامّل کیا اور مجھ سے کہا کہ تم ہیٹ کیوں پہنتے ہو۔ مَیں نے اُسے جواب دیا کہ کیا ہیٹ پہننے سے اسلام رخصت ہو جاتا ہے۔ کہنے لگا کہ اگر مسلمان کی ڈاڑھی منڈی ہوئی ہو تو اُسے ترکی ٹوپی پہننی چاہیے ورنہ پھر اسلام کی علامت کیا ہو گی۔ بات واقعی معقول تھی۔ خیر آخر یہ شخص میرے اسلام کا قائل ہوا اور چوں کہ حافظِ قرآن تھا اس واسطے مَیں نے چند آیات قرآن شریف کی پڑھیں تو نہایت خوش ہوا۔ میرے ہاتھ چومنے لگا۔ اور تمام دکان داروں سے مجھ کو ملوا دیا۔ وہ سب میرے گرد حلقہ باندھ کر "ماشاء اللہ" "ماشاء اللہ" کہنے لگے اور میری غرض سفر معلوم کر کے دعائیں دینے لگے یا یوں کہئے کہ دو چار منٹ کے لیے وہ تجارت کی پستی سے اُبھر کر اسلامی اخوت کی بلندی پر جا پہنچے۔ تھوڑی دیر کے بعد مصری نوجوانوں کا ایک نہایت خوب صورت گروہ جہاز کی سیر کے لیے آیا۔ مَیں نے جب نظر اُٹھا کر دیکھا تو اُن کے چہرے اس قدر مانوس معلوم ہوتے تھے کہ مجھے ایک لمحے کے لیے علی گڑھ کالج کے ڈیپوٹیشن کا شبہ ہوا۔ یہ لوگ جہاز کے ایک کنارے پر کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ مَیں بھی دخل در معقولات کرتا ہوا اُن میں جا گھسا۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ان میں سے ایک نوجوان ایسی خوب صورت عربی بولتا تھا جیسے حریری کا کوئی مقام پڑھ رہا ہو۔ آخر ہمارا جہاز رخصت ہوا اور آہستہ آہستہ سوئز میں داخل ہوا۔ یہ نہر جسے ایک فرانسیسی انجینئر نے تعمیر کیا ہے دنیا کے عجائبات میں سے ہے۔ نہر کیا ہے عرب اور افریقہ کی جدائی ہے اور مشرق و مغرب کا اتحاد ہے۔ بعض بعض جگہ تو یہ نہر اتنی تنگ ہے کہ دو جہاز مشکل سے اس میں سے گزر سکتے ہیں اور کسی کسی جگہ ایسی بھی ہے کہ اگر کوئی غنیم چاہے کہ رات بھر میں اسے مٹی سے پُر کر دے تو آسانی سے کر سکتا ہے۔ سینکڑوں آدمی ہر وقت کام کرتے رہتے ہیں جب ٹھیک رہتی ہے اور اس بات کا ہمیشہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ دونوں جانب سے جو ریت ہوا سے اُڑ کر اس میں گرتی رہتی ہے اُس کی نکاسی کا انتظام ہوتا رہے۔ اس نہر سے گزرتے ہوتے ایک

دل فریب نظارہ بھی دیکھنے میں آیا اور وہ یہ کہ ہم نے ایک مصری جہاز گزرتے ہوئے دیکھا جو بالکل ہمارے پاس سے گزرا۔ اس پر تمام سپاہی ترکی ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے اور نہایت خوش الحانی سے ایک عربی غزل گاتے جا رہے تھے۔ یہ نظارہ ایسا پُر اثر تھا کہ اُس کی کیفیت اب تک دل پر باقی ہے۔''

مولانا مفتی محمد شفیع : سفرِ دیوبند

مفتی صاحب نے پاکستان میں قیام فرما ہونے کے تیرہ برس بعد نومبر ۱۹۶۰ء میں ہندوستان کا یہ سفر اپنے وطنِ سابق دیوبند اور تھانہ بھون جانے کے لیے اختیار کیا تھا۔ اُن کا سفر نامہ "نقوش و تاثرات" اُن کے اسی سفر کے مشاہدات پر مبنی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں سب سے پہلے اپنے محلّے کی اُس تاریخی مسجد میں پہنچا جو سلطان محمد تغلق کے زمانے کی بنائی ہوئی جامع مسجد ہے۔ مجھے کراچی کے قیام میں اس کا برابر خیال لگا رہتا تھا کہ میرے بعد کہیں وہ غیر آباد نہ ہو جائے کیوں کہ اس کا محلِ وقوع ہندوؤں کا محلّہ تھا۔ اس محلّے میں گو مسلمانوں کے بھی چند مکان تھے لیکن وہ اب پاکستان منتقل ہو چکے تھے۔ میں نے مولانا ظہور احمد کو اس کا متولّی بنا دیا تھا۔ مسجد میں جا کر بڑی خوشی ہوئی کہ اُس کا نظام اچھی طرح چل رہا تھا اور نمازیوں کی حاضری بھی غنیمت تھی۔ یہاں نماز ادا کی اور پھر عزیزوں سے ملاقات کے لیے شہر میں نکلا تو بہت سے اچھے خاصے پُر رونق مکانوں کو کھنڈر پایا۔ قہقہوں کی جگہ خاموشی دیکھی۔ بہت سے غیر آباد کھنڈروں پر شان دار محلّات بنے دیکھے اور اُن کی خاموش فضاؤں میں چہل پہل دیکھی۔ بچّوں کو جوان اور جوانوں کو بوڑھا پایا۔ اکثر اکابر جن کے دم سے دیوبند کی رونق تھی اپنے اصلی وطن پہنچ چکے تھے اور اُن کی جگہ ایک نئی مخلوق آباد تھی۔ پھر عزیزوں اور پڑوسیوں کے مکانوں پر پہنچا۔ گزرے ہوئے زمانے کے واقعات، اِن میں آنے جانے، چلنے پھرنے، اخلاص و ہمدردی، محبّت و عداوت، غرض ہزاروں واقعات کا سیلاب تھا جو اُمڈ آیا تھا۔ اب میرے سامنے اپنا جدّی مکان تھا جہاں بیوہ بہن مقیم تھیں، بیوہ بہن اپنے گزارے کی مشکلات میں مُبتلا، مکان کی مرمّت کون کرتا۔ کہیں سے گر رہا تھا، کہیں سے ٹوٹ رہا تھا۔ اس کو کھنڈر کی صورت میں دیکھا تو دل بھر آیا۔ پُرانے واقعات کا ایک طوفان

برپا ہوگیا۔ اس کے در و دیوار، رنج و راحت، عیش و آرام اور دُکھ سُکھ کے سیکڑوں قصے سنانے لگے۔ مگر اس وقت تک مواعظ و عبر کے جو واقعات سامنے آچکے تھے وہ ذریعۂ تسکین بن گئے۔ مَیں ایک گوشے میں بیٹھ گیا، کچھ دیر استغفار کیا اور اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگی۔

اس کے بعد اپنے بنائے ہوئے جدید مکان پر پہنچا جس میں اس وقت چھے ہندو خاندان آباد تھے۔ اُنھوں نے ازراہِ کرم میرے لیے گھر کا دروازہ کھول دیا اور مکان کے اندر آنے کی بخوشی اجازت دے دی۔ مَیں نے دیکھا کہ دروازے پر میرا کندہ کیا ہوا یہ شعر بدستور قائم تھا؂

دُنیا کا کچھ قیام نہ سمجھو، کرو خیال
اس گھر میں تم سے پہلے بھی کوئی مقیم تھا

معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے اس کی قدر کی۔ مَیں نے مکان کے اندر ایک پختہ چبوترا نماز کے لیے بنا رکھا تھا۔ اُنھوں نے اُس کا بھی احترام کیا۔ کہنے لگے کہ ہم اس پر صرف کھانے پینے کی چیزیں رکھتے ہیں اور اس کی بے ادبی نہیں کرتے۔ اس نئے مکان کی تعمیر اُسی سال مکمل ہوئی تھی جس سال ہجرت کی گئی تھی، تاہم اس میں جو دن گزرے تھے بڑے راحت و آرام کے گزرے تھے۔ اب اپنے اس محبوب مکان کو دوسرے کے قبضے میں دیکھا تو حضرت اکبر کا یہ شعر یاد آگیا؂

گردُوں کے ستم دیکھے اُجڑا ہوا گھر دیکھا
دیکھا تو نہ جاتا تھا ناچار، مگر دیکھا

اب میں قبرستان پہنچا اور سب سے پہلے والد ماجد مولانا محمد یٰسین کے مزار پر حاضر ہوا ان کا ایک جملہ جو اُنھوں نے مرضِ وفات میں فرمایا تھا' مَیں اُسے کبھی نہیں بھُولتا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ "شفیع! مرنے والوں کو بھُول تو جایا ہی کرتے ہیں، مگر اتنی بات کہتا ہوں کہ جلدی نہ بھُول جانا"۔ والد صاحب کا یہ جملہ خدا جانے کیا چیز تھی کہ آج پچیس سال کے بعد بھی یوں معلوم ہوتا ہے کہ اِسی وقت فرما رہے ہیں، سبحان اللہ!

مولوی محمد علی قصوری کا دلکش سفرنامہ

تحریکِ آزادی کے ممتاز رہنما مولوی محمد علی قصوری کیمبرج یونیورسٹی سے ریاضی میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد مسیح الملک حکیم اجمل خان، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبیداللہ سندھی کے مشورے سے ۱۹۱۵ء کے آغاز میں کابل روانہ ہو گئے تاکہ وہ وہاں قیام کر کے ہندستان کی آزادی کے سلسلے میں حکومتِ افغانستان کا تعاون حاصل کر سکیں۔ مولوی صاحب حبیبیہ کالج کابل میں پروفیسر مقرر ہوئے، لیکن انھیں اس ملک کی سیاسی فضا راس نہ آئی۔ چناں چہ یہاں سے فارغ ہو کر وہ باغستان چلے گئے اور ۱۹۱۸ء کے آخر میں ہندستان واپس آئے۔ اپنی کتاب "مشاہداتِ کابل و باغستان" میں وہ باغستان کے علاقے "سندھ کراہی" کے متعلق رقم طراز ہیں کہ یہ علاقہ نہایت خوب صورت ہے۔ میں نے دریائے رہائن کی وادی RHINE VALLEY واقع جرمنی کی سیاحت کی ہے، کشمیر کے اکثر حصے دیکھے ہیں، جنوبی فرانس کی سیرگاہوں کی بادیہ پیمائی کی ہے اور سوئٹزرلینڈ کے بہترین مناظر دیکھے ہیں، لیکن میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ قدرتی حُسن، نیچرل مناظر، آب و ہوا کی عمدگی، خودرو پھولوں کی خوش بُو اور مہک، سبزہ زار کی دل فریبی میں شاید ہی وہ اس علاقے کی ہم سری کر سکتے ہوں۔ میں اس علاقے کی دولت دیکھ کر حیران ہو گیا۔ افسوس اتنا بڑا اور خوب صورت علاقہ انسان کی غفلت سے ابھی تک یوں ہی پڑا ہے۔ میں نے وہاں ہزارہا قسم کی تیتریاں دیکھیں۔ سب سے بڑی تیتری کے پَر شاید بڑی انسانی ہتھیلی سے دُگنے ہوں گے اور سب سے چھوٹی تیتری جگنو سے کچھ بڑی ہوگی۔ ان کے رنگوں کا تنوع اور پروں کی خوب صورتی الفاظ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ کوئی سفید مخملی رنگ، کوئی قرمزی، کوئی بنفشی، کوئی زرد اور کوئی لاجوردی اور کسی میں مختلف رنگوں کا ایسا خوب صورت امتزاج کہ جی چاہتا تھا قدرتِ صانع پہ ہُوں نثار۔ بہترین کاغذی اخروٹ، خودرو بنفشہ اور عُناب اور بے شمار جڑی بوٹیاں وہاں پیدا ہوتی ہیں۔ میرے ہمراہی جو اس علاقے سے واقف تھے، کہتے تھے کہ ان جڑی بوٹیوں میں حیرت انگیز تاثرات ہیں۔ بعض کُنین کا بدل ہیں۔ بعض نونیے

ہیں اکسیر کا حکم رکھتی ہیں اور بعض ہیں اعادۂ شباب کی خاصیت ہے، یہاں تک کہ سفید بال بھی سیاہ ہو جاتے ہیں۔ مَیں نے وہاں پہاڑوں میں کوئلے کی موجودگی اور لوہے اور تانبے کی قیمتی دھاتوں کی موجودگی کے بھی آثار پائے۔ مَیں کوئی ماہرِ معدنیات نہیں ہوں، لیکن میرا خیال ہے کہ سندھ کی یہ وادی معدنی دولت سے مالا مال ہے اور ممکن ہے کہ وہاں ہمیں RADIO ACTIVE معدنیات بھی ملیں۔ سندھ کنڑی ہیں آبادی نہایت قلیل ہے۔ اور لوگ جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ اُن کی عورتیں بالعموم نہایت خوب صورت، دراز قد اور سفید فام ہوتی ہیں۔ یہی حال مردوں کا ہے۔ وہ بھی بہت خوش شکل، سڈول اور محنتی ہوتے ہیں۔ اِن لوگوں کی غذا صرف مکّی کی روٹی ہوتی ہے۔ وہ سالن یا دال سے قریباً ناآشنا ہیں۔ ہاں شہد کی مکھیاں، بکریاں اور بھینسیں اُن کے پالتو جانور ہیں جن کے دودھ، مکھن اور لسی کو وہ بہ کثرت استعمال کرتے ہیں۔ مکّی کی روٹی کو عموماً لسی کے ساتھ گھی سے چُپڑ کر کھانا اُن کی بہترین اور پُرتکلف غذا ہے۔ مکّی بہت میٹھی ہوتی ہے اور بُھٹا بھی ہمارے بُھٹّے سے قریباً دوگنا ہوتا ہے۔ یوں تو وہاں چکور، برفانی تیتر، برفانی چکور اور مرغ وغیرہ بہت ہوتے ہیں مگر اُن کو بھی وہ صرف آگ پر بھون کر کھا لیتے ہیں۔ ہنڈیا میں پکانے سے وہ قریباً ناآشنا ہیں۔ مکّی کی روٹی بھی وہ پتھروں پر سینک کر پکاتے ہیں کیوں کہ مَیں نے وہاں توا نہیں دیکھا۔ پتھر پر پکی ہوئی مکّی کی روٹی نہایت لذیذ ہوتی ہے۔ قصہ مختصر اُن کی زندگی بالکل بدویانہ ہے۔ سردی بہت سخت ہوتی ہے، یہاں تک کہ جون جولائی میں ہمیں پوستین اور لحاف کی ضرورت ہوتی تھی۔ اِن لوگوں میں جفاکشی کے باوجود وحشت اور بربریت نام کو نہیں۔ وہ بہت بُردبار، مہمان نواز اور صادق القول لوگ ہیں ابھی تک موجودہ تہذیب و تمدن کو اُن کے اخلاق بگاڑنے کا موقع نہیں ملا۔"

پروفیسر احتشام حسین کا ادبی سفرنامہ

پروفیسر احتشام حسین اُردو زبان کے مشہور نقاد ہیں، اُنھوں نے امریکا کے "راک فیلر فاؤنڈیشن" کی فرمائش پر "ہندستانی ادب کے جدید رُجحانات" کے موضوع پر ایک

کتاب مرتب کرنے کے سلسلے میں اگست ۱۹۵۲ء کے آخر میں امریکا کا سفر کیا تھا اُن کا علمی سفر نامہ "ساحل و سمندر" اسی سفر کی یادگار ہے اور اُن لوگوں کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے جنھیں کتاب اور کتب خانوں سے خاص دل چسپی ہے علم و ادب کی اس فضا میں اُنھوں نے امریکی تہذیب و تمدن اور وہاں کے سائنسی عروج و کمال کا ذکر بھی کیا ہے۔ اپنے اس سفر نامے کے ایک مقام پر وہ لکھتے ہیں کہ "ساڑھے دس بجے ہم نہا دھو کر نیچے رسٹراں میں بریک فاسٹ کے لیے گئے۔ مینو MENU سامنے رکھا گیا، کیا کھانا چاہیے، کیا نہیں، کھانوں کے فرانسیسی اور امریکی نام تھے۔ بہت ہمت کر کے بعض چیزوں کا آرڈر دیا۔ کچھ کھایا کچھ نہیں کھایا۔ چوں کہ اسی ہوٹل میں مقیم تھے بل پر دستخط کر کے باہر نکلے۔ یہاں ہر موقعے پر خدمت کرنے والوں کو بخشش یعنی ٹپ دینا لازمی ہے۔ جتنے کا بل ہو تقریباً اُس کا دس فی صد، ٹیکسی والے کو کرایے کے ساتھ بخشش، حمال کو مزدوری کے ساتھ، یہ بھی گویا خرچ کا جزو ہے۔ غیر ملکی لوگوں کو یہ بات کسی قدر اُلجھن میں بھی ڈال دیتی ہے اور بھول چوک بھی ہو سکتی ہے۔ باہر نکل کر خیال آیا کہ کوئی اخبار لیں۔ "نیو یارک ٹائمز" کا بہت نام سُنا تھا۔ آج اتوار کی وجہ سے سنڈے ایڈیشن تھا۔ جس کے دو ڈھائی سو صفحات تھے اور بیس سینٹ قیمت (ایک رُپے کے قریب) اس اخبار کو کون پڑھ سکتا ہے۔ یہ چھپا کس طرح ہو گا۔ کچھ حصہ تو پہلے ہی چھپ چکا ہو گا لیکن بیشتر صفحات پر تازہ بہ تازہ خبریں ہیں۔ اخبارات زیادہ تر ڈاکے، چوری، قتل، زناکاری ہنی مون اور شادی وغیرہ کی خبروں کو سنسنی خیز انداز میں پہلے صفحے پر جگہ دیتے ہیں۔ اخبارات بھاری بھر کم ہوتے ہیں۔ لاکھوں کی تعداد میں کئی بار چھپتے ہیں اور تصویروں اشتہاروں اور تفریحی باتوں سے بھرے ہوتے ہیں"۔

نیو یارک ریلوے اسٹیشن کی منظر کشی وہ یوں کرتے ہیں کہ "میں وقت سے پہلے ہی اسٹیشن پہنچ گیا۔ یہاں قلی کو بہت پیسے دینے پڑتے ہیں، اس لیے زیادہ تر لوگ اپنا سامان خود اٹھائے چلتے ہیں۔ اجنبیت کی وجہ سے میں نے قلی کر لیا، مگر وہ صرف اندر پہنچا کر چلا گیا۔ وقت کافی تھا اپنی حیرت دور کرنے کے لیے ادھر اُدھر دیکھنے لگا یہ اسٹیشن ایک بڑا

بازار ہے جس میں ہر چیز مل سکتی ہے چھوٹی بڑی مشینیں رکھی ہوئی ہیں۔ پیسے ڈالیے اور چیز
حاصل کر لیجیے۔ ایک مشین میں چار طرح کی شراب ہے اور ایک میں چار طرح کے پھلوں کا رس
ہے پیسے ڈالیے اور آپ جو چاہیں گے اُس کا گلاس نکل آئے گا ایک مشین ہے جس کے ذریعے
آپ اپنی تصویر خود کھینچ سکتے ہیں آپ سامنے بیٹھے اور پیسے ڈال کر دستہ گھمائیے چند لمحوں
میں آپ کی تصویر نکل آئے گی۔ اُدھر بڑھیے ایک مشین گول سے میڈل پر آپ کا نام ابھی
کھو دے گی۔ اِدھر نظر کیجیے یہ مشین آپ کی آواز کا ریکارڈ بنا کر آپ کے حوالے کر دے
گی۔ سب پیسے کا کھیل ہے دلچسپی کی کوئی کمی نہیں۔ مجھے سب سے زیادہ جس چیز نے
حیرت میں ڈالا وہ روشنی کی مدد سے دروازوں کا کھُلنا ہے۔ بجلی کی روشنی کی ایک لکیر
دروازے کے قریب پڑ رہی ہے جیسے ہی آپ کے قدم اس کو کاٹتے ہیں دروازہ خود بخود
کھل جاتا ہے اور جیسے ہی آپ گزر جاتے ہیں بند ہو جاتا ہے، مگر جس کے سر پر سفر ہو اور
اجنبی دیس میں تنہا ہو اُس کے لیے ان تفریحات میں زیادہ لطف نہیں۔ اس اسٹیشن سے
سیکڑوں گاڑیاں مختلف سمتوں میں جاتی ہیں اور کوئی گاڑی نظر کے سامنے نہیں سب
زمین کے اندر ہیں۔ گاڑی چھوٹنے سے صرف پانچ چھے منٹ پہلے ویٹنگ روم میں
مائیکروفون سے آواز آئے گی کہ فلاں جگہ جانے والی گاڑی فلاں نمبر کے پلیٹ فارم
سے چھوٹ رہی ہے۔ اب اگر آپ نے پوری توجہ سے نہ سُنا تو مصیبت ہے اور اگر
آپ نے ٹھیک سے سُن لیا تو اسباب اُٹھائیے اور چلیے۔ میرے ساتھ ایک بکس ایک
اٹیچی اور ایک کاغذات رکھنے کا پورٹ فولیو ہے۔ اُنھیں لے کر نیچے اترنا مصیبت ہو
گیا۔ وہاں پہنچا تو کئی گاڑیاں نظر آئیں، ایک ریلوے افسر دکھائی دیا۔ اُس سے پوچھ
کر ایک گاڑی میں گھس گیا۔ دو منٹ کے اندر گاڑی روانہ ہو گئی۔ یہاں ہر جگہ معلومات
حاصل کرنے کے اتنے ذرائع ہوتے ہیں کہ انسان بہت سی مصیبتوں سے بچ سکتا ہے،
مگر ہر وقت ہر بات کا پوچھنا بھی تو مصیبت ہے۔

مولانا محمد منظور نعمانی کا تبلیغی سفر

مولانا محمد منظور مدیر "الفرقان" لکھنؤ رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس میں، جو کچھ عرصے قبل مکہ معظمہ میں منعقد ہوا تھا شریک ہوئے تھے۔ اس اجلاس میں شمولیت کے بعد انھوں نے مارشیس، ری یونین اور نیروبی کا طویل سفر بعض تبلیغی مقاصد کے پیش نظر اختیار کیا تھا۔ مارشیس اور ری یونین برِ اعظم افریقہ کے جنوب مشرق میں بحر ہند میں مشہور جزیرے ہیں۔ نیروبی کینیا کا دار الحکومت ہے۔ مولانا نعمانی نے مارشیس میں کوئی دس دن اور ری یونین میں دو یوم قیام کیا تھا۔ جب کہ نیروبی میں وہ چوبیس گھنٹوں سے بھی کم عرصے ٹھیرے۔ اپنے اس سفر کے دوران میں وہ مارشیس کے شہر پورٹ لوئس میں جو اس جزیرے کا دار الخلافہ بھی ہے مقیم رہے، تاہم انھوں نے وقت نکال کر اس جزیرے کے دوسرے شہروں اور قصبوں کو بھی گھوم پھر کر دیکھا۔ اس جزیرے کے متعلق اُن کا مجموعی تاثر یہ ہے کہ آبادیاں عام طور سے بہت صاف ستھری ہیں۔ خستہ حالی، پسماندگی اور گندگی کے مناظر کہیں دیکھنے میں نہیں آئے۔ موٹروں کی کثرت ہے، لیکن اُن کی وجہ سے بازار میں کوئی شور اور ہنگامہ محسوس نہیں ہوتا۔ ہارن بجانے کا رواج بہت ہی کم ہے عام طور سے لوگ موٹر بڑی احتیاط اور اطمینان سے چلاتے ہیں۔ موڑ پر پہنچ کر ہر شخص موٹر روک لیتا ہے اور دائیں بائیں اطمینان کر کے اپنی موٹر آگے بڑھاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہاں کے لوگ بڑے ہی شائستہ معلوم ہوتے ہیں حالانکہ شہروں میں اکثریت ہندوستانیوں ہی کی ہے جن میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کی آب و ہوا اور ماحول نے اُن کو بہت ہی شائستہ بنا دیا ہے۔ ری یونین کے بارے میں مولانا نعمانی فرماتے ہیں کہ یہ جزیرہ مارشیس سے بھی زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ بہت خوب صورت اور صاف ستھری آبادی ہے۔ بازار اور سرکاری دفاتر صبح آٹھ بجے کھل جاتے ہیں اور بارہ بجے بند ہو جاتے ہیں۔ پھر دو بجے کے بعد کھل جاتے ہیں اور کچھ دیر رات گزرنے کے بعد بند ہو جاتے ہیں۔ یہ طریقہ مجھے بہت ہی پسند آیا۔ یہاں کی زندگی میں بڑی شائستگی

اور سکون ہے۔ یہاں بھی موٹر چلاتے ہوئے ہارن بجانے کا رواج بالکل نہیں ہے، بلکہ بتایا گیا ہے کہ یہاں ہارن بجانا قانوناً ممنوع ہے اور پوری مملکت فرانس میں یہی قانون ہے۔ یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ یہاں کے لوگ اپنی حکومت سے بہت ہی مطمئن اور اُس کے حُسنِ انتظام کے مدّاح ہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ جب کسی کام سے ہمیں حکومت کے کسی دفتر میں یا کسی افسر کے پاس جانا ہوتا ہے تو ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ اُس کو ہمارے ساتھ ہمدردی ہے اور ہمارے لیے سہولت فراہم کرنا اور جلدی سے جلدی ہمیں فارغ کر دینا وہ اپنا فرض سمجھتا ہے۔ رشوت کا وہاں تصور بھی نہیں۔

نیروبی اُن کی رائے میں بہت ہی ترقی یافتہ شہر ہے اِس شہر کو انگریزوں نے لندن کے نقشے پر بڑا حسین و جمیل بنایا ہے اور اب یہ لندن کا چھوٹا نمونہ ہے۔ یہاں کے اصل باشندے سیاہ فام ہیں اور اب انگریزوں کے جانشینوں کے طور پر حکومت کی کرسیوں پر فائز ہیں۔ موسم یہاں ہمیشہ یکساں اور خوش گوار رہتا ہے اور سال کے کسی حصے میں بھی سونے کی جگہ بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

ہالینڈ: حسین پھولوں کی سرزمین"

سرزمین ہالینڈ کے دامن کو دستِ قدرت نے رنگا رنگ اور حسین پھولوں سے اس قدر فیّاضی اور فراوانی کے ساتھ سنوارا ہے کہ یورپ کا یہ گُل پاش و گل بداماں خطّہ جنّتِ ارضی کا نمونہ بن گیا ہے۔ ہفت روزہ "اقدام" لاہور کے سابق مدیر اور ہمارے ممتاز صحافی جناب ممتاز احمد خاں اِس مملکتِ لالہ و یاسمن کی تعریف میں اس طرح رطب اللسان ہیں: "ہالینڈ کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی جو چیز سب سے زیادہ آپ کو متاثر کرتی ہے وہ اس ملک کی شادابی، پانی کی فراوانی اور غیر معمولی صفائی ہے۔ سارا ملک ایک وسیع باغ معلوم ہوتا ہے۔ چاروں طرف گُل و گلزار کا ساماں ہے۔ شہر اور بن میں کوئی فرق نہیں۔ صفائی، سلیقے اور دل آویزی میں دونوں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں کوشاں ہیں۔ اس ملک کا کونا کونا دیکھنے کا اتفاق ہوا، لیکن چپّا

بھر زمین بھی گندگی سے آلودہ نہیں دیکھی۔ یا سبزہ ہے یا پھول پھلواری۔ صفائی اور پھولوں کے یہ لوگ شیدائی ہیں۔ کوئی گھر ایسا نہیں جو پھولوں سے خالی ہو اور سلیقے میں مزدوروں کے فلیٹ بھی ہمارے بیشتر بنگلوں سے بہتر ہیں۔ ہالینڈ کو یورپ میں پھولوں کی سرزمین کے نام سے پکارا جاتا ہے کہ پھولوں کی دولت اور پھولوں سے والہانہ محبت جو اس ملک کو نصیب ہوئی ہیں کسی دوسرے ملک کے حصے میں نہیں آئیں۔ اہل ہالینڈ نے پھولوں سے اپنی شیفتگی کو باقاعدہ ایک صنعت کی شکل دی ہے اور موسم بہار میں چاروں طرف پھولوں سے لدے ہوئے کھیت دکھائی دیتے ہیں جن میں گُل لالہ سب سے مقبول ہے۔ سائنس کی مدد سے لالہ کی سینکڑوں نئی قسمیں پیدا کی گئی ہیں جو رنگ، رعنائی، قد اور عمر میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق بیس ہزار ایکڑ سے زائد زمین پھولوں کے لیے زیرِ کاشت ہے اور ہر سال ساٹھ ہزار ٹن سے زیادہ پھول غیر ممالک کو بھیجے جاتے ہیں جن کی مجموعی قیمت پندرہ کروڑ روپے ہے۔"

جنیوا کا یادگار سفر

مصورِ فطرت خواجہ حسن نظامی کے بڑے صاحبزادے خواجہ حُسین نظامی کا شمار اگرچہ ہمارے ملک کے تجارت پیشہ حضرات میں ہوتا ہے، تاہم وہ قلم پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے ۱۹۵۵ء کے آخر میں یورپ کا سفر کیا تھا اور اس سفر کے مشاہدات "یورپ پر ایک طائرانہ نظر" کے زیرِ عنوان ایک مختصر سے مضمون میں رقم کیے تھے جو بہت ہی دلچسپ تھے۔ سوئٹزرلینڈ کے دارالحکومت جنیوا کے متعلق اُنھوں نے لکھا کہ "جنیوا چھوٹا سا شہر ہے مگر ہے نہایت صاف ستھرا اور خوش منظر، جنیوا جھیل کے کنارے آباد ہے۔ اس جھیل میں اوپر سے دریائے اردن گرتا ہے اور جنیوا کے قریب پھر باہر نکلتا ہے۔ پھر جنیوا کے وسط میں سے گزر کر فرانس کے علاقہ میں سے ہوتا ہوا مارسیلز کے قریب سمندر میں مل جاتا ہے، مگر اس کو دریا کہنا خوش اعتقادی ہے، بس چھوٹی سی نہر سمجھو۔ پکے کنارے ہیں جن پر چہل قدمی کے لیے پٹریاں بنی ہوئی ہیں اور بیٹھنے والوں کے لیے بنچیں، بڑی

ہیں۔ پُرانا جنیوا پہاڑی پر آباد ہے اور باقی شہر میدان میں بسا ہوا ہے۔ جھیل کے کنارے ایک پہاڑی اور ہے جہاں بنجارہ ہِل حیدر آباد دکن کے سے مکانات ہیں اور حسین ساگر کا سا منظر ہے، مگر مکانوں کا طرز مختلف ہے۔ پرانے جنیوا میں رئیسوں کے مکانات ہیں۔ تنگ مگر صاف ستھری گلیاں ہیں جن میں پتھر کی اینٹوں کا فرش ہے۔ مکانات نہایت عالی شان ہیں۔ ان پُرانی عمارتوں میں جنیوا کی اصل رُوح ہے۔ یہاں کے شہریوں نے اس قدامت کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔ پُرانے جنیوا میں پہاڑی پر ایک گرجا ہے۔ اس کے قریب سے نیچے کے نئے شہر میں جانے کے لیے تنگ سیڑھیاں اُترتی ہیں۔ شاید یہ سو سیڑھیاں ہوں گی۔ یہ زینہ گویا قدیم کو جدید سے ملاتا ہے۔ نیچے اُترتے ہی ماحول بدل جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سولھویں صدی سے بیسویں صدی بلکہ اکیسویں صدی میں آ گئے۔ جنیوا میں یوں تو ہر قسم کی دکانیں ہیں، مگر پہلے نمبر پر گھڑیوں اور تحائف کی دکانیں ہیں۔ دوسرے نمبر پر کیک پیسٹری اور سامان خورد و نوش کی دکانیں اور ریسٹوراں اور تیسرے نمبر پر کتابوں کی دکانیں نظر آتی ہیں۔ یہاں لوگوں کو لکھنے پڑھنے کا شوق ہے۔ کتابوں کی دکانوں میں قدیم نسخے ہر زبان کے مل جاتے ہیں، مگر قیمتیں بہت زیادہ ہیں۔ قدیم اشیا اور فرنیچر کی بھی کافی دکانیں ہیں۔ دکانوں کی سجاوٹ بھی خوب ہوتی ہے۔ سجاوٹ کا ذکر آیا تو قصابوں کی دکانوں کا حال ضرور سن لیجیے۔ یہ دکانیں بھی کافی ہیں اور ہر بڑے بازار میں موجود ہیں۔ سرد REFRIGERATED شیشے کی الماریوں میں ہر قسم کا گوشت، بنی ہوئی مرغیاں، تیتر، چکور، مرغابیاں سجی ہوئیں، طرح طرح کی مچھلیاں صاف کی ہوئیں، پلیٹوں میں کلیجی، دل، گردے وغیرہ الگ الگ تھوڑی تھوڑی مقدار میں رکھے ہوتے، ہر چیز پر قیمت کا لیبل لگا ہوا۔ گوشت میں نے ہر قسم کا بیان کیا، اس میں مبالغہ نہیں ہے، کیوں کہ یہاں ہرن کا گوشت بھی مل جاتا ہے۔ اندر قصائی صاحب سفید ایپرن باندھے، گاہکوں کو گوشت کاٹ کاٹ کر اور تول تول کر دینے کے لیے کھڑے ہیں۔ اکثر گوشت کے حصّے کٹے کٹائے رکھے ہیں، مثلاً چانپ وغیرہ، مگر بعض حصّے اُسی وقت گاہک کی پسند کے مطابق کاٹ کر دیے جاتے ہیں۔ پھر نہایت صاف ستھرے پیکنگ میں ایک

ڈوری باندھ کر اور اُس میں ایک گول سی گتّے کی نلکی باندھ کر، تاکہ ہاتھ میں لٹکانے میں سہولت ہو۔ گاہک کو بنڈل دے دیا جاتا ہے۔ پھولوں کی دکانیں بھی بہت ہیں، دُنیا بھر کے پھول ایئر کنڈیشنڈ الماریوں میں اس خوب صورتی سے سجا کر رکھے جاتے ہیں کہ دکان کے پاس سے ہٹنے کو جی نہیں چاہتا۔ رنگ برنگی قوسِ قزح معلوم ہوتی ہے۔ ایک بات جنیوا میں اور دیکھی کہ یہاں مرد اور عورتیں سب سنجیدہ لباس پہنتے ہیں۔ امریکنوں کی شوخ ٹائیاں اور بھڑکیلے کپڑے بھی یہاں کے ماحول میں بدل جاتے ہیں۔ لوگ نہایت خوش اخلاق ہیں۔ سڑکوں پر ہر قومیت کے لوگ دکھائی دیتے ہیں۔ ساڑھیوں میں ملبوس ہندُستانی خواتین بھی اکثر سڑکوں پر چلتی پھرتی نظر آتی ہیں، مگر اُن کی ساڑھیوں کے رنگ بھی صوفیانے تھے۔ موٹریں بہت ہیں اس لیے پارکنگ کی بڑی مصیبت ہے۔ موٹریں زیادہ تر یورپین ہیں، جرمنی کی مشہور موٹر مرسی ڈیز اور فرانس کی سٹروئن کافی ہیں۔ رولس ایک بھی دکھائی نہیں دی۔ امیر اور بڑے لوگ عام طور پر چھوٹی موٹروں میں پھرتے ہیں، کیوں کہ امارت کی نمائش چھچھورپن سمجھی جاتی ہے۔

مُسافر کی ڈائری

ہندُستان کے کہنہ مشق صحافی اور ادیب اور نامور فلم ساز خواجہ احمد عباس نے ۱۹۳۸ء میں دُنیا کے سترہ ملکوں کی سیر کی اور پچیس ہزار میل کے آس پاس سفر کیا۔ واپس آئے تو اُنھوں نے اپنے تاثراتِ سفر کو ایک ہلکے پھلکے اور شگفتہ سفرنامے "مسافر کی ڈائری" کی صورت میں قلم بند کیا۔ لندن کے متعلق اُن کی رائے ہے کہ "دُنیا کا بدترین کھانا یہاں ملتا ہے۔ صبح و شام اُبلے ہوئے گوشت، اُبلے ہوئے آلو اور اُبلی ہوئی گوبھی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ تمام شہر میں بہترین کھانا ہندُستانی ہوٹلوں میں ملتا ہے جو کافی تعداد میں ہیں۔"

"زمین کے نیچے ریلوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ ریلوں کا انتظام حیرت انگیز ہے۔"

"بھیک مانگنا جرم ہے مگر دھیلے کی دیا سلائی کی ڈبیا دو آنے میں فروخت کی جاسکتی ہے۔"

"وزیرِ اعظم جو دُنیا کی سب سے بڑی حکومت کا حکمراں ہے ایک تنگ گلی میں ایسے چھوٹے

سے مکان میں رہتا ہے جس میں ہندستان کے وائسرائے کا بینڈ ماسٹر بھی رہنے سے انکار کر دے گا۔"
• بادشاہ اور ملکہ کی موٹر جب بازار سے گزرتی ہے تو وہ انتظام نہیں کیا جاتا جو ہمارے ملک کے گورنروں کے لیے کیا جاتا ہے۔"
• ہائیڈ پارک میں جاکر جس شخص کا جی چاہے تقریر کر سکتا ہے، اگر اس کو پانچ چھے سننے والے مل جائیں۔"
• صفائی پسند انگریز دن میں صرف ایک بار منہ دھوتے ہیں اور ہفتے میں ایک بار نہاتے ہیں، قمیض کا کالر روز تبدیل کرتے ہیں، مگر قمیض جب پسینے میں سڑ جائے تب ہی بدلی جاتی ہے۔ چھے چھے مہینے ایک ہی کالی پتلون میں گزار دیتے ہیں۔"
• اخباروں میں زیادہ تر خبریں قتل، ڈاکے، زنا اور بدکاری کے متعلق ہوتی ہیں۔ ہر قتل کی واردات کی تفصیل شائع کی جاتی ہے اور ہندستان کی اہم ترین خبر ایک دو سطروں میں ٹال دی جاتی ہے۔"

پردیس کی باتیں"

اب آخر میں ہم حیدر آباد (دکن) سول سروس کے رکن مرزا حسین احمد بیگ کے ممالکِ اسلامیہ و یورپ کے سفر نامے "پردیس کی باتیں" سے جرمنی کے متعلق ایک اقتباس پیش کرتے ہیں، مرزا صاحب لکھتے ہیں کہ "برلن کی آب و ہوا اچھی اور صحت بخش ہے۔ یورپ کے دوسرے شہروں کی نسبت یہاں جاڑوں میں سخت سردی اور گرمیوں میں زیادہ گرمی ہوتی ہے۔ ہم کو گرمی کا تجربہ ہے۔ جون کا مہینہ تھا، گرمی خاصی تھی۔ مکانوں میں پنکھے نہیں ہوتے، اس لیے گرمی اور بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ اکثر لوگ محض قمیض سے بازاروں میں پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بھی دیکھا کہ ریستوراں میں کوٹ اتار کر کھانا کھا رہے تھے۔ ایک روز ہم کو بھی گرمی سے تکلیف ہوئی۔ ہوٹل میں کھانے کی میز پر ایک امریکن سیاح تھے، اُن کو بھی گرمی محسوس ہو رہی تھی، لیکن ایک دوسرے کے لحاظ سے کوٹ نہیں اتارتے تھے۔ میرے قریب ان صاحب کی بیوی بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے کہا "آج گرمی بہت ہے اگر اجازت

ہو تو کوٹ اتار دوں" انھوں نے کہا بہت خوشی کے ساتھ، میرے خاوند کو بھی گرمی محسوس ہو رہی ہے. تم لوگوں کی وجہ سے کوٹ نہیں اتار تے" بالآخر ہم سب نے کوٹ اتار دیے. گرمیوں میں آئس کریم اور آب شورے کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے. آئس کریم کی اچھی اچھی دکانیں بازاروں میں ہر جگہ دکھائی دیں گی۔

"برلن میں انڈر گراونڈ یعنی زیرِ زمین دوز ریلوے بھی ہے. گاڑیاں نفیس اور صاف ستھری ہیں. اسٹیشن بھی اچھے بنے ہوئے ہیں. کئی دفعہ ان میں بیٹھنے کا موقع ہوا. زبان کی وجہ سے مشکلات کا سامنا ہوتا ہے. یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کس پلیٹ فارم سے کون سی ٹرین میں سوار ہونا چاہیے. یہی مشکل موٹر بس اور ٹرام کی سواری میں پیش آتی ہے. ہم زیادہ تر پیدل چلتے تھے یا ٹیکسی میں سوار ہوتے تھے. پیدل چلنا زیادہ مفید ہے، کیوں کہ سیر کا بہت اچھا موقع ملتا ہے. بالخصوص دکانوں کی رونق اور سجاوٹ خوب دیکھنے میں آتی ہے. برلن کی دکانیں بہت دل آویز طریقے پر سجائی جاتی ہیں. ریشمی پارچے اور چمڑے کا سامان اچھا اور ارزاں ہے. یہاں کے بنے ہوئے سگریٹ اچھے نہیں ہوتے. انگریزی سگریٹ مہنگا ہوتا ہے، البتہ سگار یہاں کا اچھا ہوتا ہے. قیمت بھی کم ہوتی ہے. پبلک ٹیلیفون جا بجا لگے ہوئے ہیں. لندن کی نسبت فیس بھی کم ہے، مگر خرابی یہ ہے کہ اگر بات نہ ہو سکے تو پیسے واپس نہیں ملتے. اس کے خلاف لندن میں پیسے واپس مل جاتے ہیں"۔

"جرمن لوگ عام طور پر خلیق ہوتے ہیں. مصافحہ کرنے کی رسم بہت مقبول ہے. علی الصبح ایک دوسرے سے ہاتھ ضرور ملاتے ہیں. مجھ کو ان لوگوں کی جو چیز ناپسند ہے وہ اُن کا منڈا ہوا سر ہے سر کے بال اس قدر خشخشی ہوتے ہیں کہ دُور سے سر منڈا ہوا معلوم ہوتا ہے. ایک اور خصوصیت ان لوگوں کی ذکر کے قابل ہے. وہ یہ کہ انکار کے موقع پر شانے اونچے کر دیتے ہیں. مثلاً ان سے اگر سوال کیا جائے اور جواب میں وہ شخص شانہ اُدنچا کر دے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ "مجھے نہیں معلوم". اٹلی اور فرانس میں بھی بے شانے چڑھانے کی عادت عام ہے. اس ملک کی عورتیں بھی مضبوط اور دوہرے

جسم کی ہوتی ہیں۔ ان کو بچپن ہی سے امورِ خانہ داری سکھائے جاتے ہیں، اس لیے گھریلو کاموں میں وہ بہت سلیقہ شعار ہوتی ہیں۔ اُن کا تمام وقت گھریلو کاموں میں صرف ہوتا ہے۔ وہ امریکا اور انگلستان کی عورتوں کی طرح حد سے زائد آزاد خیال نہیں ہوتیں۔"

دو ہفتے ترکی میں

"دو ہفتے ترکی میں" برصغیر پاک وہند کے مشہور و معروف عالم دین مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا دل چسپ اور معلومات افزا سفر نامہ ہے اس سفر نامے کا تعلق جیسا کہ اُس کے نام سے ظاہر ہے ترکی سے ہے۔ آئیے، دیکھیں کہ اُنھوں نے اس اسلامی ملک کو کس نظر سے دیکھا ہے:

"نماز کے بعد ہم نے توپ کاپے کے عجائب خانے اور ذخیرے کی سیر کی۔ یہ جامع ایا صوفیہ کے پاس ایک قدیم عمارت میں ہے جو کوئی شاہی عمارت معلوم ہوتی ہے، داخلہ ٹکٹ سے ہوتا ہے۔ یہ سلاطینِ ترکی کے عہد کے ذخائر و تحائف کا مجموعہ ہے اور غالباً سونے، چاندی، جواہرات، مرصع ظروف اور بیش قیمت اشیا کا اتنا نادر، اتنا بیش قیمت اور اتنا کثیر ذخیرہ دنیا کے کسی عجائب خانے میں نہ ہوگا۔ سلاطین آل عثمان نے صدیوں متمدن دُنیا کے غالباً سب سے بڑے حصے پر حکومت کی ہے۔ بڑی بڑی سلطنتیں اور بڑے بڑے سلاطین اُن کے باج گزار اور زیر اثر رہے ہیں۔ ان سلاطین نے اُن کو جو تحائف بھیجے یا اُنھوں نے اپنے شوق سے اپنے اور اپنی بیگمات کے لیے جو چیزیں تیار کیں وہ سب یہاں جمع ہیں اور تماشا گاہِ عالم ہیں۔ ہم ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ اتوار کو یہاں تعطیل ہوتی ہے۔ اس وجہ سے سیر کرنے والوں اور سیر کرنے والیوں کا ہجوم تھا۔ اس کمرے میں وہ سب ڈبے، برتن، سنگار دان، قرآن مجید کے جزدان، رحل، چراغ، شمع دان تلواریں، نیام، اور اسلحہ وغیرہ رکھے ہوئے تھے جو مختلف سلاطین کے زیرِ استعمال یا زینت کا خزانہ تھے۔ اُن میں جواہرات، سچے موتیوں اور سونے چاندی کا استعمال اس فراخ حوصلگی اور سخاوت کے ساتھ کیا گیا تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔ ایک جگہ سلطان احمد اول اور

بعض سلاطین کے تخت اور نشست گاہیں تھیں جو کامل سونے کی ڈھلی ہوئی اور جواہرات سے مرصع تھیں۔ ایک جگہ سلطان سلیم سے لے کر سلطان عبد الحمید خان تک لباس شاہی کے تغیرات دکھائے گئے تھے۔ شاہ اسماعیل سنوسی کا تخت بھی دیکھا جو ایرانی اور ہندستانی صنعت اور مرصع کاری کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ عیسائی بیگمات کے زیورات بھی دیکھے جن میں صلیبیں آویزاں تھیں۔ سلطان مُراد کا ایک طلائی صندوق تھا جس میں خرقہ شریف رہتا تھا۔ اصلی سونے کے پورے پورے شمع دان دیکھے جن میں سے ایک ایک پر بیس بیس سیر سونا صرف ہوا ہوگا۔ اتنا گہرا اور آب دار کہ دور سے معلوم ہوتا تھا جیسے آگ لگی ہوئی ہے۔ بعض واقفین کا کہنا ہے کہ اگر ترکی کسی زمانے میں دیوالیہ ہو جائے تو اس عجائب خانے کا سونا کچھ مدت تک پورے ملک کا خرچ چلا سکتا ہے۔ یہی وہ تعیشات، اسراف اور عجمی تمدن ہے جس نے اس سلطنت کو کھوکھلا کر دیا تھا اور اس کی چولیں ہلا ڈالی تھیں۔

توپ کاپے سے ہم قصر یلدز دیکھنے گئے۔ یہ سلطان عبد الحمید خاں کا وہ مشہور قصر اور قیام گاہ ہے جس کا نام ہی ایک زمانے میں مرعوب کرنے کے لیے کافی تھا۔ کسی زمانے میں یہ دنیائے اسلام کا مرکز اعصاب تھا۔ سلطان عبد الحمید خاں نہایت ذہین شخص اور بڑے باجرأت حکمران تھے۔ وہ اسی قصر میں بیٹھ کر تمام سلطنت عثمانیہ کو اپنی مٹھی میں رکھنا چاہتے تھے۔ ہوسِ اقتدار نے اور اُن کی غیر معمولی ذہانت یا افتادِ طبع نے اُن کو بڑے بڑے مصلحین اور سلطنتِ ترکیہ کے خیر خواہوں کی طرف سے بدگمان اور ان کا دشمن بنا دیا تھا۔ باایں ہمہ اُن کے متعلق کہا گیا تھا کہ وہ پانچ بڑے سلاطینِ اسلام میں سے تھے جو عہدِ اموی سے لے کر اس وقت تک گزرے ہیں۔ وہ ایسے عالی دماغ تھے کہ یورپین حکومتوں سے کھیلتے تھے۔ بڑی دینی حمیت رکھتے تھے اور اگر یورپ میں کوئی چیز اسلام یا پیغمبر اسلام کے لیے اہانت آمیز پیش آتی تو وہ اپنی ناراضی کا اظہار اور احتجاج کرتے۔ ایک مرتبہ فرانس میں والٹیر کا ایک ڈراما اسٹیج ہونے والا تھا جس میں آں حضرت صلعم کو اس طرح پیش کیا گیا تھا جو توہین آمیز تھا۔ سلطان کو معلوم ہوا تو اپنے سفیر متعینہ فرانس کو لکھا کہ میری طرف سے سخت احتجاج کرو اور اگر حکومت اس کو بند کرنے کا فیصلہ نہ

کرے تو فوراً پیرس چھوڑ دو۔ حکومتِ فرانس نے اس کھیل کو، باوجود اس کے کہ اُس کا کافی اشتہار دیا جا چکا تھا روک دیا۔ سلطان کے زمانے میں یہودیوں نے اس امر کی خواہش کی کہ اگر اُن کو فلسطین میں اپنا قومی وطن بنانے کی اجازت دے دی جائے تو وہ اس کے بدلے میں سلطنتِ ترکیہ کا سارا قرض ادا کرنے کو تیار ہیں، لیکن سلطان نے صاف انکار کر دیا۔

قصرِ یلدز وہ قصر ہے جہاں سید جمال الدین افغانی بھی آتے تھے اور گھنٹوں سلطان کے پاس بیٹھتے تھے۔ اس قصر میں سیاحوں کے جانے کی اجازت تو نہیں ہے مگر اُس کے اِرد گرد جو عظیم الشان باغ ہے اُس میں جانے اور سیر کرنے کی اجازت ہے۔ قصر کے گرد ایک وسیع اور سنگین حصار ہے اور وہ ایک قلعہ معلوم ہوتا ہے۔ اب یہ قصر اپنے عالی شان اور عالی دماغ مکین کا نوحہ خواں ہے۔ مکان و مکین کے درمیان اب اتنا بڑا فاصلہ ہے جس کی پیمائش بھی مشکل ہے۔ اب اس قصر میں شاید حکومت کا کوئی محکمہ یا خفیہ پولیس کی کوئی تربیت گاہ ہے اور اُس کا باغ غیر ملکی سیاحوں اور ملکی زائرین کی جولان گاہ۔

دہلی اور اُس کے اطراف

مولانا حکیم سید عبدالحیّ مصنف "گُلِ رعنا" و سابق ناظم ندوۃ العلما لکھنؤ نے تقریباً ایک صدی پیشتر دہلی اور اُس کے قرب و جوار کے علاقوں کا سفر کیا تھا۔ وہاں وہ اُس دور کی علمی و دینی شخصیات سے ملے، تاریخی عمارات کو بھی جی بھر کر دیکھا اور بعد ازاں اُن کا دل چسپ تذکرہ اپنے مرتبہ سفر نامے "دہلی اور اُس کے اطراف" میں کیا۔ اس سفر نامے کا ایک مقام ملاحظہ فرمائیے:

"پُرانی دہلی"

"روز شنبہ ۲ رجب ۱۳۱۲ھ۔ آج صبح کو اُٹھ کر قطب صاحب کی سیر کا ارادہ ہوا، اس وجہ سے کھانا جلد پکوا کر کھا لیا۔ یہاں سے وہاں تک ایک ٹم ٹم میں یکہ ہو کر یہ خاکسار اور برادر صاحب مکرمی سید خلیل الدین اور عزیزی محمد صالح سوار ہو کر

چلے۔ دہلی دروازے سے باہر نکل کر جیل خانے اور کوٹلے کے درمیان سے سڑک گئی ہے۔
یہیں سے آثار مندرسہ مساجد و مزارات و قلعجات و محلات کے شروع ہوئے جن کے
کھنڈروں پر کائی جمی ہوئی ہے۔ کوئی رہنے والا نہیں۔ ٹوٹی پھوٹی عمارتیں بچی ہیں کوئی یہ
بھی نہیں جانتا کہ ان عمارتوں کو کس کس نے بنایا تھا۔ ہزاروں عمارتیں ہیں جن کے آثار
بھی باقی نہیں ہیں۔ مساجد و مشاہد کے آثار اس وجہ سے باقی رہ گئے کہ وقف ہونے
کی وجہ سے وہ توڑی نہیں گئیں۔ تاہم کتنی مساجد و مشاہد ہیں، جو نیست و نابود ہو گئی
ہیں۔ کتنے قلعے ہیں جو سر بفلک کشیدہ ہیں، لیکن تغیراتِ زمانہ سے شکست ہو گئے ہیں۔
کچھ دنوں میں ان کا نام و نشان بھی نہ رہے گا۔ چار میل پر جا کر اسی قسم کے آثار و نشانات
زیادہ پانے گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک شہر ویران و خراب پڑا ہوا ہے جس کے مکانوں
کی چھتیں گر گئی ہیں، دیواریں ٹوٹ گئی ہیں، کچھ کھڑی ہیں، کچھ پڑی۔ انھی میں حضرت
نظام الدین اولیاؒ کا مقبرہ ہے۔ جس کو یہاں کے عرف میں سلطان جی اور نظام الدین
کہتے ہیں، پھاٹک کے اندر ایک باولی بہت بڑی ہے۔ وہ اُسی وقت کی بنائی جاتی
ہے۔ اُس کی دیوار بہت اونچی ہے، اس کے کنارے کنارے ہو کر اندر گئے۔ بیچ صحن میں
قبہ تھا۔ اس کے اندر مزار مبارک ہے۔ اِس کے گرد سنگِ مرمر کا کٹہرہ ہے، جس کو
شمس الامرا امیر کبیر خورشید جاہ بہادر نے نذر گزرانا ہے۔ سرہانے بلندی پر ایک کلام مجید
بخطِ نسخ جلی حروف رکھا ہے۔ تمام صحن میں سنگِ مرمر کا فرش ہے۔ وہاں سے آگے
بڑھ کر دو مقبرے سنگِ مرمر کے ہیں، ان پر قبہ نہیں ہے۔ ان کے کواڑ بھی سنگِ مرمر
کے ہیں، ان کا کام قابلِ دید ہے، داہنے طرف والا محمد شاہ کا ہے۔ وہاں سے آگے
بڑھ کر امیر خسرو دہلویؒ کا مقبرہ ہے۔ اُن کے مزار کے گرد بھی سنگِ مرمر کا کٹہرہ
شمس الامرا کا بنوایا ہوا ہے۔ اِن مزاروں پر فاتحہ پڑھ کر مسجد دیکھنے کو آئے۔ اس
کے قریب ایک اور سنگِ مرمر کا مقبرہ ہے۔ اس میں تین قبریں ہیں۔ ایک نواب
جہاں آرا بیگم کی ہے، اس کے لوحِ مزار پر یہ شعر کندہ ہے ؎

بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزار مرا
کہ قبر پوشِ غریباں ہمیں گیاہ بس است

اس کے تلے لکھا ہے۔ "الفقیرۃ الفانیہ جہاں آرا مرید خواجگانِ چشت بنت شاہجہاں بادشاہ غازی انار اللہ برہانہٗ"۔ مسجد علاء الدین خلجی کی سنگ سرخ کی بنوائی ہوئی ہے۔ اس کی بلندی و وسعت، قبّہ و سنگ تراشی کا کام قابل دید ہے۔ دیکھ کر آدمی متحیّر ہو جاتا ہے۔ اس کو دیکھ کر باہر نکلے۔ ان مقبروں میں مزارات اور بھی کثرت کے ساتھ ہیں۔

وہاں سے نکل کر قطب صاحب گئے۔ قطب صاحب شاہجہاں آباد سے گیارہ میل ہے۔ اس مسافت میں کئی قلعے راستے میں ملے۔ دہلی کی پرانی آبادی یہاں کثرت سے ہے۔ شہر آباد ہے، لیکن نہایت بے رونق، جہاں تک نگاہ جاتی ہے سوا ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ ہر چند کہ آبادی کے شروع میں قطب صاحب کی لاٹ ملتی ہے، لیکن ہم سیدھے خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر گئے۔ اس تبرے کی چار دیواری کی عمارت بھی سنگِ مرمر کی ہے۔ قبّہ نہیں ہے۔ اس کے گرد و پیش صدہا قبریں ہیں۔ وہاں فاتحہ پڑھ کر نکلے اور مسجد وغیرہ دیکھیں۔ وہاں سے بہادر شاہ خاتم السلاطین کے حسرت محل کو عبرت کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے باہر آئے۔

اب ہم قطب مینار کی طرف آئے۔ اس کی عمارت قابلِ دید ہے۔ یہ مسجد کا ایک مینار ہے۔ جو پرتھی راج کے بُت خانے کو توڑ کر بنوایا گیا تھا۔ اس بُت خانے کے نشانات بھی مسجد کے زینے میں اب تک موجود ہیں۔ ایک مینار صرف بنا تھا، دوسرے میں لگا تھا۔ کچھ محرابیں بن چکی تھیں کہ داعیٔ اجل نے بانی کو پکارا اور وہ جان بحق تسلیم ہوا۔ اس مسجد کی شمس الدین التمش نے بنیاد ڈالی تھی، اگر بن جاتی تو تمام عالم میں بے مثل عمارت ہوتی۔ مسجد ایا صوفیہ کی اس کے سامنے کوئی حقیقت نہ ہوتی۔ ولید بن عبدالملک کی مسجد کو جو دمشق میں ہے لوگ بھول جاتے۔ اس وقت اس کے صرف ایک مینار کو دیکھنے یورپ سے لوگ آتے ہیں۔ باوجودیکہ دو منزلیں اس کی اتار لی گئی ہیں، لیکن اب بھی اتنا مرتفع ہے کہ اس کے برابر اور کوئی مینار مرتفع نہ ہوگا۔ تین سو سے زائد سیڑھیاں ہیں، ان سب باتوں سے قطع نظر کر کے سنگ تراشی کا کام دیکھیے تو

عقل حیران ہوتی ہے۔ آذر ہوتا تو وہ بھی دیکھ کر مبہوت ہو جاتا۔ میں نے سانچی کا نا
کھیڑہ کی عمارتیں دیکھی ہیں جو حضرت عیسٰی علیہ السلام سے تقریباً چھ سو برس پیشتر
کی عمارتیں ہیں اور سنگ کو موم کر دیا ہے، لیکن میرے نزدیک اس کے سامنے اس
کی کوئی حقیقت نہیں۔ اہرام مصری کا نام ہی نام ہے۔ وہ انگھڑ بے جوڑ عمارت
اس کی برابری کیا کر سکتی ہے۔ سیاحوں نے مان لیا ہے کہ یہ عمارت لاثانی ہے اس کے
داہنی طرف ایک بہت مرتفع دروازہ ہے، اس کے اندر ایک وسیع گنبد ہے جس کا
کام تعبیہ مینار کا سا ہے۔ اس کو دیکھ کر بھی حیرت ہوتی ہے، اس کو علاء الدین خلجی
کا بتاتے ہیں۔ مجھ سے ایک شمہ بھی ان کے واقعی حالات کا بیان نہیں ہو سکتا۔ اور وہ
شخص کیا بیان کر سکتا ہے جس نے ان کو آنکھ بھر کر بھی نہ دیکھا ہو۔ جس نے ایسی آنکھ
سے دیکھا ہو جس میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے ہوں۔ کوئی یورپین یا ہندو جنٹلمین ان کو
تماشا گاہ سمجھتا ہو تو ہو لیکن میں کیا تمام مسلمان ان کو مرقع عبرت یا افسانہ حسرت
خیال کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو اس سے زیادہ کیا حسرت کا مقام ہوگا کہ وہ ان اقبال
مندیوں کے مقابلے اپنی حالت کو حقیقی ادبار میں پاتا ہے۔ سچ ہے ملک و دولت میں
کسی کا اجارہ نہیں۔" یعز شہا من یشاء"

سفر ناموں کے متعلق مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی نے کیا خوب لکھا ہے

سفر نامہ کسی کا ہو کبھی بے کار مت سمجھو
اس آئینے میں فرحت عکس عالم خوب آتا ہے
ہر اک نقش قدم سیاح کا رہبر ہے منزل کا
ہزاروں گم رہوں کو راہ پر یہ ہی لگاتا ہے

مَن آنم کہ مَن دانم

اُردو آپ بیتیوں کا تفصیلی تذکرہ

آپ بیتی دراصل سوانح حیات ہی کی ایک قسم ہے۔ فرق دونوں میں صرف اس قدر ہے کہ ایک سوانح حیات میں صاحبِ سوانح حیات اور مصنّفِ سوانح حیات دو جداگانہ شخصیتیں ہوتی ہیں۔ سوانح حیات کا مصنّف مختلف ذرائع کو بروئے کار لاکر صاحبِ سوانح حیات کی شخصیت اور اُس کے کردار کے مختلف پہلوؤں کے متعلق جو معلومات فراہم کرتا ہے، انھیں وہ فن کے تقاضوں کے مطابق ترتیب دے ڈالتا ہے اور یوں ایک سوانح حیات عالمِ وجود میں آجاتی ہے۔ اس کے برعکس ایک آپ بیتی کا مصنّف خود صاحبِ سوانح حیات ہی ہوتا ہے اور وہ اپنے قلم سے عمرِ رفتہ کی داستان خود قلم بند کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں آپ بیتی یا خود نوشت سوانح حیات وہ کتاب ہے جس کے اوراق میں انسان حیاتِ مستعار کے مختلف اَدوار کو بلا کسی تصنّع اور تکلّف کے دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے کہ اُس نے کن حالات میں اس جہانِ رنگ و بو میں آنکھیں کھولیں۔ کس طرح وہ طفلِ شیر خوار سے لڑکپن کی منزل میں داخل ہوا۔ اُس کا زمانۂ طالبِ علمی کیسے بسر ہوا۔ عروسِ شباب نے کیوں کر اُسے خوش آمدید کہا۔ زندگی میں کامرانیوں اور کامیابیوں نے کیسے اُس کا خیر مقدم کیا۔ اُن کے ساتھ ساتھ تلخیاں، محرومیاں اور ناکامیاں کیسے اُس کی راہ میں سنگ ہائے گراں بن کر حائل ہوئیں اور کس طرح وہ اِس گردابِ بلا سے اپنی کشتیٔ حیات کو بچاتا ہوا نکلا۔ زندگی میں کس کس قسم کے انسانوں سے اُس کا سابقہ پڑا اور اُن کے متعلق اُس کے خیالات اور احساسات

کیا ہیں۔ اُس زمانے کا طرزِ معاشرت اور رہن سہن کیسا تھا اور رسم و رواج کی کیا کیفیت تھی۔ غرض آپ بیتی کے رُوپ میں ایک دَور کی ہماہمی اور گہما گہمی پوری طرح جلوہ گر ہوتی ہے۔ چوں کہ خود نوشت سوانح حیات عموماً بڑے آدمی ترتیب دیتے ہیں اس لیے قدرتی طور پر وہ مستقبل میں اُبھرنے والی نسلوں کے لیے گراں بہا تجربات کا خزینہ اور بیش قیمت مشاہدات کا ایک سدا بہار گُلدستہ ہوتی ہیں۔

کسی مغربی دانش ور کا قول ہے کہ حقیقت افسانے سے کہیں زیادہ پُرکیف اور دل چسپ ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں اس حقیقت کا اظہار مرزا رُسوا مرحوم نے اپنے اس شعر میں یُوں کیا ہے:

نہ پوچھ نامۂ اعمال کی دل آویزی
تمام عمر کا قصہ لکھا ہوا پایا

ہر چند کہ اشارہ اس شعر میں حضرات کراماً کاتبین کے مرتبہ اعمال نامے کی جانب کیا گیا ہے، لیکن انسان اگر خود ہی اپنا اعمال نامہ ترتیب دے ڈالے تو فرشتوں کے لکھے ہوئے اعمال نامے سے کم دل چسپ اور دل آویز یقیناً وہ بھی نہ ہوگا۔ میں اسے اُردو زبان کی بدقسمتی ہی کہوں گا کہ اس زبان کی ہزارہا کتب کے انبار میں تلاش بسیار کے باوجود آپ بیتی کے عُنوان پر ہمیں کم و بیش اسّی نوّے کتابیں ہی مل سکیں گی۔ زیادہ کھینچ تان کر ہم اس تعداد میں اتنی ہی کتابوں کا اضافہ اور کر سکیں گے جو صحیح معنوں میں آپ بیتیاں تو نہ ہوں گی تاہم ہم اُن کو موضوع سے قریب تر ضرور پائیں گے اور ہماری انتخاب کردہ یہ کتابیں زیادہ تر یادداشتوں، ڈائریوں، روزنامچوں، رپورتاژوں، تزکوں اور سوانحی تذکروں پر مشتمل ہوں گی۔

چند دل چسپ اور قابلِ مطالعہ آپ بیتیاں

اب ہم اُن کتابوں کا ذکر کرتے ہیں جو صحیح معنوں میں آپ بیتیوں کی صف میں شامل ہیں۔ یہ کتابیں "ابقاالمنن بالقاالمحن" (نواب صدیق حسن خاں) "رسالہ سوانح عمری

(مولوی عبدالرحمٰن کلیانوی) "سوانح افسری" (نواب افسر الملک) "کارنامۂ سروری" (نواب سردر جنگ) "تذکرۂ وحیدی" (مولوی وحید الزماں) "یادگارِ غدر" (سید ظہیر الدین ظہیر دہلوی) "تزکِ سلطانی" (نواب سلطان جہاں بیگم) "آپ بیتی" (خواجہ حسن نظامی) "تذکرہ" (مولانا ابوالکلام آزاد) "آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی" (مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی) "لطیف کی کہانی" (مولوی عبداللطیف بجنوری) "من کیستم" (مرزا محمد عسکری) "میری کہانی میری زبانی" (ہمایوں مرزا) "میرا افسانہ" (چودھری افضل حق) "جمالِ امجد" (حضرت امجد حیدر آبادی)۔

"ایک معلم کی آپ بیتی" (عبدالغفار مدہولی) "اعمال نامہ" (سر سید رضا علی) "خوں بہا" (حکیم احمد شجاع) "میرا مذہب" (چودھری محمد علی ردولوی) "مشاہدات" (نواب ہوش یار جنگ) "عمرِ رفتہ" (خان بہادر نقی محمد خاں) "بہارِ زندگی" (مولوی فیروز الدین) "تذکرہ" (مفتی سید عبدالقیوم) "یادِ ایام" (نواب صاحب چھتاری) "یادِ ایام" (ضیاء الحسن ندوی) "یادِ ایام" (بریگیڈیئر گلزار احمد) "آتش کدہ" (جانباز مرزا) "مٹی کا دیا" (مرزا ادیب) "سرگزشت" (مولانا عبدالمجید سالک) "سرگزشت" (سید ذوالفقار علی بخاری) "سرگزشت" (مولوی سید لقا علی) "نقشِ حیات" (مولانا حسین احمد مدنی) "آپ بیتی" (مولانا عبدالماجد دریا بادی) "شاد کی کہانی شاد کی زبانی" (شاد عظیم آبادی) "میری دنیا" (ڈاکٹر سید اعجاز حسین) "یادوں کی دنیا" (ڈاکٹر یوسف حسین خاں) "نامۂ اعمال" (نواب سر محمد یامین خاں) "نقوشِ رفتہ" (عبدالرزاق فاضلی) "متاعِ زندگی" (سردار ابراہیم خاں) "حیاتِ ثنائی" (مولانا ثناء اللہ امرتسری) "حیاتِ نورالدین" (حکیم نور الدین بھیروی) "نقوشِ زندگی" (ابرار احمد) "یادوں کے جھروکے" (بیگم انور رضا) "یادوں کی بستی" (خان کفایت اللہ حافظ) "آہنگِ بازگشت" (مولوی محمد سعید) "کاروانِ حیات" (نواب مشتاق احمد خاں) "شاہراہِ پاکستان" (چودھری خلیق الزماں) "اپنی تلاش میں" (کلیم الدین احمد) "آئینۂ ایام" (کرنل غلام سرور) "کتابِ زندگی" (منشی عبدالرحمٰن خاں) "جہانِ دانش" (احسان دانش) "ہنگاموں میں زندگی" (مشتاق احمد وجدی) "پولیس افسر کی ڈائری" (دلاور حسین لودھی) "تحدیثِ نعمت" (سر ظفر اللہ خاں) "ما بدولت" (شوکت تھانوی) "آپ بیتی" (ظفر حسن ایبک) "آپ بیتی" (مولوی محمد امین زبیری) "میرے شب و روز"

(مرزا ضیاء الدین بیگ) "میری زندگی فسانہ" (صادق الخیری) "یادوں کی برات" (جوش ملیح آبادی) "حرفِ سرور" (زہرہ معین) "آپ بیتی رشید احمد صدیقی" (سید معین الرحمٰن) "ذکرِ یار چلے" (مرزا ظفر الحسن) "بے تیغ سپاہی" (نواب صدیق علی خاں) "تاثرات و مشاہدات" (شیخ عبداللہ علیگ) "میرے پچاس سال علی گڑھ میں" (میر ولایت حسین) "کتابِ زیست" (الحاج محمد زبیر) "کاروانِ زندگی" (مولانا ابو الحسن علی ندوی) "آہ وہ یادیں" (محمود بریلوی) "یہ باتیں ہیں جب کی" (فاضل مشہدی) "گردِ راہ" (اختر حسین رائے پوری) "یادوں کا جشن" (کنور مہندر سنگھ بیدی سحر) "غبارِ کارواں" (صالحہ عابد حسین) "میری داستانِ حیات" (غلام جیلانی برق) "میری داستان" (سید عبداللہ شاہ) "کچھ یادیں کچھ باتیں" (محمد اجمل رحیم) "شاخِ ہری اور پیلے پھول" (عالیہ امام) "شہاب نامہ" (قدرت اللہ شہاب) "مابدولت" (شوکت تھانوی) "ایک جرنیل کی سرگزشت" (میجر جنرل راؤ اُمراؤ خاں) "حیاتِ مستعار" (جلیل قدوائی) "نارستان" (محمد اکبر) "کچھ یادیں کچھ باتیں" (جی۔ الانا) "سلسلۂ روز و شب" (شیخ منظور الٰہی) "جونا گڑھ کے آخری ایام" (اشفاق نقوی) "روداد" (جنرل شیر علی خاں) "عشرتِ فانی" (عشرت رحمانی) "شام کی منڈیر سے" (وزیر آغا) "کھوئے ہوؤں کی جستجو" (شہرت بخاری) "میرا سیاسی سفر" (مخدوم زادہ حسن محمود) "رو میں ہے رخشِ عمر" (عبدالسلام خورشید) "جو میں نے دیکھا" (راؤ رشید) "اِدھر ہم اُدھر تم" (احمد رضا قصوری)

یہ کتابیں بھی آپ بیتیوں کی صف میں شامل ہیں

آپ بیتیوں کی اس محفل میں ایسی کتابوں کی شمولیت بھی ناگزیر ہو گی جو اُن کے مصنفین کی زندگی کے مربوط اور مسلسل حالات تو پیش نہیں کرتیں، تاہم اُن میں مصنفین کی زندگی کے متعدد واقعات یکجا ہو گئے اور کتاب محض اُنھی کی بنیاد پر عالمِ وجود میں آ گئی۔ اس ضمن میں ہم "فریادِ داغ" (مرزا داغ دہلوی) "حزنِ اختر" (نواب واجد علی شاہ) "قولِ ثمین" (حکیم مومن خاں مومن) "سرگزشتِ ایامِ غدر" (خان بہادر محمد عنایت) "ناقابلِ فراموش" (دیوان سنگھ مفتون) "تذکرہ غوثیہ" (غوث علی شاہ قلندر پانی پتی) "آپ بیتی" (ڈاکٹر میر محمد اسماعیل) "مشاہداتِ کابل و یاغستان" (مولوی محمد علی قصوری) "محمد علی: ذاتی ڈائری" (مولانا عبدالماجد دریابادی) "میرے زمانے کی دِلّی" (مُلّا واحدی) "دربار دُربار" (صدق جائسی)

"آشفتہ بیانی میری" (رشید احمد صدیقی) "میرے گزشتہ روز و شب" (جگن ناتھ آزاد) "لاہور کا جو ذکر کیا" (گوپال متل) "علی گڑھ کے چار سال" (محفوظ الحق حقی) "علی گڑھ سے علی گڑھ تک" (ڈاکٹر اطہر پرویز) "طالب علم کی ڈائری" (سید الطاف علی بریلوی) "پیشۂ وکالت" (سید محمد نبی ایڈووکیٹ) "نذیر احمد کی کہانی" (مرزا فرحت اللہ بیگ) "ناخن کا قرض" (مرزا ادیب) "ہمہ یاراں دوزخ" (کرنل صدیق سالک) "میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا" (کرنل صدیق سالک) اور "بجنگ آمد" (کرنل محمد خاں) کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

مقدمے اور دیباچے آپ بیتی کے رنگ میں

بعض خود نوشت سوانح حیات ایسی بھی ہیں جو مختلف کتابوں میں ضمنی طور پر یا مقدموں اور دیباچوں کی شکل میں موجود ہیں جیسے "سوز و ساز" (حضرت حفیظ جالندھری) "شعر و حکمت" (حکیم نیر واسطی) "زندان نامہ" (فیض احمد فیض) "صراط الحمید" (پروفیسر الیاس برنی) اور "نقوش شہاب" (سید مسعود حسن شہاب دہلوی) وغیرہ۔

چھوٹی چھوٹی آپ بیتیاں

"مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں" ایسی کتاب ہے جس میں نواب صدر یار جنگ، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا مفتی اعزاز علی، میاں بشیر احمد، علامہ عبدالعزیز میمن اور خواجہ غلام السیدین جیسے معروف اہل قلم کی مختصر آپ بیتیاں شامل ہیں۔ اس سلسلے میں ایک دوسری کتاب "شخصیات اور واقعات جن سے میں متاثر ہوا" کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے جو پروفیسر آل احمد سرور، سید سجاد ظہیر، ڈاکٹر محمد اشرف، خواجہ احمد عباس، حضرت نیاز فتح پوری، سید علی سردار جعفری، محترمہ عصمت چغتائی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے آپ بیتی قسم کے مضامین پر مشتمل ہے۔ دو اور کتابوں "شباب سے پہلے" اور "بڑوں کا بچپن" کا موضوع بھی اسی قسم کی مختصر آپ بیتیاں ہیں جن کا تعلق مشاہیر کے عہد طفلی سے ہے۔

فسادات، ۱۹۴۷ء: چند قابلِ ذکر آپ بیتیاں

چند آپ بیتیاں ایسی بھی نظر سے گزریں جو ۱۹۴۷ء کے فسادات سے متعلق ہیں۔ اس مرحلے پر "دِلّی کی بپتا" (شاہد احمد دہلوی) "پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اُردو" (باب ششم۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی داستانِ ہجرت) "دو ملک۔ ایک کہانی" (ابراہیم جلیس) "محشرستانِ ہند" (ایم اے باری) "جب بندھن ٹوٹے" (تاجور سامری) "چھٹا دریا" (فکر تونسوی) "سُرخ لکیر" (ماسٹر تاج الدین انصاری) "جب امرتسر جل رہا تھا" (خواجہ افتخار احمد) اور "وہ امرتسر تھا" (فرخ امرتسری) جیسی کتابوں کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔

قید و بند کی داستانیں

قید و بند کی داستانوں کا شمار بھی آپ بیتیوں میں کیا جا سکتا ہے اور اس موضوع پر ہمیں "کالا پانی" (مولانا محمد جعفر تھانیسری) "کالا پانی" (بھائی پرمانند ایم اے) "مشاہداتِ زنداں" (مولانا حسرت موہانی) "دُنیا میں دوزخ" (چودھری افضل حق) "قیدِ یاغستان" (میاں محمد اکرم) "جیل کے دن جیل کی راتیں" (ابراہیم جلیس) "کال کوٹھڑی" (حمید اختر) "اُس بستی میں" (عنایت اللہ) "سرگزشتِ زنداں" (پیر محمد قاسم سرحدی) "سرکاری مہمان خانہ" (ریاض الرحمٰن ساغر) "مکاتیبِ زنداں" (میاں طفیل محمد) "نقوشِ زنداں" (سید سجاد ظہیر) اور "تذکرۂ زنداں" (پروفیسر خورشید احمد) جیسی کتابیں دست یاب ہوتی ہیں۔

شکار کی کہانیاں

شکار کی کہانیوں کو بھی آپ بیتیوں سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ جناب جاوید شاہین کے "شیر شیر شیر"، "شیر آیا شیر آیا"، "رودر پریاگ کا آدم خور چیتا" اور "جنگل نامہ"، حکیم اقبال حسین صاحب کے "سیر و شکار" اور جناب مقبول جہانگیر کے "اناتی کے آدم خور" اور "ہو گرالی کا آدم خور" جیسے کامیاب ترجموں سے قطع نظر اِس صنفِ ادب میں "شکار" (نواب قطب جنگ

"آپ بیتی: شکار" (خان بہادر الحاج حکیم الدین) "خوف ناک دنیا" (ڈاکٹر سید محمد علی شاہ سبزواری) "آٹھ آدم خور شیر" (قمر نقوی) اور "سندربن کی ہول ناک راتیں" (شوکت ہاشمی) ایسی تصانیف بھی کچھ کم اہمیت کی حامل نہیں ہیں۔

انگریزی اور فارسی آپ بیتیوں کے اُردو ترجمے

جہاں تک مختلف زبانوں سے اُردو میں ترجمے کا تعلق ہے "تزکِ تیموری" (امیر تیمور) "تزکِ بابری" (بابر بادشاہ) "تزکِ جہانگیری" (شہنشاہ جہانگیر) "تزکِ ہٹلری" (ایڈولف ہٹلر) "ذکرِ میر" (میر تقی میر) "تلاشِ حق" (گاندھی جی) "مولانا محمد علی: آپ بیتی" (پروفیسر محمد سرور) "میری کہانی" (پنڈت جواہر لال نہرو) "اپنی کہانی" (ڈاکٹر راجندر پرشاد) "میری ڈائری" (شریمتی وجے لکشمی پنڈت) "چشم دید" (ملک سر فیروز خاں نون) "اپنے وطن کے لیے" (شاہ رضا شاہ پہلوی) اور "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" (سابق صدر محمد ایوب خاں) بلاشبہ دل کش اور پُر لطف آپ بیتیاں ہیں۔ یہاں میں سید ہاشم رضا صاحب کی آپ بیتی بزبانِ انگریزی کا بھی ذکر کرتا چلوں جس کا اُردو ترجمہ بڑی کامیابی سے عزیزم سید مشہود حسن رضوی نے کیا ہے اور روزنامہ "جنگ" کراچی میں دل چسپی کے ساتھ پڑھا گیا ہے اُمید ہے کہ سید صاحب کی یہ آپ بیتی بھی جلد ہی کتابی شکل میں اشاعت پزیر ہوگی۔

زیرِ طبع آپ بیتیاں

مستقبل قریب میں شائع ہونے والی آپ بیتیوں کے سلسلے میں آپ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی "رفت و بود"، حکیم محمد عبداللہ کی "مراحلِ حیات" اخلاق احمد دہلوی کی "یادوں کا سفر" اور اُن کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر سید عبداللہ، سید نظر زیدی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، مرزا علی اظہر برلاس، مرتضیٰ برلاس، اداکار کمال، فلم ڈائرکٹر ضیا سرحدی، جنرل اعظم خاں اور سردار شوکت حیات خاں کی آپ بیتیوں کا انتظار بھی فرما سکتے ہیں۔

علاوہ ازیں ملک کے نامور ادیب، محقق، انشائیہ نگار اور شاعر حضرت مُشفق خواجہ محترمہ قیصری بیگم کی شہرۂ آفاق آپ بیتی "کتابِ زندگی" کو جس کے کچھ حصے "اردونامہ" کراچی میں شائع ہو کر قارئین سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں، جلد ہی کتابی صورت دے رہے ہیں۔ وہ اپنے والدِ گرامی اور مشہور علمی شخصیت خواجہ عبدالوحید صاحب کی ڈائری کو بھی، جو بے حد دل چسپ ہوگی، شائع کرنے کی فکر میں ہیں۔

آپ بیتیوں کا مختصر تعارف

آپ بیتیوں کی یہ طویل فہرست آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ ہم آیندہ صفحات میں اُن میں سے چند آپ بیتیوں کا مختصر تعارف آپ سے کراتے ہیں اور اُن کے جستہ جستہ اقتباسات بھی پیش کرتے ہیں امید ہے کہ آپ اُن سے محظوظ ہوں گے۔

داستانِ غدر

"داستانِ غدر" سید ظہیرالدین حسین ظہیر دہلوی کی آپ بیتی ہے جو خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق دہلوی کے شاگرد اور دلّی کے آخری تاج دار بہادر شاہ ظفر کے دارغۂ ماہی مراتب تھے۔ چوں کہ مصنف خود ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ دار و گیر سے گزرے تھے، اِس لیے "داستانِ غدر" میں اُنھوں نے اپنی ۶۷ سالہ زندگی کی دل چسپ رُوداد کے ساتھ ساتھ اس انقلاب کی بہترین انداز میں رپورٹنگ کی ہے۔ ظہیر دہلوی نے ۱۸۵۷ء کے بعد اپنی عمر کے پچاس برس ریاست الور، ریاست جے پور، ریاست ٹونک اور ریاست حیدر آباد دکن میں گزارے اور وہاں جو کچھ اُن پر گزری اُسے بڑے پُر لطف طریقے سے سپردِ قلم کیا ہے۔

حضرت ظہیر دہلوی بہادر شاہ ظفر کے مشہور ہاتھی "مولا بخش" کے متعلق لکھتے ہیں کہ "مولا بخش ایک قدیمی ہاتھی معمر تھا اُس نے کئی بادشاہوں کی سواری دی تھی۔ اِس ہاتھی کی عادتیں بالکل انسان کی تھیں۔ قد و قامت میں ایسا بلند و بالا ہاتھی ہندستان کی سرزمین میں نہ تھا اور نہ اب ہے۔ یہ ہاتھی، بیٹھا ہوا اور ہاتھیوں کے قد کے برابر ہوتا تھا۔

خوب صورتی میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ دوازدہ ماہ مست رہتا تھا۔ کسی آدمی کو سوائے ایک خدمتی کے پاس نہ آنے دیتا تھا۔ جس دن بادشاہ کی سواری ہوتی تھی اُس سے ایک دن پیشتر شاہی چوب دار جا کر حکم سُنا دیتا تھا کہ میاں مولا بخش کل تمھاری نوکری ہے۔ ہُشیار ہو جاؤ، نہا دھو کر تیار رہو۔ بس اُسی وقت سے ہشیار ہیں۔ فیل بان تھان سے کھول کر جمنا میں لے گئے اور لے جا کر لٹا دیا اور جھانووں سے میل چھڑانا شروع کیا۔ پھر دوسری کروٹ لٹا کر دوسری طرف سے پاک صاف کر کے تھان پر لاتے۔ نقاش نے مستک پر نقش و نگار کھینچ دیے۔ وقتِ سواری گدیلہ کس کر کارخانے میں لے گئے۔ گہنا پہنایا، جھول ڈالی، عماری کسی، نقارخانے کی ڈیوڑھی پر لا کر استادہ کر دیا۔ برابر اور ہاتھیوں کی قطار کھڑی ہوئی۔ جس وقت ہوادار سواری میں بادشاہ نقارخانے کے دروازے سے برآمد ہوئے، چیخ مار کر تین سلام کیے اور خود ہی بیٹھ گیا۔ جس وقت تک بادشاہ سوار نہ ہو لیں اور خواص نہ بیٹھ جائیں، کیا مجال کہ جنبش کر جائے۔ جب بادشاہ سوار ہو لیے اور فوج دار نے اشارہ کیا فوراً استادہ ہو گیا۔ ایک خوبی اور بھی کہ وقتِ سواری دو کمانیں اُس کے دونوں کانوں میں پہنائی جاتی تھیں، دو ترکش نیزوں کے کانوں کے نیچے آویزاں کیے جاتے تھے اور بہت بڑی سپر فولادی مستک پر نصب کی جاتی تھی اور بہت بڑا حقہ چاندی کا مع چلم و چنبر نقرہ اس کے سر پر رکھا جاتا تھا۔ بادشاہ حقہ پیتے جاتے تھے اور سواری رواں ہوتی تھی۔ کیا مقدور کہ حقہ گرنے پائے۔ قصہ مختصر جب سواری سے فرصت پائی پھر ویسا ہی مست ہے جیسا تھا۔ یہ کمال اس ہاتھی کو حاصل تھا۔ جب فیل خانۂ شاہی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو مولا بخش نے دانہ پانی چھوڑ دیا۔ فیل بان نے جا کر سانڈرس صاحب کو اطلاع دی کہ ہاتھی نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے۔ سانڈرس صاحب کو باور نہ آیا۔ فیل بان کو گالیاں دیں اور کہا کہ ہم چل کر خود کھلوائیں گے۔ وہ پانچ رُپے کے لڈو اور کچوریاں ہمراہ لے کر ہاتھی کے تھان پر پہنچے اور ٹوکرا شبر ہی کا ہاتھی کے آگے رکھوا دیا۔ ہاتھی نے جھلا کر ٹوکرا کھینچ مارا اگر کسی آدمی کے لگتا تو کام تمام ہو جاتا۔ وہ ٹوکرا دُور جا گرا اور تمام شبر ہی بکھر گئی۔ سانڈرس بولے "ہاتھی باغی ہے اسے نیلام کر دو"

چناں چہ اُسی روز صدر بازار میں لاکر استادہ کیا اور نیلام کی بولی بولی۔ کوئی خریدار نہ ہوا۔ بنسی پنساری جس کی دکان کھاری باؤلی میں تھی اُس نے ڈھائی سو رُپے کی بولی دی۔ اسی بولی پر صاحب نے نیلام ختم کردیا۔ فیل بان نے ہاتھی سے کہا کہ لے بھائی تمام عمر تو تُو نے بادشاہوں کی نوکری کی، اب تقدیر پھوٹ گئی کہ ہلدی کی گرہ بیچنے والے کے دروازے پر چلنا پڑا۔ یہ سُنتے ہی ہاتھی کھڑے قد سے زمین پر گر پڑا اور جاں بحق ہوگیا۔

کالا پانی

مولانا محمد جعفر تھانیسری کی آپ بیتی "کالا پانی" آزادیٔ وطن کی جدوجہد کے موضوع پر ایک اہم کتاب ہے جسے محترم مصنف نے ۱۸۸۵ء کے لگ بھگ قیدِ فرنگ سے رہائی کے بعد تحریر فرمایا تھا۔ مولانا تھانیسری اُس جنگِ آزادی کے ایک جلیل القدر کردار ہیں جو متحدہ ہندستان میں انگریزی عروج و اقتدار کے خلاف پوری ایک صدی لڑی گئی تھی۔ اُنھوں نے اِس کتاب میں انگریز کے جبر و استبداد کی ایسی ناقابلِ فراموش اور زندۂ جاوید داستان بیان کی ہے جسے پڑھ کر ایک طرف فرنگی حاکموں کے ظلم و ستم کا صحیح اندازہ ہوتا ہے تو دوسری طرف مجاہدینِ حرّیت کی مظلومیت، بے کسی، ایثار اور اعلیٰ کردار کے واضح نقش و نگار نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔

متحدہ ہندستان کے گورنر جنرل لارڈ میو کا کالے پانی میں قتل برطانوی ہند کی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری وقوعے کے وقت وہیں موجود تھے۔ اس واقعے کی تفصیل "کالا پانی" میں اُنھی کی زبانی سُنیے: "لارڈ میو صاحب ۸ فروری ۱۸۷۲ء کو سات بجے صبح جزیرۂ انڈمان میں رونق افروز ہوئے۔ صدہا صاحب لوگ اور میم لارڈ صاحب کے ساتھ تھے۔ آٹھ بجے کے بعد گورنر جنرل صاحب مع چند ہمراہیاں خود جہاز سے اُتر کر جزیرۂ روس میں جو صدر مقام پورٹ بلیر کا ہے، شرف افروز ہوئے۔ اُترنے کے وقت لارڈ صاحب کے واسطے ۲۱ ضرب توپ سلامی ہوئی۔ اس وقت ہزاروں مرد عورت آزاد اور قیدی اس نظارے کے واسطے جزیرۂ روس پر حاضر تھے۔ لارڈ صاحب

ٹاپو میں اُترتے ہی بازار روس آئی لینڈ کی طرف متوجہ ہوئے اور اسکول و بازار و ہسپتال و بارک ہائے قیدیاں و بارک ہائے جنگی پلٹن کا ملاحظہ کر کے چیف کمشنر صاحب انڈمان کے بنگلے پر تشریف لے گئے اور وہاں ٹفن تناول فرما کر اور تھوڑا سا آرام کر کے گورا بارک کا ملاحظہ کیا اور پھر وائپر آئی لینڈ کو جہاں بدمعاش قیدی جیل میں رہتے ہیں، شرف افزا ہوئے، اور بعد ملاحظہ وائپر کے جزیرہ چاتھم کو واپس ہوئے۔ چاتھم میں پھرتے پھرتے یک بیک لارڈ صاحب کے دِل میں آیا کہ اِسی وقت ماؤنٹ ہریٹ پہاڑ کو بھی ملاحظہ کرنا چاہیے۔ پرائیویٹ سیکرٹری اور چیف کمشنر صاحب نے بوجہ غیر وقت ہو جانے کے ماؤنٹ ہریٹ کو جانے سے بہت اصرار سے اُن کو منع کیا لیکن لارڈ صاحب نے نہ مانا۔ یوں کہو کہ موت نے اُن کو نہ ماننے دیا اور چاتھم سے سوار ہو کر ہوپ ٹوپ میں جو زیر پائے کوہ ماؤنٹ ہریٹ کے آباد ہے، پہنچے۔ اس ٹاپو میں شیر علی نام ایک آفریدی قیدی مدّت دراز سے ایک چھری واسطے قتل کرنے کسی افسر اعلا کے تیار کر کے منتظر بیٹھا تھا۔ جب لارڈ صاحب کی کشتی ہوپ ٹاپ میں پہنچی تو شیر علی اپنی چھری ہمراہ لے کر آن پہنچا۔ ہوپ ٹوپ سے وہ لارڈ صاحب کے ہمراہ ہوا، مگر راستے میں کہیں اُس کا داؤ نہ چلا اور لارڈ صاحب بخیریت تمام پہاڑ پر پہنچ گئے۔ اب وقت غروب آفتاب کا آگیا تھا۔ لارڈ صاحب نے وہاں بیٹھ کر سمندر میں غروبِ آفتاب کا تماشا دیکھا اور فرمایا کہ ایسا خوب صورت نظّارہ مَیں نے اپنی ساری عمر میں کبھی نہیں دیکھا۔ جب اندھیرا ہو گیا تو مشعلوں کی روشنی میں نیچے اُترنے لگے۔ اُس وقت ایک مسلّح جماعت پولیس لارڈ صاحب کے چاروں طرف تھی اور چیف کمشنر اور پرائیویٹ سکرٹری لارڈ صاحب کے دائیں بائیں بدن سے بدن ملاتے چل رہے تھے اور دوسرے بیسیوں افسر اُن کے پیچھے پیچھے تھے۔ اُترائی میں بھی لارڈ صاحب بخیریت تمام ہوپ ٹوپ کے گھاٹ تک پہنچ گئے، مگر جب گھاٹ پر ایک گاڑی کے نزدیک جو وہاں اُس دن کھڑی ہوئی تھی، پہنچے تو چیف کمشنر صاحب لارڈ صاحب کی اجازت لے کر کسی ضرورت کے واسطے پیچھے کو ہٹ گئے اور لارڈ صاحب مع پرائیویٹ سیکرٹری آہستہ آہستہ چلے جاتے تھے۔ اُس وقت اس گاڑی کی آڑ میں ایک آدمی نے مثل شیر

کی کود کر لارڈ صاحب کو ڈو زخم کاری ایک چھری سے ایسے لگائے کہ لڑکھڑا کر لارڈ صاحب سمندر میں جا گرے۔ اس گڑبڑ میں مشعلیں بھی سب گُل ہو گئیں، مگر ایک دوسرے قیدی نے جرأت کر کے قاتل کو پکڑ لیا ورنہ وہ اور دو چار کو مار ڈالتا۔ لارڈ صاحب کو سمندر سے نکالا اور اُسی گاڑی پر لٹایا تو وہ ایک دو بات کر کے راہیٔ ملکِ بقا ہو گئے۔ جب قاتل سے پوچھا گیا کہ تم نے یہ کس واسطے کیا تو اُس نے کہا کہ مَیں نے یہ خدا کے حکم سے کیا ہے۔ پھر پوچھا کہ تمہارا کوئی شریک ہے تو جواب دیا کہ خدا میرا شریک ہے۔ بعد تحقیقات قاتل کو پھانسی کا حکم ہوا۔ یہ قاتل شیر علی نام ضلع پشاور کا ایک پہاڑی افغان تھا۔ اُس نے کہا کہ ۱۸۶۹ء سے میرا ارادہ تھا کہ کسی بڑے انگریز افسر کو ماروں گا' اس واسطے چند سال سے مَیں نے یہ چھرا تیار کر کے رکھا تھا۔ جب ۸ رفروری ۱۸۷۲ء کو لارڈ صاحب آئے اور اُن کی سلامی ہوئی تو مَیں نے دوبارہ اِس چھرے کو تیز کیا۔ مَیں تمام دن اس تاک میں رہا کہ مَیں کسی طرح اس ٹاپو میں پہنچوں جہاں لارڈ صاحب پھرتے ہوئے مجھ کو ملیں، مگر مجھ کو جانے کی رخصت نہ ملی۔ تقدیرِ شام کے وقت جب میں مایوس ہو گیا تھا' لارڈ صاحب کو میرے گھر لے آئی۔ مَیں پہاڑ پر بھی لارڈ صاحب کے ہمراہ گیا تھا اور ساتھ ہی واپس آیا، مگر جانے اور آنے میں اور پہاڑ کے اوپر کہیں مجھ کو ایسا موقع نہیں ملا۔ تب مَیں اِس گاڑی کی آڑ میں آ کر چھپ رہا۔ یہاں سے میری مرادِ دلی پوری ہو گئی۔ یہ شخص گو ضعیف الجثہ اور پست قد تھا، مگر بڑا شہ زور اور دلیر آدمی تھا۔ پھانسی چڑھنے کے وقت تک ہراساں نہیں ہوا، بلکہ پھانسی کے اوپر چڑھ کر اُس نے بآوازِ بلند قیدیوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ بھائیو! مَیں نے تمہارے دشمن کو مار ڈالا ہے اور تم گواہ رہو کہ مَیں مسلمان ہوں۔ پھر کلمہ پڑھنے لگا اور کلمہ پڑھتے پڑھتے ہی اس کی جان جسم سے پرواز کر گئی۔ یہ وقوعۂ قتل لارڈ صاحب کا ایک ایسے اُدنا قیدی کے ہاتھ سے ہونا ایک نمونہ قدرتِ الٰہی کا تھا' ورنہ کہاں گنگو تیلی اور کہاں راجہ بھوج"۔

آپ بیتی خواجہ حسن نظامیؒ

مصورِ فطرت خواجہ حسن نظامی مرحوم نے اپنی زندگی کے دلچسپ اور سبق آموز حالات

اپنی کتاب "آپ بیتی" کی شکل میں لکھے ہیں۔ کتاب کی خاص خوبی یہ ہے کہ خواجہ صاحب نے اس میں اپنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اپنی خامیوں کا بھی برملا اعتراف کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ "کھانے میں، پینے میں، رہنے سہنے، چلنے پھرنے میں مجھ کو قناعت مدد دیتی ہے۔ اگر بہت مکلف کھانا ملے، تب بھی خوشی سے کھا لیتا ہوں اور بہت معمولی ملے تب بھی بلا کسی تکلف کے خوش ہو کر کھاتا ہوں، مجھے یاد ہے اس مضمون کے لکھتے وقت، ۲۷ رمضان، ۱۳۳۷ ہجری کو مہمان زیادہ آ گئے اور کھانا کچھ نہ بچا تو میں نے روزے دار پکانے والوں کو دوبارہ پکانے کی تکلیف نہ دی اور سوکھی روٹی کے ٹکڑے پانی میں بھگو کر کھا لیے اور آرام سے پڑ کر سو گیا، حالانکہ ایک رات پہلے خواجہ بانو نے بہت مکلف کھانے کھلائے تھے۔ ایک دفعہ میں خان بہادر حضرت مولانا سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی کے ہاں مہمان تھا۔ جب اُن کے گھر میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ کوئی حادثہ ہو گیا ہے اور کھانا تیار ہونا دشوار معلوم ہوا۔ حضرت اکبر کچھ متردد تھے کہ کیا بندوبست کریں۔ میں نے کہا بازار سے دو پیسے کی روٹی اور ایک پیسے کے کباب منگا دیجیے، بس کافی ہے۔ اُنھوں نے ایسا ہی کیا اور میں نے خوشی خوشی اس سے بھوک کا پیٹ بھر دیا۔ لباس میں بھی میرا دل غنی رہتا ہے۔ جیسا بھی مل جائے پہن لیتا ہوں اور کسی وقت مجھے اچھے کپڑوں کی تمنا نہیں ہوتی۔ بیوی بچوں کو اس عید ۱۳۳۷ ہجری کے لیے نئی نئی جوتیاں اور نئے نئے جوڑے دو سو روپے سے زیادہ کے میں نے بنوا کر دیے، مگر اپنے لیے ایک پائی کا بھی کچھ نہیں بنوایا۔ وہی پُرانی جوتی ہے، وہی پرانے کپڑے ہیں اور وہی میرا مسرور دِل ہے۔ اس میں بخیلی و کنجوسی کچھ نہیں ہے، بلکہ دل کی ایک حالت ہے کہ وہ اپنی زیبائش و آسائش کا کبھی خیال نہیں کرتا اور یہی قناعت ہے جس کو میں خدا کے شکر کے ساتھ ایک اچھی خصلت سمجھتا ہوں۔ سواری موٹر ہو، لینڈو ہو، تانگا ہو، یکہ ہو، بیل گاڑی ہو، ٹھیلا ہو، سب مجھ کو برابر ہیں۔ پیدل بھی بے تکلف پانچ چھے کوس چلا جاتا ہوں اور عموماً درگاہ سے دہلی تک پیدل جانا ہوتا ہے۔"

خواجہ صاحب "آپ بیتی" کے ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ "مشرق کی غلامی

کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ مشرقی سلاطین و اُمرا اپنا کام اپنے ہاتھ سے نہیں کرتے اور دوسروں پر ہر چیز کا حصر کرتے ہیں۔ مَیں نے ابتدا سے آں حضرت صلعم کی سُنّت کا خیال کر کے اپنے ہر کام کو اپنے ہی ہاتھ سے کیا، کیوں کہ آں حضرتؐ اپنے سب کام خود اپنے دستِ مبارک سے کرتے تھے اور باوجود اُمّت کے بے شمار خدام کے، کسی پر اپنا بوجھ نہ ڈالتے تھے۔ ذاتی تجربے سے مشاہدہ ہوا کہ "آپ کام مہا کام" مثل بالکل سچی ہے۔ میری ہر کام یابی کا ایک راز یہی ہے کہ مَیں اپنے سب کام خود کرتا ہوں اور جب تک دوسروں کے کام پر خود ایک نظر نہ ڈال لوں مجھ کو اطمینان نہیں ہوتا۔ مَیں عام پیروں کی طرح سفر میں مُریدوں کو یا بڑے آدمیوں کی طرح نوکروں کو ساتھ نہیں رکھتا اور اگر گھر والے میری حالت یا کسی اور خطرے کے خیال سے نوکر کو میرے ساتھ کر دیں تو خود مجھ کو نوکر کی خدمت کرنی پڑتی ہے، کیوں کہ مجھے اپنی ذات کی آسائش سے زیادہ اپنے رفیق کا خیال رہتا ہے۔ نوکر صاحب کے پاس جا کر کھانا دیتا ہوں اور اُن کی اچھی اور آرام کی جگہ کا فکر ہر وقت بے چین رکھتا ہے۔ اپنا بچھونا سفر کے زمانے میں خود بچھانا، خود تہہ کرنا مجھ کو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مُریدوں سے وضو کرانے کی مجھ کو بالکل عادت نہیں ہے اور جہاں کہیں ایسا پیش آئے تو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ پاؤں دبوانے کی عادت، البتہ مجھ کو ہے، مگر اب اس کو بھی رفتہ رفتہ ترک کر رہا ہوں۔ دوسروں کا کام کرنے میں جو لذّت مجھ کو آتی ہے، دوسروں سے اپنا کام کرانے میں نہیں آتی، خدمت کرانے میں نہیں آتی۔ خدمت کر کے مخدوم بننے کی حرص و ہوس مجھ کو نہیں ہے، بلکہ یہ ایک طرح کی عادت ہو گئی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مَیں ہر وقت مستعد رہتا ہوں۔ ایک دفعہ رسالہ "نظام المشائخ" تیار تھا اور ملازم موجود نہ تھا جو ڈاک خانے لے جاتا۔ ڈاک کا وقت جا رہا تھا۔ مَیں نے خود وہ بہت بھاری بوجھ اُٹھا لیا اور واحدی صاحب کی مخالفتِ شدید کے باوجود خود لے جا کر ڈاک خانے میں پہنچا دیا۔"

اپنی کہانی

اُنیسویں صدی کے آخر میں متحدہ ہندوستان میں گو مسلمانوں کی حکومت کو ختم

ہوئے نصف صدی کے قریب زمانہ گزر چکا تھا، تاہم ملک میں اُردو اور فارسی کا دَور دَورہ تھا اور ہندو اُس وقت تک مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت سے پوری طرح متاثر تھے۔

ابھی نہ آریہ سماج کے فتنے نے سر اُٹھایا تھا اور نہ مسٹر میکڈانل، بدنام زمانہ لیفٹیننٹ گورنر یو۔ پی کی ہندی زبان کے احیا کی مہم جاری ہوئی تھی۔ بھارت کے سابق صدر بابو راجندر پرشاد جو اُس زمانے میں پیدا ہوتے تھے، اپنی خود نوشت سرگزشتِ حیات "اپنی کہانی" میں اپنی تعلیم حاصل کرنے کا حال اِس طرح بیان فرماتے ہیں:

"پانچویں یا چھٹے سال میں میری تعلیم شروع ہوئی۔ اُس زمانے کی مروجہ رسم کے مطابق بسم اللہ مولوی صاحب نے کرائی تھی۔ جس دن تعلیم شروع ہوئی، شیرینی بانٹی گئی اور مولوی صاحب کو رُپے بھی دیے گئے۔ ہم تین طالب علم اُن کے سپرد کیے گئے۔ ایک مَیں اور دو میرے چچیرے بھائی۔ کوئی سات آٹھ مہینوں کے بعد مولوی صاحب چلے گئے، ہم لوگ خاصی فارسی سیکھ چکے تھے اور کریما (پند نامۂ سعدی) پڑھنے لگے تھے۔ پھر دوسرے مولوی صاحب بُلائے گئے جو بہت متین تھے اور اچھا پڑھاتے بھی تھے۔ وہ بھی دو برسوں تک رہے اور کریما، مامقیماں، خالق باری، دستور الصبیان، گلستاں اور بوستاں اُنھوں نے ہی ہم کو پڑھائی۔ پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ خوب سویرے ہم لوگ اُٹھ کر مکتب چلے جاتے۔ یہ ایک کوٹھڑی تھی جس میں مولوی صاحب رہا کرتے اور سامنے دالان میں تخت پر بیٹھ کر ہم لوگ پڑھا کرتے۔ سویرے آکر پہلے کا پڑھا ہوا سبق ایک بار پکّا کرنا پڑتا اور جو جتنا جلد پکّا کر لیتا اُس کو اُتنی ہی جلدی نیا سبق پڑھا دیا جاتا۔ مَیں اکثر اپنے دونوں ساتھیوں سے پہلے مکتب پہنچ جاتا اور پچھلا سبق پکّا کر کے آگے کا سبق لے لیا کرتا۔ یہ کرتے کرتے سورج نکلنے کا وقت ہو جاتا۔ تب نوکر آتا اور مَیں اُس کے ہمراہ ناشتے کے لیے گھر چلا جاتا۔ ناشتہ کر کے لوٹنے پر سبق یاد کرنا پڑتا اور سبق یاد کرنے کے بعد تختی پر لکھنا ہوتا اور جب تختی بھر جاتی تو اُسے دھونا پڑتا۔ دوپہر کو نہانے اور کھانے کے لیے ایک ڈیڑھ گھنٹے کی چھٹی ملتی۔ دوپہر کے بعد دوسرا سبق ملتا اور اس کو یاد کر کے سُنانے کے بعد کھیلنے کے لیے چھٹی ملتی۔ شام کو چراغ جلے پھر کتاب کھول کر پڑھنے کے لیے بیٹھنا

پڑتا۔ دِن کے دونوں سبق یاد کر کے پھر سُنانے پڑتے۔ اب کتاب بند کرتے اور قاعدے کے مطابق مولوی صاحب کو آداب عرض کر کے گھر جا کے سو جاتے۔

چشم دید

پاکستان کے سابق وزیر اعظم اور ہمارے بزرگ سیاستدان ملک فیروز خاں نون کی آپ بیتی FROM MEMORY محتاجِ تعارف نہیں۔ مقامِ مسرت ہے کہ پچھلے دنوں اس کا اُردو ترجمہ "چشم دید" بھی منظرِ عام پر آگیا ہے۔ اُن کی یہ آپ بیتی بلاشبہ پُر لطف ہے اور اُن کے مشاہداتِ زندگی بہت ہی پُر اثر اور دل کش ہیں۔ دُعا اور مقبولیت کے موضوع پر اُن کا یہ واقعہ ملاحظہ فرمایئے۔ وہ رقم طراز ہیں کہ "یہ اکتوبر ۱۹۳۸ء کا ذکر ہے میں اُن دنوں لندن میں ہندوستان کا ڈپٹی ہائی کمشنر تھا۔ میں رخصت لے کر بچوں کو چھوڑنے آرہا تھا۔ بحری جہاز کا سفر تھا۔ میرا سب سے چھوٹا لڑکا منظور اُس وقت ڈھائی سال کا تھا۔ منظور راستے میں بیمار ہوگیا۔ اُسے نمونیا ہوگیا تھا۔ عدن سے بمبئی کے سفر میں اُس کی بیماری نازک صورتِ حال اختیار کر گئی اور جہاز کے ڈاکٹر نے اُس کی زندگی سے مایوسی کا اظہار کر دیا تھا۔ شاید سلفا کی گولیاں کچھ فائدہ دیتیں، مگر وہ ختم ہوگئی تھیں۔ میں اُس وقت سخت گھبرایا ہوا تھا۔ بچّہ بسترِ مرگ پر تھا۔ اُس کی ماں اس تصوّر ہی سے کانپ اُٹھتی تھی کہ موت کے بعد اُسے سمندر میں اُتار دیا جائے گا۔ مجھے معلوم تھا کہ انتہائی عاجزی کی دُعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ میں اپنے کیبن میں گیا اور مُصلّےٰ بچھا کر حضورِ خداوندی میں سجدہ ریز ہوگیا۔ "میرے اللہ! تو زندگی اور موت کا مالک ہے تیری مشیّت کے سامنے کسی کو دم مارنے کی جرأت نہیں ہو سکتی مگر اے اللہ العالمین! میں اس بچّے کے لیے کچھ مہلت مانگتا ہوں۔ تیرے خزانوں میں کیا کمی ہے اور تو جواد اور رحم و کرم کرے تو اس کی بیماری بھی ختم ہو سکتی ہے اور یہ بمبئی پہنچتے پہنچتے موت کی بجائے زندگی سے ہم کنار ہو سکتا ہے"۔ میری آنکھوں سے بے انتہا آنسو بہہ رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد میں نے سر اُٹھایا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری دُعا قبول ہوگئی ہو۔ کیبن سے باہر نکلا تو ایک نوجوان میری طرف آرہا تھا۔ اُس نے کہا "میں رائے بہادر ڈاکٹر

متھراداس کالڑکا ہوں۔ لندن سے اِسی جہاز میں سفر کر رہا ہوں۔ والد صاحب نے کہا تھا کہ آپ کے پاس سلام کے لیے ضرور جاؤں، مگر بھول گیا۔ اب اچانک بیٹھے بیٹھے آپ کا خیال آیا تو مَیں آپ سے ملنے چلا آیا۔" مَیں نے بچّے کی شدید بیماری کا ذکر کیا تو وہ بولا کہ "میرے پاس سامان میں شاید کہیں سلفا کی گولیاں ہیں۔ ٹھہریے مَیں ابھی تلاش کرتا ہوں"۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سلفا کی گولیاں لے کر آگیا۔ جہاز کے ڈاکٹر کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔ دوا دیتے ہی منظور کی بیماری میں افاقہ شروع ہوگیا۔ وہ بچ گیا اور بمبئی پہنچتے پہنچتے وہ بالکل تندرست ہو گیا۔ منظور اب آکسفورڈ سے سول لا کی ڈگری لے کر مشرقی پاکستان میں کام کر رہا ہے اور بہت اچھی صحت کا مالک ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ سب کچھ کسی روحانی طاقت اور تائیدِ ایزدی سے ہوا۔ میری دُعا قبول ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر متھراداس کے لڑکے کے پاس دَوا موجود تھی اور کسی غیبی طاقت نے اُسے جھنجھوڑ کر مجھے ملنے کو کہا تھا۔ وہ خود کہہ رہا تھا کہ پتا نہیں مجھے بیٹھے بیٹھے یوں محسوس ہوا کہ مجھے فوراً آپ سے ملنے کے لیے آنا چاہیے۔ چناں چہ میں اُسی دم آپ کے پاس پہنچ گیا۔

عمرِ رفتہ

جنگِ عظیم اوّل کے اختتام پر متحدہ ہندوستان میں گرانی کی جس لہر نے سر اٹھایا تھا وہ آخر کار سرنگوں ہو کر رہ گئی حتیٰ کہ ۱۹۳۹ء کے آخر میں جب جنگِ عظیم ثانی چھڑی ملک میں ارزانی کا دور دورہ تھا عام لوگوں کے پاس اگرچہ رُوپیہ زیادہ نہ تھا، لیکن وہ خوش حال اور مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔ اِس سے پیشتر بھی مختلف مواقع پر ملک میں گرانی نمودار ہوتی تھی، لیکن یہ عارضی ثابت ہوتی تھی اور حالات جلد ہی معمول پر آجاتے تھے، لیکن بُرا ہو جنگِ عظیم ثانی کا کہ اس کے خاتمے کے بعد مہنگائی بڑھتی ہی چلی گئی اور مدّتِ مدید کے بعد آج بھی وہی عالم ہے۔

خان بہادر نشی محمد خاں خورجوی ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ پولیس جو ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے تھے اُس زمانے کی ارزانی کے متعلق اپنی آپ بیتی "عمرِ رفتہ" میں لکھتے ہیں کہ

ارزانی کا یہ عالم تھا کہ راج کی مزدوری چار چھے آنے اور مزدور کی چھے پیسے، غلہ ایک رُوپیہ من اور گھی ایک رُپے کا ڈھائی سیر آتا تھا۔ کھانا پکانے والے کی تنخواہ ایک دو رُپے ماہوار اور کھانا ہوتی تھی۔ اسی لحاظ سے کپڑا اور دیگر اجناس ارزاں تھیں۔ بوجہ ارزانی پیسے کی قیمت زیادہ تھی اس لیے پیسے کو کوڑیوں میں تقسیم کیا گیا تھا، یعنی اُدھی، دمڑی، چھدام، کنڈا، دھیلا، پون پیسہ اور اس کے بعد پیسہ ہوتا تھا۔ عام طور پر لباس میں سادگی تھی کرتا، انگرکھا، پاجامہ اور صافہ عام شریفوں کا لباس تھا۔ نری کے چمڑے کی سلیم شاہی جوتی یا کچے چمڑے کی اُدھوڑی چوڑے پنجے کی جُوتی کی قیمت ایک ڈیڑھ رُپے تھی جو سال بھر کام دیتی تھی۔"

سچ فرمایا خان بہادر صاحب نے، کیا مبارک زمانہ تھا۔ گندم رُپے کی بیس سیر اور گھی ڈیڑھ سیر تو ۱۹۳۶ء میں ہم نے بھی بکتا دیکھا۔ ولایت کا بہترین لٹھا ڈی ون پانچ آنے گز، نفیس شرٹنگ تین چار آنے گز اور تین سو چھہتر کی اعلا ململ کا بھاؤ ڈھائی آنے گز تھا۔ دودھ ایک آنے سیر، گوشت چار آنے سیر اور بکری دو رُپے میں مل جاتی تھی۔ فلیکس کاکان پور کا بنا ہوا بُوٹ تین چار رُپے میں فروخت ہوتا تھا جو خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ پائیدار اور مضبوط اس قدر ہوتا تھا کہ کم و بیش تین چار سال چلتا تھا۔ کاش ہم اُس زمانے کو پھر بلا سکتے۔

مشاہدات

"بادشاہوں، والیانِ ملک، رئیسوں اور امیروں کی زندگی ہم عوام اور سفید پوشوں سے اتنی الگ ہے کہ ہمیں اس کا پورا پورا اندازہ بھی نہیں ہو سکتا اور جب کبھی اس کی ہلکی سی جھلک بھی اتفاق سے نظر آجاتی ہے تو ہم دنگ اور حیران رہ جاتے ہیں۔ وہ شاہانہ یا نیم شاہانہ زندگی اخلاقی اعتبار سے کس درجے پست اور بہیمانہ ہوتی ہے، یہ سوال الگ ہے۔ یہاں ذکر صرف اس کا ہے کہ وہ ہم سے دُور، الگ اور بے گانہ کتنی ہے۔ ان امرا کا کھانا پینا، رہنا سہنا، اُن کے شوق اور دل چسپیاں، اُن کے عیش منانے کے طریقے،

اُن کے ہاں ولادت اور موت کی رسمیں، اُن کی بخشش اور فیاضیاں، اُن کے جور و ستم اور جلّادیاں، اُن کی عبادتیں، اُن کی ضیافتیں، اُن کے صبح و شام، غرض اُن کی زندگی کے چھوٹے بڑے سارے ہی شعبے ہم عامۃ الناس کے لیے اعجوبہ ہی کا حکم رکھتے ہیں۔ ہم دیکھیں تو حیرت کریں اور سنیں تو یقین کرنے پر طبیعت آمادہ نہ ہو۔"

مولانا عبدالماجد دریابادی کی مندرجہ بالا عبارت کی تصدیق میں اب ہم نواب حامد علی خاں والئ ریاست رام پور کے متعلق نواب ہوش یار جنگ کی آپ بیتی "مشاہدات" کا یہ اقتباس پیش کرتے ہیں:

"مَیں نے اپنے دس سالہ قیام میں دو وائسرایوں کو آتے دیکھا۔ ڈیوک آف کناٹ کا بھی خیر مقدم دیکھا۔ والیانِ ملک میں پٹیالہ، گوالیار، بیکانیر، الور اور کپور تھلہ کے مہاراجوں کی بھی خاطر مدارات دیکھی۔ سب سے ہی بھائی چارہ تھا آپس میں تعلقات بہت خوش گوار اور برادرانہ تھے۔ مہاراجہ بیکانیر سوٴر کا شکار رام پور کے جنگلوں میں کھیل رہے ہیں جنگل میں منگل ہو رہا ہے۔ تمام راحت کے سامان شکار گاہ میں موجود ہیں۔ ہفتوں سیر و شکار ہو رہا ہے اور کھانا پینا، گانا بجانا اور ہر قسم کے تکلفات سے مہمان کو خوش رکھا جا رہا ہے۔ ان مہمان داریوں پر لاکھوں رُپے صَرف کر دیے جاتے تھے۔ ایسی خوش سلیقگی سے انتظام کیا جاتا تھا کہ مَیں نے کسی دوسری ریاست میں نہیں دیکھا۔ ایک ایک بینکوئٹ BANQUET میں سات سات اور آٹھ آٹھ سو مہمان ہوتے تھے اور کھانوں کا مینو MENU اس قدر لمبا ہوتا تھا، اقسام اس قدر ہوتے تھے اور سب کھانے اس قدر لذیذ ہوتے تھے کہ ہندوستانی مہمان تو انگلیاں چاٹتے رہ جاتے تھے اور یورپین مہمان کانٹے چمچوں پر اپنی زبان سے پالش کر دیتے تھے۔ ترکی مہمانوں نے یہاں کے کھانے کھا کھا کر ترکی تمام کر دی۔ ایرانیوں نے اپنے چلاؤ کی رکابیاں ہٹا دیں اور یورپینوں نے تو اپنے اُبلے کھانے پھینک دیے۔ کھاتے کھاتے سب تھک جاتے تھے اور معدہ بھی جواب دے دیتا تھا، مگر جی نہ بھرتا تھا ہز ہائی نس معزز سے معزز مہمانوں سے بھی اصرار کرتے تھے کہ یہ کھائیے اور وہ کھائیے۔ بیرونِ ملک کے مہمانوں کو یہ کھانے اس لیے بھی پسند آتے تھے کہ اِن کھانوں

میں نہ سُرخ مرچ ڈالی جاتی تھی اور نہ سیاہ مرچ، اُن کے باورچی خانے میں اِن دونوں مرچوں کا کبھی گزر ہی نہ ہوا تھا اور نہ اُن کی صورتیں رکاب داروں کے تصوّر میں تھیں۔ تقریباً ڈیڑھ سو رکاب دار ملازم تھے اور ہر رکاب دار ایک ہی چیز پکاتا تھا جس میں وہ ایسا ماہر ہوتا تھا کہ اُس کے ہاتھوں کی سبک حرکت، ہلکی اور تیز آنچ کا اندازہ اور سامان اور مسالوں کی مقدار اِن کھانوں کو فردوسی کھانے بنا دیتی تھیں۔"

"نفاست پسندی میں ہز ہائی نس کا جواب مشکل سے نکل سکے گا۔ صرف ایک مرتبہ رُومال سے منہ پونچھتے تھے، دوسری مرتبہ صاف رومال پیش ہوتا تھا اور بیداری سے خواب تک سیکڑوں رومال اِسی طرح آتے جاتے رہتے تھے۔ یورپ و امریکا کی سیاحت کر چکے تھے۔ سوٹ بوٹ پہن چکے تھے، مگر مسٹر میکڈانل لیفٹیننٹ گورنر یو پی سے کسی بات پر جو اختلاف ہوا تو لاکھوں رُپے کا انگریزی لباس وقتِ واحد میں جلا دیا اور اُس روز سے چُوڑی دار پاجامہ، ململ کا کرتہ اور مخمل اور جاپانی سلک کے کوٹ گھر میں پہنتے تھے لیکن باہر پیرس کے بنے ہوئے بہترین کپڑوں کی شیروانیاں زیبِ جسم رہا کرتی تھیں۔ ایک ایک شیروانی پر دو دو تین تین ہزار سے کم لاگت نہ آتی تھی۔ کار چوبی ٹوپی سر پر اور کارچوبی سلیپر پاؤں میں رہتی تھیں۔ یہ سلیپر اور ٹوپی ایک ماہ سے زیادہ استعمال نہ کی جاتی تھی۔ فرش پر چلتے پھرتے تھے جس کی وجہ سے سلیپر کا تلا بھی میلا نہ ہوتا تھا۔ یہ اُتری ہوئی ٹوپیاں اور سلیپر خدمت گاروں کا حق ہوتی تھیں۔"

"پیروں کے ناخن اپنے ہاتھوں سے کاٹتے تھے اور ناخنوں کو احتیاط سے رکھتے تھے۔ کیوں کہ یہ وہم تھا کہ ناخنوں پر جادو کیا جاتا ہے۔ حجّام ڈاڑھی بناتا تھا، قلم کاٹنا کوہ کنی کی مصیبت سے کم نہ تھا۔ حجّام کی موت سامنے منڈلاتی رہتی تھی۔ تھپّڑ کھاتا تھا، سخت سُست سُنتا تھا، مگر کیا مجال کہ ہاتھ ہل جائے اور اُسترہ چہرے کے کسی حصّے کو چرکا دے سکے۔ مونچھوں میں بھی کافی تراش خراش کی جاتی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ اوپر کے ہونٹ پر عمّاد نے ایک نستعلیق خط کھینچ دیا ہے۔ رات کے کھانے کے بعد بجلی کی بہت تیز روشنی میں اکثر حجامت بنتی تھی۔"

"پانی تو وہ ایک قطرہ بھی کہیں نہ پی سکتے تھے۔ برشگال کے موسم میں پانی جمع کیا جاتا تھا جو سال بھر فلٹر کر کے اور چاندی کی صراحیوں میں برف لگا کے پیا جاتا تھا۔ ہمیشہ پتے کے کڑکڑاتے جاڑے میں تربوز کا شربت برف میں لگا کے پیتے تھے اور جب قربی صراحی میں کچھ بچ جاتا تھا تو ان کو اُن کو دے دیا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ مجھ پر بھی یہ نوازش کی گئی تو میں نے عرض کیا کہ تعمیلِ حکم تو بسر و چشم کی جائے گی، مگر مرنے سے پہلے اس کی تمنا ضرور ہے کہ تجہیز و تکفین کا انتظام دیکھ لوں، غسالوں کو پانی سموتا اور بیری کے پتے ڈالتا دیکھ لوں اور اپنے رونے والوں کو بھی آنسو بہاتا دیکھ لوں، کیوں کہ میرا دل میرے کانوں تک اپنی دھیمی آواز پہنچا رہا ہے کہ اِدھر میں شربت کی لطافت میں ڈوبا اور اُدھر یہ صدائے بے اختیار نکلی کہ ع

ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

جس پر بہت قہقہہ لگایا اور گلاس محمد علی خاں کو دے دینے کے لیے ارشاد فرمایا وہ فوجی کرنل اور رام پوری کچا پٹھان بلا کسی توقف کے غٹ غٹ ڈکار گیا اور میں موت کو ٹلتا ہوا دیکھ کر اطمینان کی سانس لینے لگا۔"

"پان دان سے پان خود بنا کر کھاتے تھے ایک مکمل پان بنا کر رومال کے ایک کونے میں باندھ لیتے تھے اور دوسرا کھا لیتے تھے۔ بندھا ہوا پان کبھی کسی کو اور کبھی کسی کو عنایت ہوتا تھا اور اُس میں اس قدر مسالے ہوتے تھے کہ اگر کھانے والا پیک نگل جائے اور وہ ایسے معجونی پان کا عادی نہ ہو تو تھوڑی دیر تک بے ہوشی کے عالم میں اس دُنیا سے غافل رہنا مقدر تھا۔"

دَربارِ دُربار

والیانِ ریاست کے مصاحبین اور مقربین کے اخلاق اور کردار کا کیا عالم تھا۔ اُس کی دل چسپ جھلک حضرت صدق جائسی نے اپنی باغ و بہار خود نوشت داستانِ حیات "دَربارِ دُربار" میں دکھائی ہے۔ صدق جائسی صاحب، فانی، جگر، اور جوش کے پائے

کے شاعر ہیں، مگر "دربارِ دُربار" میں انھوں نے نثر نگاری اور واقعات نویسی کا جو کمال دکھایا ہے اُس نے اُن کی شاعری کو بھی پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ اب صدق صاحب کے الفاظ میں اصل موضوع پر یہ پُر لطف واقعہ ملاحظہ فرمایئے۔ صدق صاحب فرماتے ہیں کہ عتابِ شاہی کی صورت یہ ہوتی تھی کہ پرنس (معظم جاہ) کی فضول خرچیوں پر بندگانِ عالی (اعلا حضرت نواب میر عثمان علی خاں نظام دکن) اپنی جگہ بہت کچھ اظہارِ برہمی فرماتے تھے۔ اس کے بعد نواب ہوش یار جنگ (مصاحب خاص) کو حکم ہوتا تھا کہ تم جاؤ اور اُس (پرنس) سے جا کر یہ اور یہ کہہ آؤ، خبردار! کسی بات کو نرم کر کے نہ کہنا۔ ہوش یار جنگ عرض کرتے "فدوی کی کیا مجال کہ شاہی احکام میں اپنی طرف سے کمی یا بیشی کرے۔ خانہ زاد ارشادِ عالی کو حرف بہ حرف عرض کر دے گا۔" یہ کہہ کر پرنس کی خدمت میں حاضر ہوتے اور چُپکے سے عرض کرتے کہ مجھے بندگانِ عالی نے سرکار کی خدمت میں بھیجا ہے۔ فوراً تخلیہ ہو جاتا اور ہوش بہ کمالِ ادب نہایت نرم الفاظ میں اصل معاملہ بیان کر کے صرف اتنا کہتے کہ بندگانِ عالی نہایت برہم ہیں۔ پرنس اپنی ذہانت سے سب کچھ سمجھ جاتے، مگر ہوش سے ہنس کر فرماتے "اچھا ہوش! تمھی انصاف سے کہو، کیا میں یورپ جا کر اتنی شاپنگ بھی نہ کرتا۔" ہوش عرض کرتے "سرکار اتنی شاپنگ تو فدوی کی رائے میں نہایت ضروری تھی، اگر آپ روپے کا منھ دیکھتے تو لندن و پیرس میں آپ کے شاہی وقار کو صدمہ نہ پہنچ جاتا۔" پرنس خوش ہو کر فرماتے "تم بات کی تہہ کو پہنچ گئے، سمجھ دار آدمی ہو۔" ہوش اُٹھ کر آداب بجا لاتے۔ پرنس خدمت گار کو حکم دیتے۔ "دیکھو فلاں شخص سے کہو کہ ہمارے اُن صندوقوں میں سے جو یورپ سے ہمارے ساتھ آئے ہیں یہ یہ چیزیں نکال کر لاتے۔" پانچ منٹ کے اندر خادمِ خاص وہ چیزیں چاندی کی خوب صورت کشتی میں سجا کر ملاحظے میں پیش کرتا۔ پرنس ہنس کر فرماتے۔ "ہوش کے لیے یہ میری طرف سے حقیر تحائف ہیں۔" ہوش ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے اور اس سرفرازی پر سات فرشی سلام کرتے۔ وقتِ رخصت عرض کرتے "میں بندگانِ حضور سے موقع دیکھ کر ضرور عرض کروں گا کہ سرکار اتنی شاپنگ تو شاہی وقار قائم رکھنے کے لیے نہایت ضروری تھی۔ لندن اور پیرس کے سوداگروں میں برسوں پرنس

کی اس شاپنگ کا ذکر رہے گا اور وہ اس بات پر فخر کریں گے کہ فلاں سن میں دکن کا ایک شہزادہ ہماری دکان پر آیا تھا۔ موٹر پر بیٹھے تو ہوش کی باچھیں کھلی جاتی تھیں جو تحائف پرنس کی سرکار سے عطا ہوئے تھے وہ کم و بیش دو ہزار کی مالیت سے کیا کم ہوں گے۔ سیدھے گھر پہنچے تحائف پر مسرت و انبساط کی ایک نظر ڈالی پھر انھیں بہ احتیاط صندوق میں مقفل کر کے اعلا حضرت کی خدمت میں پہنچے۔ سرکار غیظ و غضب کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔ مصاحبوں اور نیقوں میں لب کشائی کی طاقت نہ تھی۔ ہوش کو دیکھ کر دریافت فرمایا "تم نے معظم جاہ سے میرا پیغام حرف بہ حرف کہہ دیا تھا"۔

ہوش: (ہاتھ جوڑ کر اور جھک کر) خانہ زاد نے حضور پر نور کے ارشاداتِ عالیہ بے پس و پیش پرنس کے رُو بہ رُو حرف بہ حرف دوہرا دیے۔

سرکار: پھر کیا حال ہوا اس کا؟

ہوش: ندامت اور شرمندگی سے پرنس سر نہ اٹھا سکے۔ چپ چاپ بیٹھے سُنا کیے۔ چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا اور آخر آخر میں تو سرکار شہزادہ والاشان کا چہرہ ایسا زرد پڑ گیا کہ خانہ زاد سے دیکھا نہ جاتا تھا۔ فدوی نے وہاں ٹھیرنا مناسب نہ جانا اور فوراً خدمتِ اقدس میں حاضر ہو گیا۔

سرکار: (بلند آواز) ہوں!

منظور جنگ: (ہاتھ جوڑ کر) سرکار غلام کی رائے میں اتنی تادیب بہت ہے۔

شہید یار جنگ: غلام کا خیال ہے کہ پرنس آیندہ اس طرح کی فضول خرچی اب کبھی نہ کریں گے۔

سرکار: (بلند آواز) ہوں!

ضیا یار جنگ: فدوی کا خیال ہے کہ شاہزادۂ والاشان فرطِ خوف سے شاید دوپہر کا خاصہ بھی تناول نہ فرما سکیں۔

اختر یار جنگ: اس میں کیا کلام ہے۔ ہوش صاحب نے جب ارشادِ عالی حرف بہ حرف اُن کے سامنے عرض کیا ہوگا تو شہزادۂ والا جاہ کانپ گئے ہوں گے۔

حالانکہ ارشادِ عالی کا اگر ایک جملہ بھی ہوش پرنس کے سامنے دُہرا دیتے تو اُن کی وہ گت بنتی کہ پھر مہینوں ہم چشموں کو منہ نہ دکھا سکتے اور تحائف سے الگ محروم رہتے۔ اب حضور پُرنور اپنی جگہ خوش کہ اب کی دفعہ ایں جانب نے معظم جاہ کو وہ ڈانٹ بتائی ہے کہ عمر بھر یاد ہی تو کرے گا اور پرنس اپنی جگہ مطمئن کہ چندروز مصاحبوں کے جھرمٹ نہ سہی، ہم دوچار کے ساتھ ایسی محفلیں سجائیں گے جو والد صاحب قبلہ کے وہم و خیال میں بھی نہ ہوں گی۔

یادِ ایّام

نوّاب حافظ سر محمد احمد سعید خاں صاحب چھتاری سابق گورنر یوپی و سابق صدرِ اعظم ریاست حیدرآباد دکن کی خود نوشت داستان "یادِ ایّام" کی اب تک دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور تیسری جلد کی اشاعت کا انتظار ہے۔ انگریزی دور کے اِن بزرگ سیاست دان کی کہانی اس لحاظ سے قابلِ مطالعہ ہے کہ اس میں اُن کے ذاتی حالات کے ساتھ ساتھ دورِ رفتہ کے واقعات اور شخصیات کی متعدد ایسی تصویریں بھی شامل ہو گئی ہیں جن کی عکاسی نوّاب صاحب کے علاوہ کوئی اور شخص نہ کر سکتا تھا۔ نوّاب صاحب نے "یادِ ایّام" میں اپنی رفیقۂ حیات کے سانحۂ وفات کا ذکر کیا ہے جو سراسر درد انگیز اور عبرت خیز ہے اور اُس سے اس حقیقت کا اعادہ ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو ایک عام انسان کی طرح رنج و راحت اور مسرّت و غم سے مرکب ہے۔ نوّاب صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ "میری زندگی بظاہر پُرسکون تھی، لیکن ایک تاریک ابر کا ٹکڑا آنے والے طوفان سے ڈرا رہا تھا۔ میری بیوی پھر اُمید سے تھیں۔ مجھے بڑی تشویش تھی کہ کہیں زچگی میں مرضِ سل کا اعادہ نہ ہو، لیکن اُنھیں اطمینان تھا اور میری پریشانی پر ہنستی تھیں۔ اُنھیں یہ یقین تھا کہ اس مرض سے نجاتِ کامل حاصل ہو گئی ہے اور اس وجہ سے باوجود میرے اصرار کے گزشتہ سال وہ پہاڑ پر بھی نہ گئی تھیں۔ میں اگست ۱۹۳۳ء کی سات یا آٹھ تاریخ کو واپس نینی تال پہنچا اور گیارہ تاریخ کو بعد مغرب ابنِ سعید سلمہٗ پیدا ہوا۔ بچّے کی پیدائش کے تیسرے روز سے بخار چڑھنا شروع ہو گیا۔ یہ مرحومہ کے پُرانے مرض کا اعادہ تھا جس

نے میری خانگی زندگی کو تہ و بالا کر ڈالا۔ بھوالی کے ڈاکٹر سے ان کا علاج شروع کرایا لیکن مرض بڑھتا گیا۔ اُدھر سر ولیم (گورنر) اور راجہ پرمانند (وزیر) چاہتے تھے کہ دورہ کیا جائے اور میں قدرتاً دورے پر جانے سے گھبراتا تھا۔ آخر کار میں نے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے استعفیٰ دے دینا چاہیئے۔ جب اس کی اطلاع مرحومہ رفیقۂ حیات کو ہوئی تو انھوں نے بڑی سختی سے اختلاف کیا۔ پلنگ پر اُٹھ کر بیٹھ گئیں اور کہنے لگیں کہ استعفیٰ ہرگز نہ دو اور دورے پر جاؤ۔ میں دورے پر آٹھ دس روز کے واسطے گیا اور شاید ۲۴، ۲۵ ستمبر تک واپس نینی تال آگیا۔ اُن کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی اور ڈاکٹروں کے مشورے سے میں اُنھیں لے کر علی گڑھ روانہ ہو گیا۔ میں اور اُن کے بھائی عبدالسمیع خاں راستے میں اُنھیں ہاتھوں پر اُٹھا کر نقل و حرکت کراتے تھے۔ اس دوران میں اُنھیں کھانسی کے بے تاب کر دینے والے دورے ہوتے تھے۔ یہ میں نہیں بتا سکتا کہ ایسا کیوں ہوتا تھا، مگر کھانسی سے سکون فقط اس حالت میں ہوتا تھا جب میں اُن کی کمر پر ہاتھ رکھتا اور اُنگلیاں پھیرتا۔ چناں چہ رات بھر اکثر یہی کرتا اور وہ سو جاتیں۔ ۲۹ ستمبر کو صبح ہی مجھے بُلایا اور جب اُٹھ جاتا تو پھر بُلا لیتیں۔ بعد عصر مجھے اس امر کا احساس ہو گیا کہ مفارقت کا وقت اب قریب ہے۔ برد اطراف شروع ہو گیا تھا، مگر ہوش بجا تھے اور مجھ سے باتیں کر رہی تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح اُنھیں نزاکتِ حال کا احساس کرا سکوں تاکہ وہ اپنے رب کی طرف متوجہ ہو جائیں، لیکن مجھ میں ہمت نہ ہوئی۔ یکایک کوٹھی کی مسجد میں مغرب کی اذان ہوئی۔ مرحومہ نے حسبِ عادت ہاتھ اُٹھا کر توبہ و استغفار شروع کر دی اور دو چار منٹ بعد میرے بچوں پر سے ماں کا سایہ اٹھ گیا۔ کیا بتاؤں مجھ پر کیا گزری۔ ابنِ سعید سلمہٗ کی عمر صرف سوا مہینے تھی۔ فرحت کی عمر تین سال، راحت کی پانچ سال اور ہاجرہ سلمہا کی نو سال کی عمر تھی۔ راحت اور فرحت میرے کمرے میں سو رہے تھے۔ ایک طرف یہ کرب و الم اور دوسری طرف یہ فکر کہ صبح کو راحت اور فرحت کو کیا جواب دوں گا۔ ابن سلمہٗ کو اپنی مصیبت کا ہوش ہی کہاں ہے؟ ہاجرہ اپنی نانی کے پاس تھی اور اُسے پورا احساس تھا، مگر یہ دو بچے بے خبر سو رہے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ اُنھیں اس سانحے کی خبر نہ ہو کہ وہ شفقتِ مادری سے ہمیشہ کے

لئے محروم ہو گئے ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ جب صبح وہ حسبِ عادت اپنی ماں کے پاس جانا چاہیں گے تو مَیں کیا کہوں گا۔ مَیں نے خان بہادر محمد یوسف کی دکان کھُلوا کر رات کے بارہ بجے بہت سے کھلونے منگائے اور اُنھیں بچوّں کے پلنگ کے چاروں طرف رکھوا دیے۔ وہ صبح اُٹھتے ہی خوش خوش اُن سے کھیلنے لگے۔ جب وہ مجھے اپنے کھلونے لا کر دکھاتے تو مَیں اُن کی طرف دیکھ کر مسکراتا، لیکن دل اُمنڈنے لگتا تھا۔ یہ عالم بھی خدا نہ دکھائے جب دِل خون ہو رہا ہو اور لب مُسکرانے پر مجبور ہوں۔ بڑی آزمائش کا وقت ہوتا ہے۔"

آپ بیتی : مولانا محمد علی جوہرؔ

مولانا محمد علی جوہر جب ۱۹۲۳ء میں بیجاپور جیل میں مقیم تھے تو اُنھوں نے اُس زمانے میں اپنی آپ بیتی انگریزی زبان میں **MY LIFE: A FRAGMENT** لکھنا شروع کی۔ مولانا جوہر کی یہ آپ بیتی کسی وجہ سے پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی اور نامکمل حالت ہی میں شائع ہوئی۔ پروفیسر محمد سرور نے اس کتاب کا اُردو ترجمہ کیا اور مولانا کے چند اور آپ بیتی نما مضامین کو شامل کر کے ایک کتاب "مولانا محمد علی : بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز" شائع کی۔ مولانا محمد علی کو اپنی والدہ محترمہ بی اماں مرحومہ سے جو محبت تھی وہ اُن کی اِس آپ بیتی کی اِن سطور میں جھلکتی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ "جس خالق نے مجھے ۱۵۔ ذی الحجہ ۱۲۹۵ ہجری کو پیدا فرمایا اُس کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آج بتاریخ ۱۵ ذی الحجہ ۱۳۴۵ ہجری کو مَیں نے اپنی عمر کے پچاس سال پورے کیے۔ اس پوری مدت پر نظر ڈالتا ہوں تو عجیب عجیب خیالات دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ ۷ رمضان المبارک ۱۲۹۷ ہجری کو میرے والد نے بعارضۂ ہیضہ کوئی تیس بتیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس وقت میری والدہ مرحومہ کی عمر ستائیس اٹھائیس سال کی تھی۔ سوائے قرآن مجید کے اُنھوں نے کچھ نہ پڑھا تھا۔ اس کی مدد سے خود اُردو کا بین السطور پڑھنے کی استعداد پیدا کر لی تھی۔ والد نے تیس پینتیس ہزار کا قرضہ چھوڑا تھا اور پانچ لڑکے اور ایک لڑکی

جن میں سب سے بڑے کی عمر بارہ سال تھی اور سب سے چھوٹا میں خود تھا جس کی عمر اس وقت پونے دو سال تھی۔ مجھے اپنے والدِ مرحوم بالکل یاد نہیں، مگر والدہ مرحومہ کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ وہ ہمیشہ یاد رہیں گی ــــ علاوہ اُس فیضِ گراں مایہ کے جو شوکت صاحب کی محبت، نگرانی اور ترغیب و تحریص کی بدولت مجھے نصیب ہوا ہے جو کچھ ہُوں اور جو کچھ میرے پاس ہے وہ خداوند کریم نے مجھے اُس مرحومہ کے ذریعے سے پہنچایا ہے والدِ مرحوم کی وفات کے دن سے اُنھوں نے خود گھر کی بوڑھی ماماؤں کا سا سادہ اور سستا لباس پہنا اور اُنھی کی طرح رُوکھی سُوکھی کھا کر گزر کی، مگر ہمارا کوئی سوال رَد نہیں کیا اور ہمیں اُس عیش و آرام میں رکھا، پالا اور بڑا کیا جو ہمارے اُن چچاؤں کی اولاد کے عیش و آرام سے کسی طرح کم نہ تھا، بلکہ زائد ہی تھا جو بفضلہٖ تعالیٰ والدِ مرحوم کی وفات کے وقت زندہ اور سلامت تھے جن کی جائدادوں پر قرضے کا وہ بوجھ نہ تھا جو ہمارے تر کے پر تھا اور جو ریاست رام پور میں بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز تھے۔ اُن سب سے پہلے ہمیں کو گھر سے نکال کر بریلی اسکول میں تعلیم کے لئے والدہ مرحومہ نے بھیجا تھا۔ وہ تو سب اسکول چھوڑ چھاڑ کر گھر چلے آئے، مگر ہماری تعلیم جاری رہی اور شوکت صاحب جس طرح ریاست رام پور کے باشندوں میں غالباً سب سے پہلے کسی ہندوستانی یونی ورسٹی کے گریجویٹ ہوئے، اُسی طرح مَیں اُن میں سب سے پہلے اوکسفورڈ کا گریجویٹ ہوا۔"

سلسلۂ روز و شب

"سلسلۂ روز و شب" پاکستان سول سروس اکیڈمی کے ڈائرکٹر جنرل اور مشہور ادیب شیخ منظور الٰہی کی نہایت دلچسپ آپ بیتی ہے۔ اُس کا بھی ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

اب اُس پیاری پیاری اور من موہنی ہستی کے چند نقوش جو ہماری مشفق اور شفیق امّی جان تھیں ستلج دیلی پراجیکٹ کی تکمیل سے پہلے ابا فیروز پور میں غیر منتقل نہروں کے مہتمم تھے اُنھیں ایک وسیع و عریض اور بارونق کوٹھی جو جامنوں کے درختوں میں گھری ہوئی

تھی۔ ہانس کے لیے ملی ہوئی تھی۔ اس کوٹھی کی اصل رونق بلکہ کل کائنات ہماری امّی جان تھیں۔ گھر کا انتظام و انصرام، کبھی کبھی کسی سہیلی کے ہاں چلے جانا یا پھر مختلف سہیلیوں کو وقتاً فوقتاً چائے پر بلا لینا اُن کی دل چسپ مصروفیات تھیں۔ گھر میں کوئی پارٹی ہوتی تو امّی کا ہاتھ بٹانے کے لیے دو دراز قد خوش رُو پارسی لڑکیاں آجایا کرتیں۔ انھیں دیکھ کر مَیں امّی سے پوچھتا "یہ پریاں کہاں سے آتی ہیں؟" جواب دینے کی بجائے امّی مسکرا دیتیں۔

امّی نرم خو تھیں۔ انھیں غصّہ بہت کم آتا تھا۔ یاد نہیں پڑتا اُنھوں نے کسی بچّے پر ہاتھ اٹھایا ہو۔ ہاں بچپن میں ایک بار ایک ہمجولی کے گھر سے پستول کا کھلونا اور پٹاخوں کا سُرخ فیتہ چُپکے سے اٹھا لایا تھا۔ "یہ کہاں سے لاتے ہو؟" امّی نے پوچھا۔ میرے خاموش رہنے پر زنّاٹے کا ایک تھپّڑ مارا اور دونوں چیزیں ملازم کے حوالے کر دیں کہ واپس دے آئے۔ اُس روز سے ذہن پر نقش ہو گیا کہ ایسا کرنا بہت بُری بات ہو گی۔

مَیں پہلے روز اسکول گیا تو اور بچّوں کی طرح مَیلے ٹاٹ پر بٹھا دیا گیا۔ جا بجا روشنائی کے دھبّے اور چکنائی کے داغ۔ گھر آکر ذکر کیا تو امّی نے کھجور کی چٹائی بھجوا دی۔ جس پر میرے علاوہ دو تین دوسرے ہم جماعت بھی بیٹھ جاتے۔ بس ناز برداری اسی حد تک تھی امّی کی سفارش پر چند برس بعد سائیکل خریدنے کی اجازت ملی تھی۔

اُنھی دنوں گھر کا کام کاج کرنے کے لیے بارہ تیرہ برس کا ایک لڑکا بہاول پور سے آیا۔ ہاڑ کاٹھ کا تگڑا تھا دیکھتے دیکھتے اُس نے کام سنبھال لیا۔ چراغ کو ہمارے ہاں کام کرتے بمشکل ایک برس ہوا ہو گا کہ امّی کا زیور چوری ہو گیا۔ تھانے میں اطلاع دی گئی تو ملازموں سے باز پُرس کے لیے پولیس گھر آ گئی۔ دھمکانے کی خاطر تھانیدار نے ٹکٹکی نصب کر دی۔ جب تیل میں بھگویا کوڑا ہوا میں لہرانا شروع کیا تو چراغ پھوٹ پڑا کہ جمعدار کی شہ پر زیورات کا ڈبّہ چُرا کر کوارٹر میں چھپا دیا ہے۔ امّی کو برابر اطلاع مل رہی تھی کہ چراغ کی مار پیٹ کا انتظام ہو رہا ہے۔ وہ قرآن کریم کھولے بیٹھی تھیں اور آنسوؤں کا تار بندھا تھا۔ چراغ کو سزا ملنے کا خیال اُن کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ وقتی طور پر وہ اپنا زیور بھول گئی تھیں۔ اتنے میں ابّا مسکراتے ہوئے اندر آئے۔ ہاتھ میں وہی

ڈبہ تھا کھولا تو زیورات جوں کے توں موجود تھے اور ساتھ ہی ابا کا لکھا ہوا کاغذ کا وہ پرزہ بھی کہ "زیور کی زکوٰۃ ادا کر دی گئی ہے"۔

یادش بخیر اس زمانے میں ایک خان صاحب، فیروز پور میں سول سرجن تھے، یار باش اور رنگین مزاج، بحری جہاز سے لندن جاتے ہوئے اُنھوں نے ابا کو ایک تصویری کارڈ بھیجا تھا جس کی پشت پر حضرت اکبر کا یہ شعر لکھا تھا۔

چلے ہیں شیخ کعبے کو، ہم انگلستان دیکھیں گے
وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے

پہلے خان صاحب کی بیگم پردے میں تھیں۔ پھر سُننے میں آیا کہ اُن کی خواہش کے مطابق پردے کو خیرباد کہا۔ اُن کے دوستوں کے ساتھ متعارف ہو گئیں اور مخلوط پارٹیوں میں جانے لگیں۔ جانے کیا بات ہوئی۔ کسی دوست سے ہنس کے بات کر لی یا کسی کے ساتھ سینما دیکھنے چلی گئیں۔ خان صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بات پوچھے بغیر طلاق دے دی یہ قصہ دُہرا کر امی نے کہا تھا "عورت ذات کمزور جنس ہے۔ جہاں تک ہو سکے مرد کو اس پر رحم کرنا چاہیے"۔

فیروز پور ہی میں میاں عبدالحیٔ (وزیر تعلیم پنجاب) کے بڑے بھائی میاں عبدالفتح مجسٹریٹ دو تین ماہ ہمارے مہمان رہے تھے۔ انھیں تپ دق کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ وہ علاج کے لیے وہاں آئے ہوئے تھے حالانکہ اس زمانے میں یہ مرض لاعلاج سمجھا جاتا تھا۔ وہ مجھ سے مانوس ہو گئے تھے۔ مجھے بُلوا بھیجتے تو امی فکر مند ہو جاتیں کہ اس مہلک مرض کے جراثیم مجھ تک نہ پہنچ جائیں۔ لدھیانے لوٹ جانے کے بعد اُن کا آخری کارڈ آیا میر ضمیر کا یہ شعر اُس پر لکھا ہوا تھا۔

ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے چراغِ سحری کا

اسکول کے زمانے کا جیب خرچ یاد نہیں مگر فرسٹ ایئر میں دس روپے ماہانہ تھا۔ ابا گھر ہوتے تو جرأت نہ ہوتی مگر وہ دورے پر جاتے تو ہم امی کے گرد ہو جاتے

کہ ہمیں سینما دیکھنے کے لیے پیسے چاہئیں۔ سینما کا ٹکٹ، آئس کریم اور لیمونیڈ کی بوتل کے لیے ایک چہرہ شاہی کافی ہوتا۔ امی نے کبھی انکار نہیں کیا ہاں جب ٹارزن کی چوتھی قسط پر جانے کی اجازت مانگی تو اتنا ضرور کہا تھا کہ یہ مُوا ٹارزن کب ختم ہوگا۔

امی اور ہم بچوں کے درمیان باہمی اعتماد کو بڑا دخل تھا۔ اُس کا نتیجہ بچوں میں جذبۂ خود اعتمادی تھا۔ وہ باور نہ کر سکتی تھیں کہ اُن کا بیٹا جھوٹ بول سکتا ہے یا اُس سے کوئی نازیبا حرکت سرزد ہو سکتی ہے۔ ہم مذاق سے کسی پر سگریٹ پینے کا الزام لگاتے تو وہ فوراً بول اٹھتیں، "توبہ کرو وہ ایسا کام کر سکتا ہے"؟ کم از کم بچپن اور اوائل شباب میں ہم نے اس اعتماد کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کبھی غلط بیانی کر کے امی سے کوئی رعایت طلب نہ کی، نہ اپنی برئیت کے لیے مصلحتاً جھوٹ بولا۔

ابا کی بے پناہ مصروفیت کے باعث بچوں کی تربیت کا فرض بھی اُن کے سر آن پڑا تھا۔ انھوں نے کبھی نصیحت کے انبار نہیں لگائے، نہ ہمیں بات بات پر ٹوکا۔ بس اُن کا کردار اور حُسنِ سلوک ہمارے سامنے تھا اور اُن کی حق گوئی اور رحم دلی بھی۔ لگی لپٹی نہ رکھنا، کسی کا بُرا نہ چاہنا، کسی بات پر بے جا ناراض نہ ہونا، یہ سب ہمارے سامنے تھا۔ اگر ہم نے اُن کی کوئی صفت نہ اپنائی تو اسے اپنی کم نصیبی ہی کہہ سکتے ہیں۔

صبر و شکر اور توکل اُن کی گھٹی میں پڑا تھا۔ بھائی کا ایک کورس پر امریکا جانا ہوا تو غم زادہ بہنیں رو رو کے ہلکان ہو گئیں۔ امی نے سمجھایا "اس موقع پر رونا دھونا کیسا؟" اور قرآن کریم کھول کر بیٹھ گئیں۔

ابا کے انتقال کو چند ہفتے ہوئے تھے کہ چھوٹے بھائی کی پھول ایسی بیٹی یرقان میں مبتلا ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اللہ کو پیاری ہو گئی۔ امی اُس کمرے میں داخل ہوئیں جہاں ننھا میٹھی نیند سو رہی تھی۔ اس بچی سے پیار بھی بہت تھا۔ اسے دیکھتے ہی آنکھوں کے آبگینے چھلک پڑے۔ بس اتنا کہا "یہ تیرے کھیل کود کے دن تھے جانے کا وقت نہ تھا۔"

بچپن کی ایک یاد امی کی قرآن مجید کی تلاوت ہے۔ فجر کی نماز کے بعد پلنگ پر بڑی تقطیع کا قرآن کریم دھرا ہوتا اور وہ اُس پر جھکی ہوئی ہلکی مترنم آواز میں تلاوت

کرتیں۔ اس کے بعد بڑے اہتمام سے مکھن نکالتیں۔ ایک گائے یا بھینس ہمیشہ گھر میں ہوتی امی دودھ مکھن کی دیکھ بھال کو بہت اہمیت دیتی تھیں۔ چاٹی میں دہی بلو کر خود مکھن نکالتیں۔ لسی باہر تقسیم ہو جاتی اور مکھن کا سفید پیڑا ناشتے کی میز پر آ جاتا۔

ایک دفعہ ابا نے کچھ بٹیر اندر بھجوائے اور تاکید کی کہ مہمانوں کے لیے مسالے میں بھون کر بنائیں۔ امی بٹیر سنبھالنے لگیں تو ان کی پالتو بلیاں آ گئیں۔ امی نے تین چار بٹیر اُن کی طرف پھینک دیئے۔ پھر بلیوں سے پیار کا قصہ سنایا کہنے لگیں کہ "ایک روز تم لوگ اپنے بچپن میں مغرب کے وقت صحن میں کھیل رہے تھے۔ قریب ہی چنبیلی کے بوٹے تھے اچانک میری نظر تمہاری طرف پڑی تو دیکھا کہ ایک سانپ تم لوگوں کی طرف جانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن ایک بلی پنجہ مار کے اُسے پیچھے ہٹا دیتی ہے۔ میں نے دیکھ کر ملازم کو بلوایا اور اس سانپ کو مروا دیا۔"

مشکل کے وقت ایک بلی نے بچوں کی حفاظت کی اور امی نے حضرت ابوہریرہؓ کی سنت پر عمل پیرا ہو کر بلیاں پالنی شروع کر دیں۔ ماں کی مامتا بھی کیا چیز ہوتی ہے۔

بچوں کے لیے امی کا ایک تحفہ مطالعے کا شوق تھا۔ جب فرصت ملتی کوئی رسالہ یا کتاب اُٹھا لیتیں۔ مصورِ غم علامہ راشد الخیری اور خواجہ حسن نظامی کی کتابیں "مسدسِ حالی" اور چکنے دبیز کاغذ پر مرغوب ایجنسی لاہور کی شائع کردہ اقبال کی طویل نظمیں "شکوہ"، "جوابِ شکوہ"، "شمع و شاعر"، "خضرِ راہ" وغیرہ خود پڑھتیں اور ہم سے پڑھواتیں۔ جب بار بار پڑھنے سے مجھے یہ نظمیں یاد ہو گئیں تو کچھ انعام بھی دیا۔ اچھی کتابوں کی طرف ہمارا میلانِ طبع دیکھ کر خوش ہوتیں اور ہماری حوصلہ افزائی بھی کرتیں۔

عربی میں بھجن

ہمارے اسکول "گورنمنٹ ہائی اسکول بھوانی ضلع حصار" کا یہ طریقۂ کار تھا اور بلاشبہ بہت عمدہ طریقۂ کار تھا کہ ہر مہینے کے آخری اتوار کو صبح کے وقت گھنٹے، ڈیڑھ گھنٹے کے لیے ایک جلسۂ عام منعقد کیا جاتا تھا جسے جنرل میٹنگ کہتے تھے اور اس جلسے میں

تمام اساتذہ اور طلبہ بالالتزام شریک ہوتے تھے۔ اس جلسے کا مقصد طلبہ میں تحریر وتقریر کا شعور پیدا کرنا تھا۔ چناں چہ ہر ماہ چند منتخب طالب علم اس جلسے میں شرکت کے لیے مضامین، کہانیاں اور نظمیں وغیرہ لکھ کر لاتے اور پھر انھیں تقریر کے رنگ میں پڑھ کر سناتے اور داد حاصل کرتے لیکن کبھی کبھی ناپختگی کے سبب بعض طالب علم بے داد کا شکار بھی ہو جاتے اور خاصی مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہو جاتی۔ ایک روز جب یہ جلسہ جاری تھا آٹھویں جماعت کے ایک ہندو طالب علم جگن ناتھ ایک بھجن (حمد) سنانے کے لیے آئے۔ یہ اُس زمانے کا ایک مقبول بھجن تھا اور اس کے بول تھے:

جگدیش ہرے، جگدیش ہرے

جگدیش ہرے، جگدیش ہرے

بھجن کے یہ بول بالکل سادہ سے تھے، لیکن جب وہ اُسے جھوم جھوم کر پڑھنے لگے تو اُن کے منھ سے الفاظ کی ادائی کچھ یوں ہوئی:

ضغدیس ہرے، ضغدیس ہرے

ضغدیس ہرے، ضغدیس ہرے

تلفظ کا یہ حال دیکھا تو تمام طلبہ کے چہروں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر لالہ دُنی چند ہر چند کہ بڑے سنجیدہ مزاج بزرگ تھے، لیکن وہ بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ اور پیشتر اس کے کہ طلبہ کی جانب سے کوئی بے داد کا مظاہرہ ہوتا انھوں نے جگن ناتھ سے مخاطب ہو کر فرمایا "شاباش بیٹے شاباش، جاؤ اب بیٹھ جاؤ" لڑکا شرمندہ ہو کر جانے لگا تو ہیڈ ماسٹر صاحب، مولوی عبدالمجید صاحب عربک ٹیچر سے جو اُن کے ساتھ ہی تشریف رکھتے تھے فرمانے لگے "مولانا، ملاحظہ فرمایا آپ نے، یہ لڑکا تو عربی میں بھجن گا رہا تھا"۔ یہ الفاظ سُنے تو مولانا بھی بے اختیار مسکرا اُٹھے اور فرمانے لگے "بجا ارشاد ہوا"۔ (عبدالمجید قریشی)

ذکرِ علی گڑھ اُردو اَدب میں

تحریکِ علی گڑھ و اکابرینِ تحریک کتابوں کے آئینے میں

۲۷ اور ۲۸ مارچ ۱۸۹۸ء کی درمیانی شب کو دنیائے اسلام کے اُس بطلِ جلیل نے کہ جس کا نامِ نامی جواد الدولہ عارف جنگ سر سید احمد خاں بہادر تھا اور جو نہ صرف اپنے دَور کے مسلمانوں میں؛ بلکہ اپنے زمانے کے انسانوں میں بھی عظیم تھا سرائے فانی سے عالمِ جاودانی کی جانب رختِ سفر باندھا، مگر اس شان کے ساتھ کہ جان، جاں آفریں کے سپرد کی جا رہی ہے اور لب ہیں کہ تلاوت کا فریضہ ادا کر رہے ہیں۔ دل و دماغ پر بے ہوشی کا غلبہ طاری ہے، مگر ہونٹوں پر کلامِ الٰہی کا نزول جاری ہے۔ آیتِ قرآنی حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ نِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ، مرتے دم جس انسان کی زبان پر ہو، کیا اب بھی اُس کی مغفرت میں شک کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ مرنے والا وہ انسان تھا جس کے مخالفین نے اُس کی مسلمانی کو بدترین کفر سے تعبیر کیا اور آخری وقت تک اُسے کرسٹان، نیچری اور ملحد اور نہ جانے کیا کیا کہہ کر مسلمانوں کی صف سے خارج کرنے کی کوششیں کیں۔ اُس کی رحلت کی خبر سُنی تو نوجوان اقبال نے "غُفِرَ لَہٗ" اور اُن کے استاد شمس العلما مولوی میر حسن نے "اِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ" جیسی الہامی تاریخ ہائے وفات نکال کر اُس کی مسلمانی کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

انیسویں صدی بھی ایک عجیب صدی تھی۔ اس صدی کے وسط میں دیارِ مغرب سے آنے والے تاجروں نے آخر کار اُس شمع کو بھی پھونک مار کر بجھا دیا جو مغلیہ سلطنت کے نام سے قلعۂ دِلی کی چار دیواری میں ٹمٹما رہی تھی اور ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی پر فرنگی

سرزمینِ ہند کے بلا شرکتِ غیرے مالک بن گئے، لیکن اللہ کی شان دیکھیے کہ اُسی صدی میں مسلمانوں میں اتنے بڑے بڑے آدمی پیدا ہوئے کہ جنھوں نے نوّے سال کی مسلسل اور مستقل جدّوجہد کے بعد فرنگیوں کے پاؤں اس سرزمین سے اُکھاڑ دیے۔

سرسید احمد خاں مسلمانوں کے اِسی سیاسی کارواں کے امامِ اوّل تھے۔ ہم میں کچھ لوگ سرسید پر زبانِ طعن دراز کرتے ہیں، لیکن وہ بھولتے ہیں کہ یہ سرسید ہی کا دم تھا کہ وہ اپنی حکمتِ عملی سے نہ صرف اُس زمانے کے مسلمانوں کی جانیں بچانے میں کامیاب ہوئے بلکہ اُنھوں نے مسلمانوں کو کاروبارِ حکومت میں اُن کا جائز مقام دلانے کی بھرپور کوششیں بھی کیں، اور [illegible] ۱۸۶۰ء کے زمانے میں تو یہ حال تھا کہ جہاں بھی کسی کڑیل اور خوب صورت جوان کو دیکھا انگریز نے اُسے پھانسی پر چڑھا دیا، محض اس جرم میں کہ وہ مسلمان تھا۔

جسے دیکھا حاکمِ وقت نے کہا یہ بھی قابلِ دار ہے

ہمارا یہی طبقۂ مغرب زدگی کے لیے بھی سرسید ہی کو ذمّے دار ٹھیراتا ہے، حالانکہ یہ الزام بھی حقیقتِ حال کے قطعی اور واضح طور پر خلاف ہے۔ سرسید احمد خاں کا قصور صرف یہ تھا کہ اُن کی دُور بین نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ برادرانِ وطن کس طرح مسلمانوں کے حقوق ہڑپ کیے جا رہے ہیں۔ اگر اُن کو انگریزی زبان کی تعلیم سے روشناس نہ کیا گیا تو ایک دن وہ آئے گا جب سرکاری ملازمتوں میں ایک مسلمان بھی نظر نہ آئے گا اور مسلمان ہر لحاظ سے انگریز اور ہندو کے غلام بن کر رہ جائیں گے۔ اِس خطرے نے سرسید کو مجبور کیا کہ وہ علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنا ڈالیں ورنہ جہاں تک عقائد و اعمال اور ظاہری شکل و شباہت کا تعلق ہے، سرسید اُتنے ہی بڑے مسلمان تھے جتنا کہ اُس دور کا کوئی بڑے سے بڑا عالمِ دین ہو سکتا تھا۔ نماز اور روزے کے وہ انتہائی پابند تھے اور اُن کے چہرے پر اتنی بڑی ڈاڑھی تھی جسے ڈاڑھی کی بجائے ڈاڑھا کہا جا سکتا ہے۔ سرسید نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے طلبہ کے لیے جو مخصوص لباس مقرر کیا اُس کا بھی مروجہ انگریزی لباس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ لباس سیاہ شیروانی، سفید پاجامے اور ترکی ٹوپی پر مشتمل تھا اور آج تک وہ اپنی اِسی شکل میں موجود ہے۔ سرسید کی زندگی میں ایک مرتبہ کالج کے انگریز

پرنسپل مسٹر تھیوڈور بیک نے طلبہ کے مقررہ لباس کو انگریزیت سے قریب کرنا چاہا تھا لیکن سرسید کی شدید مخالفت کے باعث وہ کامیاب نہ ہو سکے اور اُنھیں اپنا یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔ ہمارے ہاں دینیات کی تعلیم کا اہتمام تو آج کیا جا رہا ہے، لیکن علی گڑھ کالج میں یہ انتظام اُسی زمانے میں کر دیا گیا تھا۔ پھر جس شخص کے قلم سے "اسبابِ بغاوتِ ہند" جیسی معرکہ آرا کتاب نکلی ہو کہ جس نے حاکمانِ وقت کی جبینِ ناز پر بل ڈال دیے ہوں اور جو انسان سر ولیم میور لفٹیننٹ گورنر یو۔ پی کی کتاب "لائف آف محمدؐ" پڑھ کر اتنا مضطرب اور بے چین ہوا ہو کہ جب تک اس کا جواب نہ لکھ لیا اُسے چین نہ آیا ہو، خیال فرمایئے وہ شخص انگریز پرست کیسے ہو سکتا ہے۔ مَیں سرسید کو بالکل اقبالؔ کی مانند سمجھتا ہوں۔ سر دونوں تھے، لیکن انگریز کی دہلیز پر اپنا سر نہ جھکاتے تھے۔

سرسید کا کردار کتنا ہی ارفع اور اعلا کیوں نہ تھا اور اُن کی یہ تعلیمی اور اصلاحی تحریک مسلمانانِ ہند کے لیے کتنی ہی مفید اور سود مند کیوں نہ تھی، مخالفت کا سامنا تحریک اور بانیٔ تحریک دونوں کو کرنا پڑا۔ دراصل کسی انسان، کسی جماعت، کسی تحریک یا کسی ادارے کی مخالفت یا موافقت خواہ وہ اپنی خدمات اور مقاصد کے لحاظ سے کتنا ہی مخلص اور بے غرض کیوں نہ ہو، کوئی نئی بات نہیں۔ شرارت پسند طبائع نے تو انبیائے کرام اور مرسلینِ عظام تک کو نہ بخشا۔ بس ازل سے یہی ہوتا چلا آ رہا ہے اور اَبد تک یہی ہوتا رہے گا۔ یہی کچھ علی گڑھ میں سرسید کے ساتھ پیش آیا، لیکن اللہ نے سرسید کو کچھ ایسے ٹھنڈے دل و دماغ عطا فرمائے تھے کہ یہ شخص بڑے سکون اور طمانیت سے اپنی بڑی سے بڑی مخالفت کو بھی برداشت کر لیتا تھا۔ اُسے مخالفین کے رویّے پر کبھی طیش نہ آتا تھا اور پھر وہ موقع آنے پر اُن کو یوں رام کر لیتا تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔ سرسید کے اس وصف کا ذکر مولوی عبدالرزاق کانپوری مصنف "البرامکہ" نے اپنی ایک دوسری کتاب "یادِ ایّام" میں کیا ہے جہاں وہ ایک عظیم الشان جلسے کا حال یوں بیان فرماتے ہیں کہ "اس بحث میں تین حضرات نے پُرجوش تقریریں کیں۔ اوّل میرے معزز بھائی بشیر د خان بہادر مولوی بشیر الدین ایڈیٹر اخبار "البشیر" (اٹاوہ) اُٹھے اور ایک بسیط تقریر کی اور اس قدر برہم ہوئے کہ جلسے سے اُٹھ جانا چاہا۔ سرسید

نے اُن کا ہاتھ پکڑا اور کان میں کچھ کہا۔ خدا جانے وہ کیا الفاظ تھے کہ مولوی صاحب کا غصّہ فوراً کافور ہوگیا۔ ایک ظریف نے برجستہ کہا کہ سر سید نے آج بشیر الدین کے کان میں نیچر کا منتر پھونک دیا ہے۔ اس عہد میں بھائی بشیر سر سید کے بڑے مخالف تھے، لیکن اُس دن سے وہ سر سید اور کالج کے ایسے رفیق بن گئے جس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ یہ قصّہ ختم ہو چکا تھا کہ میر نثار علی شہرت (لاہور کے کسی اخبار کے ایڈیٹر) کھڑے ہوئے اور ایسی اشتعال انگیز تقریر کی کہ پنجاب پارٹی اُن کے ہم خیال ہوگئی۔ یہ نہایت نازک موقع تھا کہ سر سید اپنی کرسی سے اُٹھے اور دوران تقریر میں بھری محفل میں میر صاحب کے قدموں پر اپنی ترکی ٹوپی رکھ دی۔ میر صاحب برف کی قلفی بن کر رہ گئے اور محفل پر سکوت طاری ہوگیا۔ اس ہنگامے اور سکون کے بعد ایک ہول ناک آندھی آئی یعنی منشی سجاد حسین ایڈیٹر "اودھ پنچ" نے ریزولیوشن کے خلاف تقریر شروع کی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مَیں نے سجاد حسین کی برجستہ اور فصیح و بلیغ تقریر سُنی، اس تقریر میں سر سید پر پھبتیاں تھیں اور عجیب و غریب مثالیں جن کو سُن کر لکھنؤ کے نادان نوجوان جوشِ مسرت میں جھوم جھوم کر داد دیتے تھے۔ سیّد صاحب نے انتہائی خاموشی اور تحمّل سے وہ تقریر سُنی، لیکن سجاد حسین کو نہ خود جواب دیا اور نہ کسی اور کو جوابی تقریر کی اجازت دی۔ شام کے کھانے پر جب اس تقریر کا تذکرہ ہوا تو سر سید نے فرمایا "صاحبو! تم ہرگز بُرا نہ مانو، میری قوم جاہل ہے۔ اس کانفرنس کے انعقاد کی غرض و غایت یہی ہے کہ ہم اپنے عیوب سے آگاہ ہوں اور ایسے نوجوانوں کی اصلاح کریں جو ہنوز قومی معاملات سے ناواقف ہیں۔ بڑوں کو بچّوں کی بات کا کچھ خیال نہ کرنا چاہیئے۔ زمانہ آئندہ چل کر خود اُن کی اصلاح کر دے گا"۔ چند سال کے بعد سجاد حسین پر فالج گرا اور اُن کی زبان بند ہوگئی۔ برسوں کے علاج کے بعد زبان کھُلی، مگر سوائے چند احباب کے کوئی اُن کی گفتگو نہ سمجھ سکتا تھا۔ لکھنؤ کے بعض بزرگوں کا مقولہ تھا کہ یہ سید کے ضبط و صبر کا نتیجہ تھا کہ خدا کا عذاب فالج کی صورت میں سجاد حسین پر نازل ہوا اور اُن کو اپنی گستاخیوں کی سزا مل گئی۔

سر سید کے ایک بہت بڑے اور مشہور مخالف ڈپٹی امداد العلی تھے جنھوں نے سر سید

اور اُن کے رفقا کو ملحد، کافر، ملعون، دہریہ، زندیق، شیطان، کرسٹان اور نیچری کے القابات سے نوازا اور مختلف علما سے فتاوے حاصل کر کے اُن کو کافر قرار دیا۔ ڈپٹی امداد العلی اور اُن کے دوستوں کی سلگائی آگ کچھ عرصے بہت بھڑکی، لیکن آہستہ آہستہ راکھ میں تبدیل ہو گئی اور آج یہ حالت ہے کہ سر سید کو تو ملک کا بچّہ بچّہ جانتا ہے، لیکن ڈپٹی امداد العلی کے نام سے کوئی واقف نہیں۔

اِدھر مخالفتوں اور مزاحمتوں کے طوفان کی یہ تلاطم خیزیاں تھیں اور اُدھر سر سید احمد خاں اِن تمام باتوں سے بے نیاز ہو کر اپنے رفیقِ کار مولوی سمیع اللہ سب جج علی گڑھ کی معیت میں ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ کی سر زمین پر ایک چھوٹے سے گھاس پھونس کے بنگلے میں اُس عظیم درس گاہ کی بُنیاد رکھ رہے تھے جس کے متعلق وہ ایک عرصہ دراز سے سوچ رہے تھے۔ سر سید کی یہ درس گاہ اگرچہ انگلستان کی مشہور یونی ورسٹیوں "کیمبرج" اور "آکسفورڈ" کے نمونے پر قائم کی گئی تھی، لیکن اس میں مسلمان بچّوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کے لیے ایک خاص نصاب مقرر کیا گیا تھا۔ اِس درس گاہ کے قیام میں سر سید کی کوئی ذاتی غرض یا مالی منفعت پنہاں نہ تھی، بلکہ اُس کے پس پشت ایک جذبہ اور ایک مقصد کام کر رہا تھا۔ سر سید کی اس تحریک کا تجزیہ کیا جائے تو واضح ہو گا کہ اس تحریک کی بُنیاد بے غرضی، خلوص، عزم و ہمّت اور بے پایاں ایثار پر رکھی گئی تھی اور اس تحریک کا مقصدِ اوّلین محض مسلمانانِ ہند کی تعلیمی ترقّی اور اصلاحِ احوال تھا۔ خوش قسمتی سے اس تحریک کی زمامِ کار ابتدا ہی سے ایسے نیک دِل اور شریف النّفس بزرگوں کے ہاتھوں میں رہی جو ہر لحاظ سے اِسے تھامنے کے اہل تھے۔ متقدمین میں تحریکِ علی گڑھ کے ناخدا سر سید علیہ الرحمۃ کے علاوہ اُن کے نورتن نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، جسٹس سیّد محمود، مولانا شبلی نعمانی، ڈپٹی مولوی نذیر احمد، مولانا حالی، ذکاء اللہ، مولوی چراغ علی، مولوی زین العابدین اور مولوی سمیع اللہ نے جس انداز سے اس تحریک کو پروان چڑھایا اور اُسے کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لیے جس جوش و خروش سے کام کیا اُسے علی گڑھ تحریک کی تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔ ان بزرگوں کے آخری دَور میں سر آغا خان، بیگم صاحبہ بھوپال، نواب اسحاق خاں، نواب سیّد محمد علی، مولوی سیّد علی

بگرامی، نواب عماد الملک بگرامی، نواب صدر یار جنگ وغیرہم نے اِس تحریک کی امداد و استعانت کے لیے سرگرم کوششیں کیں اور اُن کے ساتھ مادرِ درس گاہ کے اپنے سپوت آگے بڑھے۔ اُن میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، سر سید راس مسعود، نواب اسماعیل خاں اور ڈاکٹر ذاکر حُسین خاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مستقبل کا مؤرخ جب کبھی ایثار و قربانی اور خلوص و بے غرضی کی تاریخ مرتب کرے گا، علی گڑھ تحریک کو اُس کے صفحات میں ایک نمایاں مقام حاصل ہوگا۔

علی گڑھ کی اِس ایک سو پندرہ سالہ معمّر تحریک کا تذکرہ انفرادی طور پر تو اِس کے عمائدین کے شخصی تذکروں میں اور ملک کے دوسرے اخبارات اور رسائل کے صفحات میں بکھرا ہوا ملتا ہے، لیکن اس تحریک پر جس انداز میں کتابیں لکھی جانا چاہیے تھیں، ہمارا ادب اُن سے بالکل تہی داماں ہے۔ ضرورت تھی کہ اس موضوع پر بالکل اُنھی خطوط پر کام کیا جاتا جن خطوط پر "علی گڑھ ہسٹری آف اُردو لٹریچر" ترتیب دی جا رہی ہے۔

سَر سیّد اور تحریکِ علی گڑھ: چند اہم تصانیف

تحریکِ علی گڑھ اور بانیٔ تحریک سر سیّد احمد خاں کی شخصیت اور اُن کے کارناموں پر سب سے پہلی کتاب مولانا خواجہ الطاف حسین حالی کی شہرۂ آفاق کتاب "حیاتِ جاوید" ہے جو ایک ہزار کے قریب بڑے صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ سر سیّد علیہ الرحمۃ کے متعلق مولانا حالی مرحوم کا یہ کارنامہ موضوع پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ سچ پوچھیے تو مولانا حالی نے "حیاتِ جاوید" کی شکل میں سیرت نگاری کے ایک نئے اُسلوب کو جنم دیا، بلکہ آنے والے سوانح نگاروں کو بھی ایک نیا راستہ دکھا دیا۔ اِس کتاب کے سنِ اشاعت سے لے کر ہمارے دور تک کے اس پچاسی سال سے طویل دور میں اگرچہ سر سیّد مرحوم کے متعلق بہت سی کتابیں اور سیکڑوں مضامین اور مقالے اشاعت پزیر ہوتے رہے ہوں گے، لیکن "حیاتِ جاوید" کی مثیل کوئی اور کتاب اس موضوع پر کسی قلم سے بن نہ پڑ سکی۔ "حیاتِ جاوید" کا مسوّدہ سر سیّد کی زندگی ہی میں ترتیب دیا جا رہا تھا اور اُس کے کچھ اجزا اُن کی نگاہ سے گزر بھی چکے تھے اُن کی

وفات کے بعد ۱۹۰۰ء میں اس کتاب کا پہلا ایڈیشن منظرِ عام پر آیا اور اب تک کوئی نصف درجن ایڈیشن اس کتاب کے مختلف مقامات سے شائع ہو چکے ہیں۔ "حیاتِ جاوید" کا آخری ایڈیشن کوئی اٹھارہ سال کے وقفے کے بعد مولانا صلاح الدین احمد مرحوم کی "اکاڈمی پنجاب" کے زیرِ اہتمام ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اُس سے پیشتر ایک ایڈیشن ۱۹۳۹ء میں "انجمن ترقی اُردو" نے دِلّی سے شائع کیا تھا۔ ابتدائی ایڈیشن نامی پریس کان پور سے نکلا تھا۔

"حیاتِ جاوید" کی اشاعت کے اگلے برس ۱۹۰۱ء میں ایک اور نہایت اہم کتاب "محمڈن کالج ہسٹری" شائع ہوئی۔ کتاب کے انگریزی نام پر نہ جائیے، یہ کتاب اُردو زبان میں ہے اور اس کے مصنّف سیّد افتخار عالم مارہروی ہیں۔ اس کتاب کو مطبع مفید عام آگرہ نے شائع کیا تھا اور اس کی ضخامت سوا تین سو صفحات تھی۔ یہ کتاب محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کے سنِ اساس ۱۸۷۵ء سے لے کر ۱۹۰۰ء تک کے پچیس سالہ دور کی بڑی مفصل تاریخ ہے اور اس میں بڑے شرح وبسط اور پوری جزئیات نگاری کے ساتھ ہر بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے واقعے کا ذکر کیا گیا ہے جو اس درس گاہ میں پیش آیا۔ غرض یہ کتاب محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کی ایک بہترین انسائیکلو پیڈیا ہے جس کی مثال سرِ دست، دست یاب نہیں۔ ہاں اس بات کا افسوس ہے کہ گزشتہ نوّے برس میں پھر اس کا کوئی اور ایڈیشن نہیں نکلا حالانکہ یہ کتاب تحریکِ علی گڑھ پر کام کرنے والوں کے لیے شمعِ ہدایت کی حیثیت رکھتی ہے۔

"محمڈن کالج ہسٹری" کی اشاعت کے کوئی تیس برس بعد "تذکرۂ سرسیّد" شائع ہوئی۔ مختصر سی کتاب تھی اور اس کے مصنّف مولوی نور الرحمٰن تھے، لیکن ۱۹۵۳ء میں اِس کتاب کا نیا ایڈیشن "حیاتِ سرسیّد" کے نام سے انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ نے بڑے آب وتاب سے شائع کیا جس میں متعدد تراجم اور اضافے شامل تھے جنھوں نے کتاب کی ضخامت کو تین گنا تک بڑھا دیا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں علی گڑھ میں سرسیّد کی جو برسی منائی گئی تھی اُس میں نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے سرسیّد پر اپنا مقالہ پڑھا تھا جسے بعد میں شیروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ نے "سرسیّد کی یاد" کے زیرِ عنوان شائع کیا تھا۔ ضخامت

اس کی بھی مختصر ہی تھی۔ کوئی بیس سال قبل انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی نے بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی کتاب سر سید: حالات و افکار" شائع کی تھی۔ کتاب کا اہم اور قابلِ ذکر مضمون تو وہی تھا جو سر سید کے متعلق اُن کے خاکوں کے مجموعے "چند ہم عصر" میں شامل ہے، باقی مضامین بابائے اُردو کے جو مدت سے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے اُس میں سمیٹ دیے گئے تھے۔

مولوی محمد امین زبیری کی کتاب "تذکرہ سر سید" جو اُن کی وفات کے بعد لاہور سے شائع ہوئی تھی، بلاشبہ ایک اہم کتاب ہے اور غالباً اس موضوع پر آخری ہونے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہاں ایک کتاب ڈاکٹر سید عبداللہ کی "سر سید اور اُن کے رفقا کی اُردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ" بھی اُنھی ایام میں شائع ہوئی تھی، لیکن موضوع اُس کا شخصیت نہیں، ادب ہے۔ خان بہادر شفیع محمد خاں نے اپنی آپ بیتی "عمرِ رفتہ" میں سر سید کی زندگی کے چند ایسے واقعات لکھے ہیں جو اور کہیں نہیں ملتے۔ یہاں شاہد حسین رزاقی کی کتاب "سر سید اور اصلاحِ معاشرہ" کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے۔ کتاب دل چسپ ہے اور مصنف نے موضوع سے انصاف کیا ہے۔ اس مرحلے پر اُس کتابچے کا ذکر بھی نہایت ضروری ہے جس کا نام "علی گڑھ" ہے اور جسے مولوی محمد امین زبیری نے تصنیف کیا تھا۔ اس کتابچے کی ضخامت صرف ۳۲ صفحات ہے اور اُس میں نہایت مختصر طور پر تحریکِ علی گڑھ کے حالات پیش کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کی تہی دامنی سے ظاہر ہے کہ اس ظرفِ تنگ میں کیا کچھ سما سکا ہو گا، البتہ "علی گڑھ میگزین" نے ۱۹۵۵ء میں اپنا ایک ضخیم "علی گڑھ نمبر" شائع کیا تھا جس میں تحریکِ علی گڑھ اور اُس کے اکابر کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس خصوصی شمارے کو بعد ازاں "علی گڑھ تحریک" کے نام سے کتابی صورت میں دوبارہ شائع کیا گیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض نئے اور معلومات افزا امور بھی اس تحریک کے بارے میں اِس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں، لیکن پھر بھی وہ اس موضوع پر ایک مستقل کتاب کی قائم مقام نہیں ہو سکتی۔

جسٹس سید محمود

سر سید کی وفات کے بعد محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کی عنانِ اقتدار سر سید

کے مشہور و معروف فرزند اور ملک کے نہایت قابل اور ممتاز قانون داں سید محمود مرحوم نے جو الٰہ آباد ہائی کورٹ کے سابق جج بھی تھے، سنبھالی۔ گو کوئی شرعی شہادت موجود نہیں، تاہم یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ وہ جام و مینا سے شغف رکھتے تھے شراب خانہ خراب اُن کی جملہ صلاحیتوں کو سلب کر چکی تھی اُن کی عمر کوئی پچاس برس کے لگ بھگ تھی، لیکن بنتِ عنب کے عشق نے اُنھیں قبل از وقت بوڑھا بنا ڈالا تھا علی گڑھ کالج جیسے ادارے کے حالات کا مزید مقابلہ کرنا اب اُن کے بس کی بات نہ تھی۔ علاوہ ازیں اُس زمانے میں کالج کی مالی حالت نہایت نازک ہو چکی تھی، کیوں کہ یہ ادارہ اب سے چند سال پیشتر سرسید کی زندگی میں ایک بہت بڑے غبن سے دوچار ہو چکا تھا۔ اس لیے حالات کو رُو بہ اصلاح کرنے کے لیے ضرورت تھی کہ کالج کا انتظام و انصرام اب ایک ایسے شخص کے سپرد کر دیا جائے جو واقعی یہ فریضہ ادا کرنے پر قادر ہو۔ چناں چہ ٹرسٹیان کالج نے اس عہدے کے لیے نواب سید مہدی علی خاں بہادر کا انتخاب کیا جو ہماری ملی و سیاسی تاریخ میں نواب محسن الملک کے نام نامی سے مشہور ہیں اور جنھوں نے آگے چل کر یہ ثابت کر دیا کہ ٹرسٹیان کالج کی رائے اس معاملے میں کس قدر صائب تھی۔ سید محمود مرحوم کا ذکر "حیاتِ جاوید" میں مولانا حالی نے مختلف مقامات پر کیا ہے، لیکن وہ اس قدر مجمل ہے کہ اس سے سید محمود کے متعلق بہت کم معلومات فراہم ہوتی ہیں اُن کے متعلق غالباً پہلی اور آخری کتاب "تذکرۂ محمود" ہے جو مولوی محمد امین زبیری کی تصنیف ہے۔ کتاب مختصر سی ہے۔ جسٹس سید محمود کی زندگی کے کچھ دل چسپ واقعات کا تذکرہ شیخ ممتاز حسین جونپوری نے اپنے مضمون میں جو "علی گڑھ میگزین" کے "علی گڑھ نمبر" میں شائع ہوا تھا، کیا ہے۔ خان بہادر شیخ محمد خاں نے اپنی آپ بیتی "عمرِ رفتہ" میں اُن کے کچھ پُر لطف حالات لکھے ہیں اور حضرت اکبر الٰہ آبادی نے اُن کی وفات کا ماتم اپنے چند دردناک اشعار کی صورت میں کیا ہے۔

نوّاب محسن الملک

جسٹس سید محمود کا زمانۂ معتمدی ایک عارضی دور تھا جس کی میعاد سال بھر سے بھی کم

تھی اس لیے ہماری ملی و سیاسی تاریخ نے نواب محسن الملک مرحوم کو خانقاہِ سرسید کا اولین سجادہ نشین اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کا دوسرا آنریری سیکرٹری قرار دیا ہے۔ نواب محسن الملک مسلمانوں کے اس عظیم تعلیمی ادارے کے پورے سات سال تک کرتا دھرتا بنے رہے اور دمِ آخر تک اُنھوں نے نہ صرف اِس مادرِ علمی بلکہ مسلمانانِ ہند کی بھی خدمت کی۔ مسلمانوں کی مشہور سیاسی تحریک آل انڈیا مسلم لیگ جس نے آخر کار سینۂ ہند پر پاکستان کا ہلالی سبز پرچم لہرایا کے بانیوں میں نواب محسن الملک کا اِسمِ گرامی سرِفہرست ہونا چاہیے۔ اُنھوں نے علی گڑھ کالج کے افلاس کو دور کیا اُس کی مالی تہی دامنی کی تلافی کی اور اُس کی جڑیں اس قدر مضبوط کر دیں کہ پھر اُنھیں کسی طوفان کے حملوں سے ضعف پہنچنے کا خدشہ نہ رہا۔ بعض لوگ یورپین اسٹاف کے متعلق اُن کی نرم اور معتدل پالیسی کے ناقد ہیں جیسے کہ مولانا محمد علی نے اپنے مشہور مکتوب میں جس کا لب و لہجہ نہایت دل آزار تھا، اُن کو مخاطب کیا۔ پھر ایک اور موقع پر اُن کے اِس ذومعنی فقرے نے محسن الملک غریب کے دل پر کیا کچھ قیامت برپا نہ کی ہوگی: THE PRINCIPAL IS ARCHBOLD AND THE SECRETARY IS ARCHWEAK واضح رہے کہ کالج کے پرنسپل اُس زمانے میں مسٹر آرچ بولڈ تھے اور سیکرٹری نواب محسن الملک، ہو سکتا ہے کہ ناقدین کی تنقید مبنی بر حقائق ہو، لیکن دیکھنے والوں نے یہ بھی تو دیکھا کہ صوبہ یوپی میں اُردو ہندی قضیے میں یہی نواب اُس وقت کے یو۔پی کے ایک بدنہاد لیفٹیننٹ گورنر میکڈانل کے مقابلے پر آ گیا تھا اور اُس کی وہ تقریر جو اُس نے اس مسئلے پر لکھنو کے ایک بھرے پُرے جلسے میں کی، اُردو زبان کی تاریخ میں زندۂ جاوید ہو کر رہ گئی، لیکن جیسا کہ ہم مسلمانوں کا قاعدہ ہے کہ زندوں پر برستے ہیں اور مُردوں کو پوجتے ہیں، بعض لوگوں نے قوم اور ملک کے اِس محسن پر اتنی بے دردی اور سنگ دلی سے تنقید کی کہ وہ بے چارہ چیخ اُٹھا۔ اپنی محنتوں کا یہ ثمرہ اُس نے دیکھا تو آخر کار اُس نے بددل ہو کر استعفیٰ دے دیا جب اُس نے استعفیٰ دے دیا تو اُسے کہا گیا کہ استعفیٰ واپس لو تمہارے بغیر کام نہیں چلتا۔ اُس نے استعفیٰ واپس لینے کو تو لے لیا، مگر قوم کی بے وفائی کو نہ بھولا۔ قوم نے جو زخم لگائے تھے

وہ مرتے دم تک مندمل نہ ہوئے۔ اُس نے وصیت کر دی تھی کہ مرنے کے بعد اُس کے جسدِ خاکی کو علی گڑھ کی سرزمین کے سپرد نہ کیا جائے، بلکہ اُسے اُس کے وطن اٹاوہ میں دفن کیا جائے، لیکن طلبائے علی گڑھ کی غیرت کو جوش آ گیا۔ انھوں نے اُس گاڑی کو جس میں اُس کی نعش شملے سے اٹاوہ جا رہی تھی، علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پر روک لیا، نعش کو اُتارا اور اُسے سرسیّد کے برابر بڑے عزت و احترام سے دفن کیا۔

نواب محسن الملک کے بارے میں یوں تو بہت کچھ شائع ہوا، لیکن اُن کے متعلق کتابی شکل میں جو مواد اشاعت پزیر ہوا، اُس میں اوّلیت مولوی محمد امین زبیری کی کتاب "تذکرۂ محسن" کو حاصل ہے۔ "تذکرۂ محسن" اپنی ابتدائی صورت میں کتاب نہیں، بلکہ ایک مختصر سا کتابچہ تھی جسے مصنّف کی ذاتی عقیدت کا مظہر کہنا چاہیے، لیکن بعد ازاں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے اربابِ بست و کشاد کی تحریک پر مصنّف نے اس کتاب کے مسوّدے پر نظرِ ثانی کی اور "حیاتِ محسن" نام رکھا۔ یہ کتاب ابھی پریس میں جانے کے لیے تیار ہو ہی رہی تھی کہ مصنّف کو نواب صاحب کے متعلق کچھ اور قابلِ ذکر معلومات حاصل ہو گئیں۔ مصنّف نے خواہش ظاہر کی کہ کتاب کے مسوّدے میں ضروری ترامیم اور اضافے کر دیے جائیں، لیکن جن لوگوں کے ہاتھوں میں مسوّدہ پہنچ چکا تھا اُنھوں نے اس کی اجازت نہ دی اور کتاب کو اسی صورت میں شائع کر دیا گیا، تاہم مصنّف چین سے نہ بیٹھا اور اُس نے اگلے ہی سال ایک اور کتاب "تذکرۂ محسن" کے پُرانے نام سے پیش کر دی جسے انجمن ترقّیِ اُردو ہند نے ۱۹۳۵ء میں شائع کیا۔ مولوی محمد امین زبیری نے اپنی نامکمل آپ بیتی میں جو سہ ماہی "اُردو" کراچی کے ایک شمارے میں شائع ہوئی تھی، نواب محسن الملک کا ذکر خاصی تفصیل کے ساتھ کیا تھا۔ نواب محسن الملک کے متعلق ڈاکٹر سیّد محمود سابق وزیرِ خارجہ حکومتِ ہند جو نواب صاحب کے زمانے میں علی گڑھ کالج کے طالبِ علم رہے تھے کا مضمون جو "نقوش" لاہور کے "شخصیات نمبر" میں شائع ہوا تھا، پُرانی یادوں پر مشتمل ایک دل چسپ کاوش تھا۔

نواب محسن الملک کی عظیم شخصیت کے بارے میں یوں تو بہت کچھ شائع ہوا اور بہت کچھ شائع ہوگا لیکن اُن کے رفیقِ کار اور جانشین نواب وقار الملک نے جو چند فقرے اُن کے متعلق

لکھے وہ بہت ہی خوب ہیں اُنھوں نے فرمایا لیکچرار ہوں گے، اسپیکر ہوں گے، فلاسفر ہوں گے، قوم کے ہمدرد بھی پیدا ہوں گے، لیکن افسوس نواب محسن الملک کی سی خوبیوں کا بشر اب دیکھنے میں نہ آئے گا۔"

نوّاب وقار الملک

نواب محسن الملک کی رحلت کے بعد قوم نے اُن کی مسند پر نواب وقار الملک کو بٹھایا۔ نواب وقار الملک اپنے پیشرو نواب محسن الملک کی طرح ایک بہت چھوٹے عہدے سے بہت بڑے عہدے تک پہنچے تھے۔ زندگی کی روش قریب قریب دونوں کی ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھی، لیکن طبیعتیں بالکل متضاد اور مختلف تھیں۔ محسن الملک نہایت نرم مزاج تھے اور ایک کام یاب ڈپلومیٹ کی طرح دوست و دشمن سے اپنا کام نکال لینے کے ماہر تھے جب کہ اُن کے برعکس وقار الملک ڈپلومیسی کے قائل نہ تھے اور دو ٹوک انداز میں بات کرتے تھے۔ نواب وقار الملک، نواب محسن الملک کی نرم دلی اور معتدل مزاجی سے واقف تھے اور اُسے کالج کے لیے نیک فال نہیں سمجھتے تھے، لیکن محسن الملک کی موجودگی میں علی گڑھ میں قیام فرما ہونے کے باوجود کچھ نہ کر سکتے تھے۔ جب خود برسرِ اقتدار آئے تو حالات کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کالج کا کُلّی انتظام انگریز پرنسپل کی مٹھی میں ہو اور سیکرٹری کالج کی حیثیت اُس بھکاری کی سی ہو جو مسلمان قوم سے بھیک مانگ کر انگریز پرنسپل اور اُس کے ہم وطن اساتذہ کی جھولیاں بھرتا رہے۔ چناں چہ نواب وقار الملک نے فیصلہ کیا کہ کالج کا سیکرٹری ہی اقتدارِ اعلا کا مالک ہوگا اور پرنسپل اُس کے ماتحت ہوگا۔ نواب وقار الملک کا یہ فیصلہ اُس زمانے کے پرنسپل مسٹر آرچ بولڈ کو نہایت شاق گزرا۔ چناں چہ سیکرٹری اور پرنسپل کے درمیان ایک جنگ کی سی کیفیت رُونما ہو گئی اور معاملہ کالج کی حد سے نکل کر گورنر صوبہ یوپی تک جا پہنچا۔ صوبے کا یہ حاکم اگرچہ انگریز تھا، لیکن فتح نے نواب کے قدم چومے۔ اکبر اللہ آبادی نے اس موقع پر کہا تھا:

کالج کے دَر پہ لکھ دے کوئی آپ گولڈ سے
ختم ہو نہ سکے سیکرٹری آرچ بولڈ سے

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کے انگریز پرنسپل چوں کہ حاکم قوم سے تعلق رکھتے تھے اس لیے وہ باوجود مسلمانوں کی اس درسگاہ کے تنخواہ دار ملازم ہونے کے اپنے آپ کو انڈین سول سروس کے ارکان کی طرح سمجھتے تھے۔ سرسیّد کے زمانے میں مسٹر بیڈلنس اور مسٹر بیک قریب قریب اپنی ہی من مانی کرتے رہے اور محسن الملک کے وقت میں مسٹر مارلین اور مسٹر آرچ بولڈ علی گڑھ کالج کے سیاہ و سفید کے مالک بنے رہے، لیکن نواب وقار الملک نے اپنے دَور میں انگریز پرنسپل کا زور توڑ ڈالا اور اُسے مسلمانوں کا تنخواہ دار ملازم بنا کر رکھا۔ نوّاب وقار الملک کا زمانہ ہر لحاظ سے علی گڑھ کالج کے لیے کامیاب رہا۔ نہ صرف یہ کہ کالج کو مالی اور تعلیمی ترقّی نصیب ہوئی، بلکہ طلبہ میں آزادیِ رائے اور حرّیتِ فکر کا جذبہ بھی پیدا ہوا۔ نوّاب وقار الملک کا انتقال ۱۹۱۷ء میں ہوا، لیکن وہ اپنی مسند کو ۱۹۱۳ء ہی میں خیرباد کہہ چکے تھے۔ اُن کی وفات پر سیّد سلیمان ندوی نے "معارف" میں جو کچھ تحریر فرمایا اُس کا اعادہ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے:

"نوّاب محسن الملک کی وفات پر ہم نے تدبّر و سیاست کا ماتم کیا۔ مولانا نذیر احمد کے مرنے پر سحر نگاری اور بزم آرائی کا مرثیہ پڑھا۔ مولانا شبلی کی موت پر ہم نے علم کے فقدان پر نوحہ کیا۔ مولانا حالی کو رخصت کرتے ہوئے ہم نے سخن وری اور دقیقہ سنجی پر نالہ کیا، لیکن نوّاب وقار الملک کی رحلت پر ہم قوم کا ماتم کرتے ہیں اور الوالعزمانہ اخلاق کی گمشدگی پر فریاد، یہ ہستیِ گراں مایہ جس نے ہماری دُنیا کو ۲۷ جنوری ۱۹۱۷ء کو الوداع کہا، وہ ہمارے کارفرما قافلے کا آخری مسافر تھا۔ اُس کے بعد وہ دَور جو انقلابِ ہند کے بعد شروع ہوا تھا، ختم ہو گیا۔ وہ دَور جو انگریزی کالجوں کی کائنات نہیں، بلکہ بوریا نشین مدارس کا نتیجہ تھا، منتہی ہو گیا۔ وہ دَور جو قدیم تعلیم اور قدیم اخلاق کے نمونوں کو پیش کرتا تھا، منقطع ہو گیا۔ آیندہ ہماری قسمت کے مالک عربی مدارس کے شملے نہ ہوں گے، بلکہ انگریزی درس گاہوں کے ہیٹ اور جُبّے ہوں گے۔ اب مشرق کی قومیت پر حکومت نہیں کرے گا"

بلکہ مغرب۔ اب لیڈری اور رہبری جمہور کے لیے جوشِ دلی اور اخلاص عمل ضروری نہ ہوگا، بلکہ صرف ایک کامیاب عہدہ اور ایک عمدہ سوٹ"!

نواب وقار الملک پر پہلی کتاب "تذکرۂ وقار" تھی جو "تذکرۂ محسن" کے مصنف مولوی محمد امین زبیری کے قلم سے تھی۔ کتاب مختصر سی تھی اور اس کی ضخامت ایک سو صفحات کے لگ بھگ تھی۔ مولوی محمد امین زبیری اپنی اس کاوش سے مطمئن نہ تھے، چناں چہ اُنھوں نے نواب صاحب کے متعلق ایک نئی کتاب ترتیب دینے کی طرح ڈالی۔ مسودہ مکمل ہوا تو اُنھوں نے اُسے مسلم یونی ورسٹی پریس کے حوالے کر دیا، لیکن جب یہ کتاب "وقارِ حیات" چھپ کر سامنے آئی تو اس پر اکرام اللہ خاں ندوی کا نام بحیثیت مصنف کے درج تھا۔ مولوی محمد امین زبیری نے اس ناانصافی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، چناں چہ بعد از خرابیٔ بسیار کچھ رقم پر فیصلہ ہوا۔ مولوی محمد امین زبیری نے نواب صاحب کی سوانح حیات پھر نئے انداز سے مرتب کی۔ "تذکرۂ وقار" نام رکھا اور اپنے اہتمام سے شائع کی۔ کتاب کافی ضخیم ہے اور کوئی ساڑھے تین سو صفحات پر محیط ہے۔ "نقوش" لاہور کے "شخصیات نمبر" میں مولانا غلام رسول مہر نے بھی نواب وقار الملک مرحوم کو اپنے ایک کامیاب مضمون میں خراجِ عقیدت پیش کیا تھا۔

نواب محمد اسحاق خاں

نواب وقار الملک مرحوم کی جانشینی مشہور شاعر نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے صاحبزادے نواب محمد اسحاق خاں کے حصے میں آئی جو ریٹائرڈ سیشن جج تھے۔ نواب صاحب نے علی گڑھ کالج کی مسند کو پانچ سال تک زیب دیا۔ وہ نہایت قابل منتظم اور علم دوست آدمی تھے۔ اُن کا ادبی کارنامہ امیر خسرو کے کلام کی ترتیب و اشاعت ہے۔ اُن کے متعلق ایک مضمون محمد اسلم خاں سیفی کے قلم سے پندرہ روزہ "علی گڑھ" میں پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ دو ایک واقعات اُن کی زندگی کے پروفیسر عبدالمجید قریشی کے مضمون "علی گڑھ میں میرے چالیس سال" "مطبوعہ العلم" کراچی میں بھی نظر سے گزرے، البتہ مستقل کتاب اُن کی شخصیت اور کارناموں کے متعلق غالباً کوئی نہیں ہے۔

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے آخری سیکرٹری نواب محمد علی تھے جن کا تعلق خانوادہ سر سید سے تھا۔ وہ ریٹائرڈ کلکٹر تھے اور رکھ رکھاؤ میں پورے صاحب بہادر واقع ہوئے تھے۔ سوانح حیات اُن کی بھی کوئی شائع نہیں ہوئی، تاہم اُن کی زندگی کے بعض واقعات پروفیسر عبدالمجید قریشی کے متذکرہ بالا مضمون میں پڑھنے کو ملے۔

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد

علی گڑھ کالج کے پُرانے اور وفادار طالب علم (وفادار یوں کہ اُنھوں نے اُس زمانے کی ڈپٹی کلکٹری پر جس کے لیے تعلیم یافتہ نوجوان تمنائیں کرتے تھے، علی گڑھ کالج کی سَو، سَوا سَو روپے کی لیکچراری کو ترجیح دی تھی) اور اِسی کالج کے بعدہٗ پروفیسر اور پرنسپل اور مسلم یونی ورسٹی کے شہرِ آفاق وائس چانسلر ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کی سیرت "ضیائے حیات" بڑی آن بان سے مولوی محمد امین زبیری نے کراچی سے ۱۹۵۴ء میں شائع کی، لیکن افسوس کہ مصنف نے جو اس کتاب کے ناشر بھی تھے، اس کتاب کی تشہیر کے لیے کوئی اہتمام نہ کیا کیوں کہ پاکستان کے جملہ ناشرین و تاجرانِ کتب کی کسی فہرست میں اس کتاب کا نام دیکھنے میں نہیں آیا۔ میں خود "صدق" لکھنؤ میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا اس کتاب پر تبصرہ دیکھنے پر اس کتاب سے متعارف ہوا۔ کتاب نہایت دلچسپ اور قابلِ قدر ہے۔ اسی کتاب میں چودھری خلیق الزماں کے قلم سے ایک مختصر، مگر پُرلطف آپ بیتی نما مضمون ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کے بارے میں شامل ہے۔ دوسرا نسبتاً طویل مضمون ڈاکٹر صاحب کے شاگردِ رشید پروفیسر عبدالمجید قریشی کے قلم سے ہے جو ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو عمدگی سے اُجاگر کرتا ہے۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں بیرسٹر، وائس چانسلر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے اُن جلیل القدر طلبہ میں سے تھے جو دس بارہ برس کی چھوٹی سی عمر میں والدین کی محبت اور شفقت سے بہت دُور رہ کر یہاں داخل ہوئے۔ اُن کی جوانی اور اُن کا بڑھاپا وہیں بسر ہوئے

اور جب موت نے انھیں آرام کی میٹھی نیند سُلا دیا تو اللہ کی شان دیکھیے کہ ابدی سکون و راحت کے لیے اُسی شفیق و مشفق مادرِ علمی کی آغوش انھیں نصیب ہوئی۔ صاحبزادہ صاحب کی زندگی کی کہانی "حیاتِ آفتاب" اُن کے رفیقِ خاص مولوی حبیب اللہ خاں ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے۔ "حیاتِ آفتاب" چھتیس سال کے طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد ۱۹۵۶ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئی۔ "دیر آید درست آید" کی مثل کے مصداق اگرچہ اس کتاب کی اشاعت غیر معمولی تاخیر کی نذر ہوئی، لیکن جب منظرِ عام پر آئی تو عجب حسن نفاست کے ساتھ نفسِ مضمون، کتابت، طباعت، کاغذ، جلد اور گرد پوش، غرض ہر لحاظ سے بے نظیر، واقعی صاحب سوانح کی سوانح اسی انداز میں چھپنا چاہیے تھی۔ "حیاتِ آفتاب" نہ صرف صاحبزادہ صاحب کی زندگی کے نشیب و فراز پر مشتمل ہے، بلکہ تحریک علی گڑھ کی داستانِ عمل بھی بڑے سنجیدہ اور متین لب و لہجے میں پیش کرتی ہے۔ صاحبزادہ صاحب کی علی گڑھ سے محبت کا یہ عالم تھا کہ جب ۱۸۹۷ء میں وہ کالج میں قانون کے پروفیسر مقرر ہوئے تو انھوں نے اپنی تنخواہ لینے سے انکار کر دیا اور اعزازی طور پر ہی یہ فریضہ ادا کرتے رہے۔ "حیاتِ آفتاب" میں مولوی عنایت اللہ، مولانا عبدالماجد دریابادی اور علامہ عبداللہ یوسف علی مشہور مترجم قرآن کے مضامین پڑھنے کی چیزیں ہیں۔ چودھری خوشی محمد ناظر کی نظم بھی بہت خوب ہے۔

نواب سر محمد مزمل اللہ خاں شیروانی

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی رحلت کے بعد علی گڑھ کے مشہور شیروانی خاندان کے رُکنِ رکین اور یوپی کے مشہور سیاست دان نواب سر محمد مزمل اللہ خاں شیروانی مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ وہ کوئی دو سال سے زائد عرصے تک اس عہدے پر فائز رہے۔ نواب صاحب بہت فیاض اور بڑے ہی مخیّر واقع ہوتے تھے۔ چناں چہ اُن کی وفات پر مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے "معارف" اعظم گڑھ میں جو مضمون شائع ہوا تھا اُس میں انھوں نے نواب صاحب کو "حاتمِ یوپی" کا خطاب دیا تھا۔ نواب صاحب چھتاری نے اپنی آپ بیتی "یادِ ایام" جلد دوم میں اُن کا ذکر نہایت اچھے الفاظ میں کیا ہے۔ شیروانی خاندان

کے ایک پرانے اور معمر ادیب مولوی محمد مقتدیٰ خاں شیروانی اُن کی سوانح حیات "حیاتِ مسعود" کے نام سے لکھ رہے تھے، لیکن اُن کی اچانک وفات کے سبب یہ کام پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔

سر سیّد راس مسعود

۱۹۳۹ء میں آل انڈیا ریڈیو دِلّی نے ایک دل چسپ اور معلومات افزا مقالات کا سلسلہ بعنوان "کیا خوب آدمی تھا" شروع کیا تھا۔ اس سلسلے میں جہاں مولانا الطاف حسین حالیؔ، مولانا راشد الخیری، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، فصیح الملک مرزا داغ دہلوی، مسیح الملک حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، علامہ اقبال، اور مولانا محمد علی پر ملک کے مشاہیر اُدبا کے مضامین نشر ہوتے وہاں پر وفیسر خواجہ غلام السیدین نے سر سیّد کے پوتے، جسٹس سیّد محمود کے بیٹے، خاندانِ سیّد کے گُل سرسبد اور سر سیّد کے صحیح جانشین نواب مسعود جنگ بہادر سر سیّد راس مسعود سابق وائس چانسلر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے متعلق ایک دل چسپ و دل آویز مقالہ پیش کیا تھا۔ یہ تمام مضامین جن کی تعداد کوئی درجن بھر تھی، بعد ازاں آل انڈیا ریڈیو کی اجازت سے حالی پبلشنگ ہاؤس دلّی نے ایک مختصر سی خوب صورت کتاب "کیا خوب آدمی تھا" میں شائع کیے تھے۔ خواجہ غلام السیدین نے اس مضمون میں نواب مسعود جنگ مرحوم سے اپنی ایک یادگار ملاقات کی رُوداد جن الفاظ میں رقم فرمائی ہے اُن سے اس عظیم المرتبت انسان کی دل ربا شخصیت اپنی پوری شانِ یکتائی کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اس یگانۂ روزگار انسان کا ایک نہایت ہی حسین وجمیل مرقّع ہمارے نام ور اہلِ قلم جناب رئیس احمد جعفری نے بھی اپنے خامۂ رنگین رقم سے کھینچا ہے۔ ۱۹۳۷ء میں اُن کی وفات پر انجمن ترقّیِ اُردو ہند کے نقیب رسالہ "اُردو" نے اُن کی یاد میں ایک ضخیم خصوصی شمارہ شائع کیا تھا۔

علامہ اقبال نے سیّد راس مسعود کی اچانک اور بے وقت رحلت کی خبر سُنی تو بے تاب ہو گئے۔ شاعرِ مشرق سے سیّد صاحب مرحوم کے بہت گہرے اور بے حد مخلصانہ تعلقات تھے۔ مسعود مرحوم کی وفات سے کچھ عرصے قبل علامہ کا بھوپال تشریف لے جانا انھی تعلقات خصوصی کی ایک شق تھی۔ نواب سر حمید اللہ خاں والیٔ بھوپال نے علامہ اقبال کی جو گراں قدر

امداد ماہانہ وظیفے کی صورت میں فرمائی تھی، اُس میں بھی مسعود مرحوم ہی کا ہاتھ تھا۔ چناں چہ "ارمغانِ حجاز" میں اُن کی نظم مسعود مرحوم کے بارے میں اُن کے انھی جذبات واحساسات کی آئینہ دار ہے۔ اُن کی اس نظم کے اس شعر سے سیّد راس مسعود کی عظمت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے:

زوالِ علم و ہنر مرگِ ناگہاں اُس کی
وہ کارواں کا متاعِ گراں بہا مسعود

مولوی عبدالرزاق کانپوری مصنّف "البرامکہ" تحریر فرماتے ہیں کہ جب سیّد راس مسعود صاحب وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے بھوپال تشریف لائے تو انھیں بلا بھیجا۔ وہ حاضر ہوئے تو اُن کی بہت تعظیم و تکریم کی پھر جو باتوں کا سلسلہ جاری ہوا تو مولوی صاحب نے جنھوں نے سرسیّد اور جسٹس محمود کا زمانہ دیکھا تھا اُن کو اُن کے بچپن کے حالات و واقعات سُنائے۔ اِن واقعات کو سُن کر وہ بہت خوش ہوئے اور فرمائش کی کہ اگر دادا جان، اباجان اور اُن کے احباب کے تذکرے اِسی رنگ میں لکھ دیے جائیں تو کیا ہی اچھا ہو۔ مولوی صاحب نے اس کام کی ہامی بھرلی اور "یادِ ایّام" کے نام سے ایک بہت ہی دل چسپ اور پُرلطف کتاب مرتب کی جس میں سرسیّد، جسٹس سیّد محمود، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، منشی ذکاءاللہ، مولانا حالی، مولوی محمد حسین آزاد، مولوی چراغ علی، نواب محسن الملک، نواب وقارالملک اور علی گڑھ تحریک کے بعض دوسرے بزرگوں کے متعلق وہ مواد جمع کیا، جو ہمیں کسی دوسرے ذریعے سے میسّر نہ آسکتا تھا۔ جب یہ کتاب مرتب ہو کر منظرِ عام پر آئی تو اُس کی فرمائش کرنے والا قبر کے ایک اندھیرے گوشے میں آسودۂ خاک تھا۔ مولوی عبدالرزّاق صاحب "یادِ ایّام" کی ایک جلد لے کر اُن کے مرقد پر پہنچے اور بچشمِ گریاں یہ شعر پڑھا:

لیے پھرتی ہے بلبل چونچ میں گُل
شہیدِ ناز کی تربت کہاں ہے

پروفیسر جلیل قدوائی نے سرسیّد راس مسعود کی یاد میں کراچی میں سرراس مسعود ایجوکیشن اینڈ کلچر سوسائٹی آف پاکستان قائم کی ہے اور اُس کے زیرِ اہتمام اُن کی شخصیت پر دو مجموعے "مرقعِ مسعود" اور "ارمغانِ مسعود" شائع کیے جا چکے ہیں۔

نواب محمد اسماعیل خاں

نواب اسحاق خاں کے صاحبزادے اور سرکردہ مسلم لیگی سیاست دان نواب اسماعیل خاں بھی ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کے بعد کچھ عرصہ وائس چانسلر رہے۔ نواب صاحب کے متعلق اپنے تاثرات پروفیسر رشید احمد صدیقی نے قلم بند کیے تھے، جو اُن کے خاکوں کے مجموعے بعنوان "ہم نفسانِ رفتہ" میں شامل ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حُسین خان

۱۹۴۷ء میں ہندُستان تقسیم ہوا اور پاکستان عالمِ وجود میں آیا۔ یہ زمانہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے لیے بڑا نازک تھا کیوں کہ ہندو اور سکھ فرقہ پرست ہندُستان میں ہر اُس چیز کو تباہ و برباد کرنے پر تُلے ہوتے تھے جس کا مسلمانوں کے ساتھ ذرا سا بھی تعلق تھا۔ نواب اسماعیل خاں وائس چانسلر گو ہندُستانی شہری تھے، لیکن ابھی کل تک وہ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے ایک سرکردہ رُکن تھے اس لیے ہندُستانی حکومت کی نظر میں وہ ناپسندیدہ تھے۔ قریب تھا کہ مسلم یُونی ورسٹی کو زبردست نقصان پہنچے، لیکن ذاکر حُسین خاں اِس موقع پر ڈھال بن کر سامنے آگئے۔ گو علی گڑھ سے وہ ایک طویل مدت سے بے تعلق سے تھے، لیکن تھے تو علی گڑھ ہی کے سپوت۔ اُن کا وجود بحیثیت وائس چانسلر، مسلم یونی ورسٹی کے لیے نعمتِ عظمیٰ ثابت ہوا اور سرسید کی یہ نشانی ملیامیٹ ہوتے سے بچ گئی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نہ صرف اُن کے ہم عصر تھے، بلکہ اُن سے ڈاکر صاحب کے دیرینہ مراسم بھی تھے۔ اِسی رفاقت نے اُن سے ایک زمانے میں کتاب "ذاکر صاحب" لکھوائی۔ اِنھی رشید صاحب نے "مسلم یُونی ورسٹی گزٹ کے ذاکر نمبر" میں اُنھیں ایک یادگار مضمون کی صورت میں خراجِ تحسین پیش کیا اور پھر اپنی علی گڑھ بیتی "آشفتہ بیانی میری" میں بھی وہ محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج علی گڑھ کے ذہین و فطین طالب علم ذاکر حُسین خاں کو نہیں بھولے۔

مولانا شبلی نعمانی

میرے اس مضمون کا رُخ علی گڑھ کالج کے آنریری سیکرٹری صاحبان اور مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر حضرات کی جانب مڑ گیا، اس لیے سرسید کے کچھ نورتنوں کا ذکر درمیان ہی رہ گیا۔ اب کچھ باتیں اُن کے متعلق بھی تحریر کرتا ہوں:

سرسید کے زمانے میں مولانا شبلی نعمانی علی گڑھ کالج میں فارسی زبان کے پروفیسر رہے۔ اُن کی ضخیم سوانح حیات، "حیاتِ شبلی" اُن کے شاگردِ رشید مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے عرصہ ہوا نکل چکی ہے۔ حُسنِ اتفاق ملاحظہ فرمایئے کہ جس شخص نے مولانا حالی کی "حیاتِ جاوید" کو کتاب المناقب سے تعبیر کیا ہو خود اُس کی سوانح حیات ناقدین کی نگاہوں میں سراسر کتاب المناقب ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مولوی محمد امین زبیری کو جنھوں نے بقول اُن کے سید سلیمان کو اس کتاب کی تالیف میں قابلِ ذکر امداد بہم پہنچائی تھی، ایک علاحدہ کتاب "ذکرِ شبلی" اس موضوع پر لکھنا پڑی کیوں کہ انھیں یہ شکایت تھی کہ سید سلیمان ندوی نے اپنے اُستادِ محترم کے متعلق وہ مواد پیش کرنے سے پہلوتہی کی تھی جو حقائق پر مشتمل تو ضرور تھا، لیکن شبلی کے موافق نہ پڑتا تھا۔ اس مواد میں اُن کی زندگی کا وہ دور خصوصیت سے شامل تھا جسے اُن کی حیاتِ معاشقہ کہا جاتا ہے۔ عطیہ فیضی سے شبلی کے یک طرفہ معاشقے کی داستان پر چند سال ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی کی کتاب "شبلی کی حیاتِ معاشقہ" آچکی ہے۔ علاوہ ازیں شیخ محمد اکرام نے "شبلی نامہ" میں شبلی کی زندگی کو ایک غیر جانب دار مبصر کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور اُن کی حیاتِ معاشقہ پر دل چسپ بحث کی ہے۔ مولوی محمد مہدی نائب مہتمم دفترِ تاریخ بھوپال نے بھی شبلی کے حالات "تذکرۂ شبلی" کی صورت میں لکھے تھے۔ کتاب بالکل مختصر سی تھی۔ شبلی کو گزشتہ برسوں میں "البصیر" چنیوٹ اور "ادیب" علی گڑھ کے ضخیم خصوصی شماروں نے بھی زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا تھا۔

مولوی ذکاء اللہ

شمس العلما مولوی ذکاء اللہ کے متعلق اُن کے ایک گہرے دوست اور عقیدت مند بادری

سی ایف اینڈریوز پروفیسر سینٹ اسٹیفنز کالج دِلّی نے ایک کتاب انگریزی زبان میں ZAKAULLAH OF DELHI کے نام سے اُن کی وفات ۱۹۱۰ء کے معابعد لکھی تھی۔ اِس کتاب کا نہایت سلیس اور شستہ ترجمہ اُردو میں اینڈریوز صاحب ہی کے ایک شاگرد جناب ضیاء الدین احمد برنی نے کیا تھا جو "زمانہ" کان پور میں ۱۹۳۰ء میں بالاقساط شائع ہوا اور مختلف علمی و ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوا تھا، ۱۹۵۲ء میں یہی قسطیں "تذکرۂ مولوی ذکاء اللہ" کی صورت میں "تعلیمی مرکز" کراچی نے شائع کیں۔ اِس کتاب کا مقدمہ جو مولوی ذکاء اللہ کے متعلق تاثرات پر مشتمل تھا، شمس العلما ڈپٹی مولوی نذیر احمد دہلوی کے قلم سے تھا اور ایک نایاب تحریر ہونے کی بنا پر اہمیت کا حامل تھا۔ مولوی ذکاء اللہ بہت بڑے عالم اور مصنّف تھے اور اُنھوں نے سرسید کو کالج کے معاملات میں بڑی امداد بہم پہنچائی تھیں۔

مولوی نذیر احمد دہلوی

شمس العلماء ڈپٹی مولوی نذیر احمد دہلوی کا شمار بھی بابائے علی گڑھ کے نورتنوں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک زبردست عالم ہونے کے علاوہ ایک فصیح البیان مقرر اور بلند پایہ خطیب بھی تھے۔ علی گڑھ تحریک میں اُن کی طلاقتِ لسانی کا خاص حصّہ ہے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے سالانہ اجتماعات میں اُنھیں ہمیشہ خصوصی دعوت دے کر بلایا جاتا تھا اور اُنھیں پہنچنے میں ذرا بھی تاخیر ہو جاتی تھی تو تار پر تار دوڑنے لگتے تھے۔ ڈپٹی صاحب اعلا انشا پرداز اور ایک کامیاب ادیب بھی تھے۔ اُن کے قلم نے "مراۃ العروس"، "بنات النعش"، "ابن الوقت"، "فسانۂ مبتلا" اور "توبۃ النصوح" جیسے بامقصد اور اصلاحی ناول تخلیق کیے۔ اُن کے متعلق پہلی کتاب محمد مہدی نائب مہتمم دفتر تاریخ بھوپال کی "تذکرۂ مولوی نذیر احمد" ہے جس میں ڈپٹی صاحب کے حالات اور کارنامے مختصر طور پر بیان کیے گئے ہیں۔ اِس کتاب کی اشاعت کے بعد سیّد افتخار عالم مارہروی نے مولانا حالی کے تتبع میں "حیات جاوید" کو سامنے رکھ کر ڈپٹی نذیر احمد کی مفصّل سوانح حیات "حیات النذیر" تصنیف کی۔ افسوس کہ ایک مدّتِ دراز گزرنے کو آئی "حیات النذیر" کے پہلے ایڈیشن کے بعد پھر

اُس کا کوئی اور ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔ ڈپٹی صاحب کے شاگرد اور مشہور مزاح نگار مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی نے اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں ایک مضمون "نذیر احمد کی کہانی: کچھ اُن کی کچھ اپنی زبانی" لکھا جو کبھی اُن کے مجموعہ مضامین "مضامینِ فرحت" میں شامل تھا اور ان دنوں اسی نام کی ایک خوب صورت کتاب کی شکل میں بھی ملتا ہے۔ ڈپٹی صاحب کے پوتے اور مشہور ادیب جناب شاہد احمد دہلوی نے بھی ایک مضمون اپنے جدِ امجد کے متعلق تحریر فرمایا تھا جو کبھی "نقوش" لاہور میں شائع ہوا تھا اور اب اُن کے مجموعہ مضامین "گنجینۂ گوہر" میں شامل ہے۔

مولوی چراغ علی

نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی بھی تحریکِ علی گڑھ کے اہم ستون تھے۔ اُن کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے اپنے اُس مضمون میں کیا ہے جو اُن کی کتاب "چند ہم عصر" میں شامل ہے۔ اس مضمون کے علاوہ اُن کی شخصیت پر ایک مضمون سید غلام پنجتن شمشاد کا لکھا ہوا "نقوش" کے "شخصیات نمبر" میں بھی دیکھتے ہیں۔ آیا تھا یہی مضمون بعد ازاں شمشاد صاحب کی کتاب "حیدر آباد کے بڑے لوگ" میں بھی دوبارہ شائع ہوا تھا۔

مولانا الطاف حسین حالی

مولانا خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم کے متعلق پہلی کتاب مولوی محمد امین زبیری کی "تذکرہ حالی" تھی جو ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی۔ بزرگانِ علی گڑھ کے متعلق مولوی محمد امین زبیری نے ابتدا میں جو کتابیں لکھیں وہ بالکل مختصر تھیں جیسے "تذکرہ محسن" "تذکرہ وقار" اور "تذکرہ محمود" جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ اِسی طرح مولانا حالی کا یہ تذکرہ بھی نہایت مختصر تھا۔ گو "تذکرہ محسن" اور "تذکرہ وقار" کی ضخامت بعد کے ایڈیشنوں میں بہت زیادہ بڑھا دی گئی تھی، لیکن "تذکرہ محمود" اور "تذکرہ حالی" پر وہ نظرِ ثانی نہ کر سکے۔ مولانا حالی مرحوم پر قابل ذکر کتاب "یادگارِ حالی" ہے جس کی مصنفہ ہندوستان کی مشہور افسانہ نگار اور حالی مرحوم کی نواسی صالحہ عابد حسین صاحبہ ہیں۔ کتاب بڑے دل چسپ انداز میں

ترتیب دی گئی ہے اور اُس کا مقدمہ مولانا ابوالکلام آزاد کے قلم سے اُن کے خاص رنگ میں ہے، لیکن اُن کے ہم وطن شیخ اسمٰعیل پانی پتی کی کتاب "ذکرِ حالی" بھی کچھ کم اہم نہیں۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق، مولانا حالی مرحوم کی شخصیت سے بڑے متاثر تھے۔ انھوں نے اپنے مجموعۂ مضامین "چند ہم عصر" میں مولانا حالی کا ذکر بڑے ادب و احترام سے کیا ہے۔

مولوی سمیع اللہ

مولوی سمیع اللہ سب جج علی گڑھ کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے تحریکِ علی گڑھ کو پروان چڑھانے میں سرسید کا نہایت جرأت و ہمت کے ساتھ ساتھ دیا۔ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو جب علی گڑھ میں "مدرسۃ العلوم مسلمانان" کی بنیاد رکھی جا رہی تھی تو مولوی سمیع اللہ بھی بابائے علی گڑھ کے ہمراہ تھے اور اُنھی کے سخت اصرار پر سرسید نے اب یہ قدم اُٹھایا تھا۔ مولوی سمیع اللہ کے متعلق پہلی اور آخری کتاب "تذکرۂ مولوی سمیع اللہ" ہے جس کے مصنف سید عبدالکریم بی اے ایل ایل بی مجسٹریٹ بھوپال تھے۔ "تذکرۂ حالی" کی طرح "تذکرۂ مولوی سمیع اللہ" بھی ضخیم نہیں ہے۔ ساٹھ ستر صفحات کی مختصر سی کتاب ہے۔ شیخ محمد اکرام نے بھی "موجِ کوثر" میں دو تین صفحات مولوی سمیع اللہ مرحوم کے لیے وقف کیے ہیں۔

سر آغا خاں

سر آغا خاں کی قومی و ملی سرگرمیوں کا آغاز اُن کے عنفوانِ شباب کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ ۱۸۹۵ء میں جب وہ صرف اٹھارہ برس کے تھے، نواب محسن الملک کی دعوت پر بمبئی سے علی گڑھ تشریف لائے۔ سرسید ابھی زندہ تھے اور وہ اُنھی کے مہمان ہوئے۔ اِن ایام میں اُنھوں نے مسلمانوں کی اس نئی درس گاہ کو بڑے قریب سے دیکھا اور سرسید کی اِس مخلصانہ کوشش سے بے حد متاثر ہوئے۔ علی گڑھ سے رخصت ہوتے وقت اُنھوں نے کالج کی امداد کے لیے پانچ صد روپے سرسید کی خدمت میں پیش کیے اور سرسید اور نواب محسن الملک کے ذاتی ملازموں کو بھی ڈھائی ڈھائی سو روپے کی رقمیں عنایت فرمائیں۔ سرسید

نے جیسا کہ اُن کی عادت تھی، یہ رقم بھی اپنے ملازموں سے لے کر کالج کے مدات میں فنڈ میں جمع کر دی۔ اِس واقعے کا اُن دِنوں اچھا خاصا چرچا ہوا تھا۔ اپنے اِس پہلے دورے کے بعد سر آغا خاں متعدد دفعہ علی گڑھ آئے اور مسلمانانِ ہند کی اس تعلیمی تحریک کو کام یابی سے ہم کنار کرنے کے لیے اُنھوں نے خاص کردار ادا کیا۔ اُنھوں نے مُسلم یونی ورسٹی کی تاسیس اور اس کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کے لیے مسلسل ایک سال تک تمام ملک کا دورہ کیا۔ اِس دورے میں مسٹر شوکت علی (بعدہٗ مولانا) اُن کے ہم رکاب تھے جو اُن کے سیکرٹری کے فرائض بھی انجام دے رہے تھے۔ مسٹر شوکت علی اُن دِنوں ریاست بڑودہ میں محکمۂ افیون میں ایک اونچے عہدے پر فائز تھے اور طویل رخصت لے کر مسلم یونی ورسٹی کے لیے چندے کی اِس مہم میں پُرجوش حصہ لے رہے تھے۔ سر آغا خاں نے یہ مہم نہایت کام یابی کے ساتھ سر کی اور تیس لاکھ روپے کی خطیر رقم جمع کر کے قوم کی خدمت میں پیش کی۔ چندے کی اِس رقم میں غریب سے غریب مسلمان کی دو آنے کی حقیر سی رقم سے لے کر اُمرا اور رؤسا کے لاکھوں روپوں کے عطیات شامل تھے۔ سر آغا خاں نے اپنی وفات (۱۹۵۷ء) سے کچھ عرصے قبل انگریزی میں اپنی یادداشتیں قلم بند کی تھیں۔ مولوی محمد امین زبیری نے بھی اپنی کتاب "سر آغا خاں" میں اُن کی شخصیت اور کارناموں کو اُجاگر کیا تھا۔ راقم الحروف کا بھی ایک مقالہ سر آغا خاں کے متعلق عرصہ ہوا "لیل و نہار" میں شائع ہوا تھا۔ علاوہ ازیں نواب صاحب چھتاری نے اپنی آپ بیتی "یادِ ایام" میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اُس اجلاسِ علی گڑھ کا بھی ذکر کیا ہے جس کے صدر سر آغا خاں تھے اور مقررِ خصوصی شمس العلما ڈپٹی مولوی نذیر احمد دہلوی۔ اِس اجتماع میں ڈپٹی صاحب نے سر آغا خاں کی جانب مخاطب ہو کر یہ قطعہ پڑھا تھا

آفاق ہا گردیدہ ام مہرِ بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

جس کی علی گڑھ کی محفلوں میں برسوں دھوم رہی۔

مولانا شوکت علی

مولانا شوکت علی مرحوم ایم اے او کالج علی گڑھ کے ابتدائی طلبہ میں سے تھے۔ در حقیقت

کپتان کرکٹ ٹیم کے ۔اُنھوں نے اپنے زمانے میں بڑا نام پایا تھا۔ وہ علی گڑھ کے قدیم طلبہ کی مجلس کے عرصے تک سیکرٹری رہے اور علی گڑھ کے معاملات میں ایک مدّت تک دخیل بھی رہے۔ جناب رئیس احمد جعفری نے کوئی تیس سال ہوتے اپنے ماہنامہ ریاض" کراچی کا "شوکت علی نمبر" نکال کر انھیں خراجِ تحسین ادا کیا تھا۔ ابھی کچھ عرصہ ہوا اُن کی ایک ضخیم کتاب "علی برادران" شائع ہوئی تھی جس میں انھوں نے مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کے متعلق کچھ ایسے حقائق کو بے نقاب کیا تھا جو ابھی تک یا تو زمانے کی نگاہوں کے سامنے ہی نہ آئے تھے یا اُن میں سے کچھ کے نقوش امتدادِ زمانہ سے مدھم پڑ چکے تھے اور جنھیں اُجاگر کرنے کی فوری ضرورت لاحق تھی۔

مولانا محمد علی جوہر

مولانا محمد علی جوہر بھی علی گڑھ ہی کے سپوت تھے۔ مولانا محمد علی مرحوم کے متعلق سب سے پہلی کتاب "سیرتِ محمد علی" ہے جس کے مصنف جناب رئیس احمد جعفری ہیں۔ جہاں تک مولانا محمد علی کی شخصیت اور اُن کے کارہائے نمایاں کا تعلق ہے، اُردو زبان میں میری معلومات کے مطابق ابھی تک "سیرتِ محمد علی" سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی۔ مولانا محمد علی نے اپنے خود نوشت حالات بزبانِ انگریزی MY LIFE:A FRAGMENT تحریر فرمائے تھے جن کا اُردو ترجمہ پروفیسر محمد سرور کی کتاب "محمد علی: تاریخ اور تاریخ ساز" میں شامل ہے۔ ویسے سرور صاحب کی یہ کتاب خود بھی نفسِ مضمون پر ایک وقیع اور بلندپایہ تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے۔ خواجہ احمد عباس نے بھی مولانا محمد علی کے بارے میں ایک چھوٹی سی کتاب لکھی تھی جو مختصر ہونے کے باوجود قابلِ مطالعہ تھی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی برسوں ایک رفیقِ کار کی طرح مولانا محمد علی کے قریب رہے۔ انھوں نے اپنی کتاب "محمد علی: ذاتی ڈائری" میں مولانا محمد علی کے گوناگوں واقعاتِ زندگی کو جس انداز میں پیش کیا تھا وہ اُنھی کا حصّہ تھا۔ مولانا کے اندازِ نگارش اور اُسلوبِ بیان کے تو سب ہی قائل ہیں، لیکن اُن کی یہ کتاب تو اُردو ادب و سیاست میں اپنی مثال آپ ہے۔ انھوں نے سیرت نگاری میں یقیناً انوکھا تجربہ کیا اور اُسے نہایت کامیابی سے نبھایا۔

سر سید رضا علی : "اعمال نامہ"

اب میں اُردو زبان کی چند ایسی آپ بیتیوں کا ذکر کرتا ہوں جو علیگ حضرات کے قلم سے نکلیں اور جن کے دامن میں مادرِ درس گاہ علی گڑھ کا ذکرِ جمیل ناگزیر تھا۔ اِن کتابوں میں اوّلیت کا شرف سر سید رضا علی کے خود نوشت تذکرے "اعمال نامہ" کو حاصل ہے جو ۱۹۴۳ء کے اواخر میں منصۂ شہود پر آیا۔ بلحاظ آپ بیتی کے بھی یہ باغ و بہار کتاب اُردو زبان کی خود نوشت سیرتوں میں گُلِ سر سبد کی حیثیت رکھتی ہے۔ سر سید رضا علی، سر سید کی وفات کے معاً بعد محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ اُس وقت کالج کی حالت ناگفتہ بہ تھی جسٹس سید محمود کالج کے آنریری سکرٹری تھے، لیکن اِس ادارے کے معاملات کو سنبھالنے کی سکت اب اُن میں نہیں تھی چناں چہ سید رضا علی کے دیکھتے دیکھتے کالج کے انتظامی حالات بدلے اور سر سید کی مسند پر نواب محسن الملک فائز ہوتے۔ اقتدار کی تبدیلی پر کالج کے ٹرسٹیوں اور جسٹس سید محمود کے درمیان جو کش مکش ہوئی اور نواب محسن الملک نے اس مرحلے پر جس انداز میں اپنا کردار پیش کیا، اُسے سید رضا علی نے "اعمال نامہ" کے صفحات میں کھُل کر لکھا ہے۔ سید رضا علی نواب محسن الملک کے بہت بڑے عقیدت مند تھے اور اُن سے اُن کے نیاز مندانہ مراسم تھے۔ "اعمال نامہ" میں اُنھوں نے نواب محسن الملک اور اُن کے جانشین نواب وقار الملک کے متعلق اپنے تاثرات بڑے دل چسپ انداز میں تحریر کیے ہیں۔ اِن بزرگوں کے بارے میں "اعمال نامہ" کے یہ چند اوراق اِن کتابوں پر بھاری ہیں جو اِس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ اِن کے علاوہ کالج میں امیر حبیب اللہ خاں والیٔ کابل کی تشریف آوری اور سر آغا خاں کی پذیرائی کا آنکھوں دیکھا حال اُنھوں نے "اعمال نامہ" کے صفحات میں لکھا ہے۔ سید رضا علی نے اُس زمانے کے علی گڑھ کالج کے انگریز پرنسپلوں مسٹر تھیوڈور ماریسن، مسٹر آرچ بولڈ اور مسٹر ٹاول کے متعلق "اعمال نامہ" میں جو کچھ روشنی ڈالی ہے اُس سے اُس زمانے کے سیاسی حالات سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ "اعمال نامہ" کی زبان میں حلاوت اور شیرینی ہے اور سچ پوچھیے تو قندِ مکرّر کا لطف میں نے "اعمال نامہ"

کی ہر سطر میں اُٹھایا ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ وہ پیشہ ور ادیب نہیں ہیں اور اُن کی تمام عمر دشتِ سیاست کی سیاحی میں گزری ہے۔

نوّاب صاحب چھتاری: "یادِ ایام"

نوّاب حافظ سر محمد احمد سعید خاں چھتاری بھی پُرانے علیگ ہیں۔ اُن کی آپ بیتی "یادِ ایام" کا ادبی مرتبہ اُتنا بلند تو نہیں کہ جتنا "اعمال نامہ" کا ہے تاہم یہ کتاب اندازِ نگارش کے لحاظ سے ہلکی پھلکی اور شگفتہ اور واقعات کے لحاظ سے جان دار ہے۔ "یادِ ایام" کی ابھی دو جلدیں منظرِ عام پر آئی ہیں اور اُن میں ۱۹۳۴ء کے آخر تک کے واقعات شامل ہو گئے ہیں۔ "یادِ ایام" کی جلد اوّل میں اُنھوں نے علی گڑھ میں اپنے زمانۂ طالب علمی کا کچھ حال لکھا ہے۔ اور اِس ضمن میں اپنے بعض اساتذہ میر ولایت حُسین، ماسٹر نور الحسن اور ماسٹر قیام الدین کا ذکر کیا ہے۔ الحاج خواجہ ناظم الدین اور سر سکندر حیات خاں اُن کے ہم سبق تھے۔ اُنھوں نے اِن دونوں مرحومین کا ذکر بڑی محبت سے کیا ہے اور اِن حضرات کے ساتھ اپنا ایک گروپ فوٹو گراف بھی پیش کیا ہے جس میں یہ حضرات دس دس بارہ بارہ سال کی عمر کے تشریف فرما ہیں۔ سر راس مسعود نبیرۂ سر سیّد گو اُن سے سینئر تھے، لیکن ملاقات دونوں حضرات کی گاہ بگاہ ہوتی رہتی تھی۔ اس لیے نوّاب صاحب نے اُنھیں بھی "یادِ ایام" میں یاد فرمایا ہے۔ "یادِ ایام" کی جلد دوم میں اُنھوں نے سر راس مسعود کا مسلم یونی ورسٹی کی وائس چانسلری سے مستعفی ہونے کا واقعہ لکھا ہے ایک اور موقع پر اُنھوں نے اِسی جلد میں سر شاہ محمد سلیمان سابق چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ جو کچھ عرصہ مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے تھے کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے نوّاب صاحب چھتاری نے اس واقعہ کا ذکر بھی "یادِ ایام" جلد دوم میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے جب سر راس مسعود کے بعد اُنھیں مسلم یونی ورسٹی کا وائس چانسلر بنایا جا رہا تھا۔ اس ضمن میں اُنھوں نے ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد، سر فضل حُسین اور نوّاب سر حمید اللہ خاں والیِ بھوپال کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

حکیم احمد شجاع: "خوں بہا"

مشہور ادیب اور ڈراما نگار حکیم احمد شجاع ۱۹۰۹ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اِس تعلیمی ادارے کی باگ ڈور نواب وقارالملک اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے تھے۔ حکیم صاحب نے اپنی آپ بیتی "خوں بہا" میں نواب صاحب کا ذکر بڑی عقیدت اور احترام سے کیا ہے اور انھیں اسلامی عظمت کا آخری علمبردار قرار دیا ہے۔ حکیم صاحب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں سے بھی بے حد متاثر نظر آتے ہیں اور اُن کی صورت، سیرت اور ایثار کا ذکر کرتے وقت فرطِ ادب سے جُھک جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں اُنھوں نے پرنسپل مسٹر آرچ بولڈ، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد، میر ولایت حُسین، مولوی عبدالباقی، پروفیسر ابوالحسن، مولانا عباس حُسین، مولانا سلیمان اشرف اور اپنے دیگر اساتذہ کرام کا بھی ذکر کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ "اُس وقت یہ آسمانِ علم وفضل روشن ستاروں سے بھرپور تھا اور درخشاں نجوم وکواکب سے معمور"!

پروفیسر رشید احمد صدیقی: "آشفتہ بیانی میری"

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے طنز ومزاح کو شخصیت نگاری میں سمو کر ایک دل کش اور حسین امتزاج "آشفتہ بیانی میری" کی شکل میں پیش کیا ہے "آشفتہ بیانی میری" اُن کے زمانہ طالب علمی کے علی گڑھ کی پُر کیف داستان ہے جس میں مصنف کی اپنی زندگی کے مدوجزر کے ساتھ ساتھ اس عظیم ادارے کے خدوخال بھی پوری رعنائی وزیبائی کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں جسے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کہا جاتا تھا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنی اس علی گڑھ بیتی میں علی گڑھ کے بعض ممتاز طلبہ مثلاً ڈاکٹر ذاکر حُسین خان، مولانا اقبال سہیل، آغا حیدر حسن اور خواجہ غلام السیدین وغیرہ جو بعد ازاں متحدہ ہندُستان کے بہت بڑے آدمی بنے کے لڑکپن کی تصاویر بڑی خوب صورتی سے کھینچی ہیں اور اپنے بہت سے اساتذہ کا ذکر بڑی عقیدت اور محبت سے کیا ہے۔ علی گڑھ کی بڑی شخصیتوں کے ساتھ ساتھ

انھوں نے کالج کے حجام احمد بخش اور پوسٹ مین سوہن لال جیسے چھوٹے آدمیوں کو بھی یاد رکھا ہے اور بڑے خلوص سے اُن کی یادوں کو زندہ کیا ہے۔ شخصیتوں کے تذکروں کے علاوہ انھوں نے علی گڑھ کے طرزِ معاشرت اور طلبہ کے رکھ رکھاؤ کا بھی بڑے دل چسپ پیرایے میں ذکر کیا ہے۔

شیخ عبد اللہ (علیگ): مشاہدات و تاثرات

علی گڑھ کے نامور قانون داں، مسلم گرلز کالج علی گڑھ کے بانی اور معروف ٹی۔ وی اداکارہ بیگم خورشید مرزا کے والد شیخ عبد اللہ کا تعلق کشمیر کے ایک نو مسلم خاندان سے تھا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں جب وہ لاہور کے ایک اسکول میں زیرِ تعلیم تھے، لاہور میں منعقدہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس میں انھوں نے بابائے علی گڑھ سر سید احمد خاں کی زیارت کی۔ وہ سر سید کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ میٹرک کے امتحان میں کام یاب ہونے کے بعد مزید تعلیم کے حصول کے لیے وہ علی گڑھ جا پہنچے حالانکہ لاہور میں کالجوں کی کمی نہ تھی۔ علی گڑھ میں حصولِ علم کا سلسلہ بھی جاری رہا اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنی بے پایاں عقیدت کا اظہار سر سید کی خدمت میں حاضر ہو کر بھی کرتے رہتے۔ پھر آہستہ آہستہ وہ علی گڑھ کے معاملات میں اتنے دخیل ہوتے کہ وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اُن کی ضخیم آپ بیتی "مشاہدات و تاثرات" جہاں بابائے علی گڑھ کی زندگی کے مختلف گوشوں کو اُجاگر کرتی ہے وہاں اُس میں علی گڑھ کی بعض دوسری شخصیات، مثلاً جسٹس سید محمود، نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک وغیرہ کا ذکرِ خیر بھی بھرپور انداز میں کیا گیا ہے۔

میر ولایت حسین: میرے پچاس سال علی گڑھ میں

علی گڑھ کالج کے مشہور اُستاد میر ولایت حسین جن کے شاگردوں میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر سید محمود، مولوی عبد الحق اور سر سید راس مسعود جیسے جید حضرات کے نام شامل ہیں، علی گڑھ کالج کے دورِ اوّل کے طالبِ علم تھے۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد وہ علی گڑھ ہی میں اُستاد مقرر ہوئے اور ایک طویل عرصے وہیں مختلف عہدوں

پر کام کرتے رہے۔ انھوں نے اپنی آپ بیتی "میرے پچاس سال علی گڑھ میں" ترتیب دی تھی جو کم و بیش تیس سال تک مسودے کی صورت میں پڑی رہی۔ الحمد للہ کہ یہ آپ بیتی اب شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں میر صاحب نے اپنی آپ بیتی کے رنگ میں جو کچھ پیش کیا ہے اُسے ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ کی سچی تاریخ کہنا چاہیے۔ انھوں نے اس عظیم درس گاہ، اُس کے عظیم بانی اور علی گڑھ کے دوسرے اکابر اور اساتذہ کا اپنے انداز میں جائزہ لیا ہے اور بہت سا نادر و نایاب قسم کا مواد بھی پیش کیا ہے جس نے "میرے پچاس سال علی گڑھ میں" کو علی گڑھ تحریک کے موضوع پر بلاشبہ ایک اہم تخلیق بنا ڈالا ہے۔

الحاج محمد زبیر: کتاب زلیست

الحاج محمد زبیر کی ذات گرامی سے جو حضرات واقف ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ دُنیائے کتب خانہ میں اُنھیں کیا مقام حاصل ہے وہ چالیس برس سے زیادہ عرصے تک مسلم یونی ورسٹی کی لٹن لائبریری (بعدہ مولانا آزاد لائبریری) سے بہ حیثیت اسسٹنٹ لائبریرین منسلک رہے۔ کتب خانوں کے موضوع اور فنِ کتاب داری پر اُن کی کتابیں "شاہانِ مغلیہ کے کتب خانے"، "اسلامی کتب خانوں کی سیر"، "اسلامی کتب خانے"، "کتاب نمبر کیا ہے؟" اور "کیٹلاگ سازی" برصغیر پاک و ہند میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی گئی ہیں۔ کچھ مدت ہوئی، علی گڑھ کے موضوع پر اُن کا ایک سلسلۂ مضامین "علی گڑھ میں میرے بیالیس سال" ماہنامہ "سرحد" کراچی میں نکلا تھا جو علی گڑھ سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ زبیر صاحب نے بعد ازاں "کتاب زیست" کے زیرِ عنوان اپنی آپ بیتی بھی قلم بند فرمائی جس میں "علی گڑھ میں میرے بیالیس سال" کو بھی شامل کیا اور اس طرح علی گڑھ کا حق بہ حُسن و خوبی ادا کیا۔

پروفیسر عبدالمجید قریشی: نامہ ہائے صدق وصفا

پروفیسر عبدالمجید قریشی سابق صدر شعبۂ ریاضی مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ جن کا تعلق

ضلع سرگودھا سے تھا۔ ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے۔ انھوں نے اسی درس گاہ میں اپنی اعلا تعلیم مکمل کی۔ پھر وہ اسی کالج میں لیکچرار مقرر ہو گئے اور آہستہ آہستہ ترقی درجات کی منزلیں طے کرتے ہوئے شعبۂ ریاضی کے صدر ہو گئے۔ قریشی صاحب ۱۹۴۲ء میں علی گڑھ سے سبک دوش ہوتے اور بعد ازاں پاکستان آگئے۔ قریشی صاحب نے علی گڑھ میں بیتے ہوئے دِنوں کی دل چسپ یادداشتیں مرتب کیں جو سہ ماہی "العلم" کراچی میں تین طویل اقساط میں شائع ہوئی تھیں۔ پروفیسر عبدالمجید قریشی کے متعلق حال ہی میں آل پاکستان مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کراچی نے ایک کتاب "نامہ ہائے صدق وصفا" کے نام سے پیش کی ہے جس میں قریشی صاحب کے خطوط کے علاوہ اُن کی آپ بیتی "علی گڑھ میں میرے چالیس سال" بھی تمام و کمال شامل ہے۔ قریشی صاحب کی یہ آپ بیتی شخصیات و واقعات کا ایک پُرلطف مجموعہ ہے اور ہر لحاظ سے قابلِ مطالعہ ہے۔

علی گڑھ شخصیات: چند اہم کتابیں

پروفیسر رشید احمد صدیقی کی مشہور کتاب "گنج ہائے گراں مایہ" کا ایک دیدہ زیب ایڈیشن کچھ عرصہ ہوا مکتبہ جامعہ دلی نے شائع کیا تھا۔ اِس مجموعے کے پُرانے ایڈیشنوں میں علی گڑھ کی جن شخصیات کا ذکرِ خیر موجود ہے اُن میں مولانا سلیمان اشرف، پروفیسر ابوبکر شیث فاروقی، سیّد سجاد حیدر یلدرم، حسن عبداللہ اور محمد ایوب عباسی شامل تھے۔ تازہ ایڈیشن میں پرانے مضامین کے علاوہ بعض نئے مضامین کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ انھی میں ایک مضمون الٰہ آباد ہائی کورٹ کے نامور چیف جسٹس سر شاہ محمد سلیمان مرحوم کے متعلق بھی ہے۔ مرحوم نہ صرف ماہرِ قانون داں تھے، بلکہ اُنھیں سائنس اور ریاضی جیسے علوم سے بھی بے حد شغف تھا۔ علاوہ ازیں اُنھیں مسلمانوں کے تعلیمی مسائل سے دل چسپی تھی۔ مسلم یونی ورسٹی کی خوش قسمتی تھی کہ اُسے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے بعد اُن کا بہترین نعم البدل جسٹس شاہ سلیمان کی شکل میں نصیب ہوا۔ اُنھوں نے کوئی دو سوا دو سال اس ادارے کی بڑے خلوص سے خدمت کی جسٹس شاہ سلیمان نے اپنی اِن خدمات کا کوئی معاوضہ مسلمانانِ

ہند کی اس یونی ورسٹی کے خزانے سے وصول نہیں کیا، بلکہ جب بھی الہ آباد سے یونی ورسٹی کے فرائض کی انجام دہی کے لیے وہ علی گڑھ روانہ ہوتے ۔ وہ سب اخراجاتِ سفر اپنی جیب سے برداشت کرتے۔

اپنی ایک دوسری کتاب "ہم نفسانِ رفتہ" میں پروفیسر رشید احمد صدیقی نے جہاں جناب شفیق الرحمٰن قدوائی، مولانا سید سلیمان ندوی، افضل العلما ڈاکٹر مولوی عبد الحق (مدراس) نواب اسماعیل خاں، مولانا ابو الکلام آزاد اور پروفیسر احمد شاہ پطرس بخاری جیسے اکابر کا ذکر کیا ہے وہاں وہ اُس چھوٹے سے آدمی کندن کو بھی نہ بھولے جو مسلم یونی ورسٹی میں گھنٹی بجانے اور دوسرے چھوٹے موٹے کام سرانجام دینے پر مامور تھا۔ اُنھوں نے اس کندن چپراسی کا تذکرہ اُسی انداز میں کیا ہے جس انداز میں بابائے اُردو مولوی عبد الحق نے اپنی کتاب "چند ہم عصر" میں بھی نام دیو مالی کا ذکر کیا تھا۔

شیخ محمد اکرام نے بھی اپنی کتاب "موجِ کوثر" کا ایک طویل باب علی گڑھ تحریک کے لیے وقف کیا ہے جس میں اس تحریک کا بڑے شرح و بسط کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں علی گڑھ تحریک کے متعدد اکابرین مثلاً سرسید، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک اور مولوی سمیع اللہ وغیرہ کی شخصیت و کردار کو بڑی عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ اور اُس کی جانشین مسلم یونی ورسٹی کے کھلنڈرے اور شرارتی طلبہ کے "کارنامے" بھی اس ادارے کی تاریخ کی جان ہیں۔ ہم عصر طلبہ تو خیر رفیقانِ سفر اور یارانِ محفل تھے ہی، اِن تیز طرار اور شوخ و شنگ طلبہ نے تو اپنے جلیل القدر اساتذہ تک کو بھی نہ چھوڑا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد مرحوم سابق وائس چانسلر مسلم یونی ورسٹی کے متعلق یہ لطیفہ انھی حضرات کا تصنیف کیا ہوا تو تھا ہی کہ ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب اپنی چھڑی ہاتھ میں لے کر سیر و تفریح کے لیے باہر تشریف لے گئے۔ واپس آئے تو بجائے چھڑی کو کمرے کے کونے میں رکھنے اور خود بستر پر لیٹنے کے چھڑی کو بستر پر لٹا دیا۔ اور آپ اُس کی جگہ کونے میں جا کھڑے ہوتے۔ یہ لطیفہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ یار لوگوں نے اس میں اور رنگ آمیزی فرمائی مثلاً یہ کہ جب اُن کا ملازم کمرے میں داخل ہوا اور اُن

سے کچھ دریافت کرنے لگا تو وہ بڑے آہستہ سے فرمانے لگے" میاں خاموش رہو ڈاکٹر صاحب سو رہے ہیں۔"

علی گڑھ کی اس مادرِ علمی میں ایسے بامذاق اور شستہ شرارت پیشہ طالب علم تو بہت سے ہوئے ہوں گے، لیکن اُن کی امامت کا شرف صرف مسعود ٹامی مرحوم ہی کو حاصل ہے۔ حکیم احمد شجاع نے اپنی آپ بیتی "خوں بہا" میں مسعود مرحوم اور اُن کے دل چسپ کارناموں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ مسعود ٹامی مرحوم اور علی گڑھ کے دوسرے منچلے طلبہ کے ان "کارہائے نمایاں" اور لطائف کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اگر اُنھیں جمع کیا جائے تو ایک ضخیم اور پُر لطف کتاب کا مواد فراہم ہو سکتا ہے۔ تاہم اس موضوع پر ماضی بعید میں سید غلام پنجتن ستمشاد کی کتاب "علیگیات" اپنی اہمیت منوا چکی ہے۔ کوئی دس بارہ سال ہوئے جناب محفوظ الحق حقی اپنی کتاب "علی گڑھ کے چار سال" میں اپنے زمانہ طالب علمی کی پُربہار یادداشتوں کو بڑے دل چسپ انداز میں پیش کر چکے ہیں۔ ایک تیسری کتاب اسی موضوع پر "علی گڑھ سے علی گڑھ تک" حال ہی میں ہندستان سے شائع ہوئی ہے جس کے مصنف علی گڑھ کے ڈاکٹر اطہر پرویز ہیں۔ سید مسعود زیدی کی کتاب "علی گڑھ کی یادیں علی گڑھ کی باتیں" بھی علیگیات پر کچھ کم دل چسپ نہیں۔

جناب ضیاء الدین احمد برنی ایڈیٹر "کتابی دنیا" کراچی نے برصغیر پاک و ہند کی جن اہم علمی، دینی اور سیاسی شخصیات کو اپنے مجموعہ مضامین "عظمتِ رفتہ" کی محفل میں بصد ادب و احترام سر آنکھوں پر بٹھایا ہے۔ اُن میں نہ صرف سر سید کے نورتنوں میں سے نواب وقار الملک، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی اور منشی ذکاء اللہ دہلوی شامل ہیں، بلکہ سر آغا خاں اور ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کے جلیل القدر فرزند مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر سید حسین اور راجہ غلام حسین سب ایڈیٹر "کامریڈ" بھی زیب محفل ہیں۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی یادگار زمانہ کتاب "چند ہم عصر" کا ذکر رہا جاتا ہے۔ بابائے اُردو کا شمار ہمارے اُن نو دس بزرگانِ ملت میں ہوتا ہے جو ہمارے دَور کو

سرسید کے دور سے ملاتے ہیں۔ افسوس کہ ان بزرگوں میں سے آج کوئی بھی باقی نہ رہا۔ میری مراد ان بزرگوں سے سر آغاخان، مولانا ظفر علی خاں، خان بہادر مولوی بشیرالدین، خان بہادر ڈپٹی حبیب اللہ خاں، مولوی محمد امین زبیری، خان صاحب میر ولایت حسین، مولوی عبدالرزاق کانپوری، اور مولانا حسرت موہانی ہیں۔ مولوی عبدالحق محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کے اُن طلبہ میں سے تھے جنھوں نے بابائے علی گڑھ کو نہ صرف دیکھا تھا، بلکہ اُن کو اُن کے متعدد علمی و دینی کارناموں میں امداد بھی بہم پہنچائی تھی، سرسید بھی اُن کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ چناں چہ اُنھوں نے ایک مرتبہ سیاہ سرج کا ایک کوٹ مولوی صاحب کے لیے تیار کروایا تھا اور بڑی خوشی سے اُنھیں پہنایا تھا۔ مولوی عبدالحق کی کتاب "ہم عصر" کے پہلے اور دوسرے ایڈیشنوں میں علی گڑھ تحریک کے جن مشاہیر کے کردار و افکار کو احاطۂ تحریر میں لایا گیا تھا وہ نواب محسن الملک، جسٹس سید محمود، مولوی چراغ علی، مولانا حالیؔ، خواجہ غلام الثقلین، مولانا محمد علی، اور سر راس مسعود تھے، لیکن اُس کے تیسرے ایڈیشن میں سرسید کے متعلق پورے سو صفحات پر مشتمل مقالے کا اضافہ کیا گیا جس نے کتاب کی حیثیت کو اور بھی بلند کر دیا۔

اب آخر میں اس موضوع پر اپنی تازہ ترین کاوش "ذکرِ علی گڑھ" کا ذکر بھی کرتا چلوں، جس میں مَیں نے بیس نامور علیگ حضرات، میر ولایت حسین، مولوی عبدالحق، جناب شجاعت علی خاں، سر سید رضا علی، چودھری خلیق الزماں، نواب حافظ سر محمد احمد سعید خاں چھتاری، حکیم احمد شجاع، نواب مشتاق احمد خاں، پروفیسر عبدالمجید قریشی، پروفیسر الیاس برنی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر ضیا احمد بدایونی پروفیسر آل احمد سُرور، جناب علی مقصود ایڈوکیٹ، الحاج محمد زبیر، جناب محفوظ الحق حقی، شاہ حسن عطا، جناب نعمان احمد صدیقی اور چودھری محمد محمود علی خاں کی باغ و بہار آپ بیتیوں کو شامل کیا ہے جن کے ذریعے آپ اس عظیم ادارے کی تعلیم و تدریس، تہذیب معاشرت اور شوخی و سادگی کی متعدد جھلکیاں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

کُتب خانوں کی سَیر

سر سیّد کا کُتب خانہ، مسیح الملک کا کُتب خانہ، خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ، کُتب خانۂ حبیب گنج، امریکی کانگرس لائبریری، انڈیا آفس لائبریری، کیمبرج یونی ورسٹی لائبریری اور مولانا آزاد لائبریری مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ،

الحاج محمد زبیر صاحب سابق اسسٹنٹ لائبریرین مولانا آزاد لائبریری مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میرے نام اپنے ایک گرامی نامے میں تحریر فرماتے ہیں کہ لائبریری سے میری وابستگی کے ۴۲ برسوں میں سے حج، بیماری اور تعطیلات وغیرہ کا ایک برس نکال کر ۴۱ برسوں کو اگر مہینوں، دنوں اور چھے گھنٹے یومیہ میں منتقل کر دیا جائے تو گویا میری زندگی کے ۹۰،۷۹۰ گھنٹے ہزاروں کتابوں کی صحبت میں بسر ہوئے۔ گو اب اُن سے ایسی وابستگی نہیں رہی جیسی کہ نصف صدی تک رہ چکی ہے پھر بھی اُن کی اُنس الفت و محبت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی جو اتنے تعلقات نے پیدا کر دی ہے اور جب اُن پر کوئی اچھی تحریر دیکھتا ہوں تو دل باغ باغ ہو جاتا ہے اور جب کہیں کوئی کتب خانہ چاہے چھوٹا ہو یا بڑا نظر پڑ جاتا ہے تو اس کی زیارت کے لئے دل بے قرار ہو جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ؎

مے چھُٹی ہم سے مے کدہ نہ چھُٹا!
جب بھی گزرے اُدھر سے گزرے ہیں

زبیر صاحب نے جس مقام کی نشان دہی فرمائی وہ عشاقِ کتب کا مقام ہے، مشتاقانِ فن کا منصب ہے، شائقینِ علم کا مذہب ہے، محبانِ ادب کی منزل ہے، اصحابِ دانش کا قبلہ ہے، اربابِ عرفان کا کعبہ ہے، بلکہ صحیح الفاظ میں یُوں کہنا چاہیے کہ "یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا۔" ورنہ جہاں تک ہمارے ہاں عام افراد کی کتابوں سے دل چسپی کا تعلق ہے صورتِ حال چنداں حوصلہ افزا نہیں اور نہ ہمارے معاشرے میں مطالعے کی افادیت کو کوئی اہمیت حاصل ہے۔ سوال اَن پڑھوں کا نہیں اور نہ ذکر جاہلوں کا ہے، لیکن ہمارے ہاں تعلیم یافتہ طبقے میں کتنے لوگ ہیں، جو علوم و فنون کے ان خزانوں اور عقل و دانش کے ان گہواروں سے، جنھیں ہم کتب خانوں اور لائبریریوں کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، گہری مناسبت رکھتے ہیں اور اُن سے اپنے تعلقِ خاطر پر فخر کر سکتے ہیں۔ ہمارے پڑھے لکھے طبقے میں مشتاقانِ علم و فضل اور محققینِ فن کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے لیکن یہی وہ لوگ ہیں جن سے کتب خانوں کی آبرو اور لائبریریوں کی عزّت و عظمت قائم ہے اور یہی وہ رندانِ تشنہ لب ہیں، جن کے وجودِ گرامی سے ادب و شعر کے یہ خم خانے آباد ہیں۔ علم و عرفان کے ان دیوانوں کو کتب خانوں کی فضا میں جو لطف و سُرور و سکون و راحت اور آرام و اطمینان میسر آتا ہے، وہ انھیں کسی اور جگہ نصیب نہیں ہوتا۔ وہاں ان پر اک جذبۂ بے خودی اور عالمِ انہماک طاری ہوتا ہے اور وہ بالکل بھول جاتے ہیں کہ وہ کس مقام پر بیٹھے ہیں اور کتنا وقت گزر چکا ہے۔ کتابوں کے سحر سے وہ اس قدر مسحور ہو جاتے ہیں کہ ان کے ذہن سے زمان و مکان کا تصوّر ختم ہو جاتا ہے حتٰی کہ اُنھیں وہاں بھوک اور پیاس تک کا احساس نہیں ہوتا اور یہ طلسم اس وقت ٹوٹتا ہے جب مہتمم کتب خانہ کی جانب سے کتب خانے کے اوقاتِ کار کردگی کے اختتام کا اعلان ہوتا ہے۔ اُس وقت بھی وہ بہ امرِ مجبوری وہاں سے اٹھتے ہیں، ورنہ ان کا بس چلے تو شاید شب باشی کے لیے بھی اسی مقام کا انتخاب کر ڈالیں!

سرسیّد کا کتب خانہ

میری اس تمہید کی روشنی میں اب کتب خانۂ سرسیّد کی وہ تصویر ملاحظہ فرمایئے

جو سر سیّد کے سوانح نگار کرنل گراہم نے ان الفاظ میں کھینچی ہے: "سر سیّد اب کئی برس سے علی گڑھ میں اپنے آرام دہ کمرے میں رہتے ہیں۔ اس پر ادبی ماحول چھایا ہوا ہے۔ ان کے بیٹھنے کے کمرے میں، جہاں وہ اپنے دن کا زیادہ حصّہ گزارتے ہیں، ایک میز ہے جو کتابوں اور کاغذوں سے بھری ہوئی ہے۔ ان کے کھانے کے کمرے میں دیواروں کے ساتھ ساتھ کتابوں کی الماریاں لگی ہوئی ہیں جن میں معیاری انگریزی کتابیں ہیں۔ ان کی ایک لائبریری بھی ہے جس کا کمرہ نہایت شان دار ہے۔ یہ بے شمار مختلف قسم کی کتابوں سے بھرا ہوا ہے۔ جن میں بہت سی مذہبی کتابیں ہیں جو اُنھوں نے قرآن پاک اور انجیلِ مقدس کی شرح لکھنے میں استعمال کی ہیں۔ اِن میں اُن کے صاحبزادے سیّد محمود صاحب کا وہ دل چسپ مقالہ بھی ہے جس پر اُن کو کیمبرج یونی ورسٹی سے زمانۂ طالب علمی میں انعام ملا تھا۔"

علامہ شبلی نعمانی نے جب سر سیّد کے اس کتب خانے کو دیکھا تو اُنھوں نے اپنی مسرّت و شادمانی کا اظہار یوں کیا:

"میں سیّد صاحب کا کتب خانہ دیکھ کر باغ باغ ہو گیا۔ مصر و یورپ کی تمام جدید و قدیم مطبوعات الماریوں میں بالترتیب سجی ہوئی تھیں۔ سیّد صاحب نے اپنے کتب خانے کی نسبت عام اجازت مجھ کو دے دی تھی۔ اس وجہ سے مجھ کو کتب بینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہے۔ سیّد صاحب کے پاس تاریخ و جغرافیہ اور عربی کی چند ایسی کتابیں ہیں، جن کو حقیقت میں مَیں کیا بڑے بڑے لوگ بھی نہیں جانتے ہوں گے کہ یہ سب کتابیں جرمنی میں طبع ہوئیں اور مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں ہوئیں۔ گبن کی تاریخ جس کا ترجمہ سیّد صاحب نے چھے سو رُپے میں کرایا ہے، میرے مطالعے میں ہے۔"

ان کتابوں کا مطالعہ علامہ شبلی جس انہماک سے کیا کرتے تھے، اُسے اُنھی کی زبانی سنیے، فرماتے تھے: "میرا یہ حال تھا کہ الماریوں کے سامنے گھنٹوں

کھڑا رہتا، کبھی تھک کر زمین ہی پر اکڑوں بیٹھ جاتا۔ سر سید نے جو یہ کیفیت دیکھی تو سامنے کرسی رکھوا دی“۔

مسیح الملک کا کتب خانہ‘

مسیح الملک حکیم اجمل خاں ۱۹۲۵ء میں بحالی صحت کے لیے عازم یورپ ہوئے۔ ان کا یہ سفر مسلسل چھے ماہ تک جاری رہا اور انھوں نے اس عرصے میں برطانیہ، فرانس، سوئٹزرلینڈ، آسٹریا اور اٹلی کو گھوم پھر کر دیکھا۔ ان ممالک کے علاوہ انھوں نے مصر و شام اور فلسطین کی سیاحت بھی کی۔ حکیم اجمل خاں صاحب کتابوں کے بہت بڑے قدر دان اور شائق تھے۔ دلّی میں ان کا ذاتی کتب خانہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا اور اپنے اسی شوق کی بدولت وہ ایک طویل عرصے تک ایک زمانے میں ریاست رام پور کے کتب خانۂ خاص کے سربراہ بھی رہ چکے تھے۔ چناں چہ اپنے اس سفر میں بھی وہ کتابوں اور کتب خانوں کو نہ بھولے۔ اُن کی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ ان کا ۲۲ اپریل سے ۲۳ مئی ۱۹۲۵ء تک پورا مہینہ اس طرح گزرا کہ کوئی لمحہ مصروفیت سے خالی نہ تھا۔ حکیم صاحب جہاں جاتے تھے اپنا علمی ذوق ساتھ لے جاتے تھے۔ پیرس میں بھی ان کو سب سے زیادہ جدید مسجد اور کتب خانوں کے دیکھنے کا شوق تھا۔ پیرس کی نیشنل لائبریری میں وہ صبح کو جاتے تھے اور شام کو نکلتے تھے۔ قلمی کتابوں کے شعبے میں گویا انھوں نے گھر بنا لیا تھا۔ متقدمین کی یہ صحبت ان کو زندہ انسانوں سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ پروفیسر بلوشے سے جو اس صیغے کے مہتمم تھے، دو تین ہی دنوں میں بہت اچھے مراسم پیدا ہو گئے تھے۔ لائبریری کے اوقات کے علاوہ پروفیسر موصوف کئی دفعہ حکیم صاحب کے ہوٹل میں آتے اور جب آتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ گویا حکیم صاحب کے کوئی پُرانے دوست آتے ہیں۔ گھنٹوں مشرقی کتابوں کا تذکرہ رہتا تھا اور خاص کر طب کی کتابوں پر تنقید ہوتی تھی۔ چند نادر کتابوں کے فوٹو انھی پروفیسر صاحب کے ذریعے حکیم صاحب نے طبیہ کالج کے لیے حاصل کیے، اور ایک بڑی رقم اس ضمن میں صرف کی۔ مشرقی تصاویر کے شعبے میں جاتے تھے تو گھنٹوں ایک ایک

البم کے سامنے کھڑے ہوئے تصاویر کے حسن و قبح پر پروفیسر صاحب سے بحث فرماتے تھے۔ کتبوں کے متعلق بھی ان کی بصیرت عجیب و غریب تھی۔ وہ قلم اور رسم الخط کو دیکھ کر بتا دیتے تھے کہ یہ کتبہ کس زمانے کا ہو سکتا ہے"۔

خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ

مشہور انگریز مستشرق مسٹر ڈی سی۔ اسکاٹ او کنز جنھوں نے انگریزی زبان میں ہندوستان کے عظیم کتب خانہ "خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ" کی مختصر لیکن دل کش داستان AN EASTERN LIBRARY (ایک مشرقی کتب خانہ) مرتب کی تھی، نے اس گہوارۂ علوم و فنون کے تمام نادر و نایاب مخطوطات کو ایک ماہرِ فن مبصر اور نکتہ رس ناقد کی حیثیت سے دیکھا تھا اور ان میں سے بعض اہم نسخوں کے خصائص پر انھوں نے اپنی اس تصنیف میں بڑی تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا"۔ ایک مشرقی کتب خانہ" میں جو مخطوطات زیرِ بحث لائے گئے ان کا تعلق زیادہ تر حدیث، تفسیر، فقہ، تصوف تاریخ، سوانح اور نظم جیسے موضوعات سے تھا، لیکن اس کتب خانے میں قرآن حکیم کے چند نسخے ایسے بھی تھے جن کی مسٹر او کنز نے خاص طور پر مدح سرائی کی تھی۔ انھوں نے کلام الٰہی کے ان نسخوں کے متعلق لکھا تھا:

"یہ نسخے ایسے ہیں جو میری نظر میں پورے کتب خانے کے نادر اور نایاب خزانوں میں سب سے فائق اور سب سے نفیس تر ہیں۔ میں خاص طور پر مشہور خطاط یاقوت مستعصمی کے لکھے ہوئے ایک نسخے کا ذکر کروں گا۔ اس کے آخر میں اس کے دستخط اور سنہ ۶۶۸ ہجری کی تاریخ درج ہے۔ اس جلد کے ہر صفحے پر متن کی عبارت خطاطی کی تین طرزوں میں لکھی گئی ہے۔ یہ خط نسخ، ریحان اور ثلث ہیں۔ پہلا طرزِ خط یعنی نسخ خود یاقوت کا ایجاد کیا ہوا ہے۔ میرے لیے تو خط کے حسنِ اظہار کے اس سے بہتر اور اس سے حسین تر نمونے کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ اس کے علاوہ اس پر طلا کاری کی گئی ہے اور اسے نازک گل کاری سے سجایا گیا ہے۔ ہر سورۃ کا عنوان طلائی حرفوں میں لکھا گیا ہے۔ ہر صفحے پر متن کے گرد اگرد ایک حاشیہ

سُرخ، نیلے اور سنہری رنگ میں دیا گیا ہے اور بیرونی حاشیہ بھی طلائی ہے۔ کتاب کے پہلے صفحے پر نیلا اور طلائی طغرا ہے۔ یہ مشہور تزئینی طرز تاج محل کی پچی کاری اور دوسری مشہور عمارتوں میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ اپنی مزیّن اور منقّش دستخطی عبارت میں خلیفہ مستعصم باللہ کے زمانے کا یہ بغدادی اپنی خطاؤں اور گناہوں کے لیے مغفرت کا طالب ہے۔ اندر کے ورقوں کا رنگ ہلکا زردی مائل ہے۔"

"قرآن کا ایک اور نسخہ اپنی ماہرانہ خطّاطی کے لحاظ سے تو نہیں، البتہ اپنی غیر معمولی تزئین کے لحاظ سے اُس نسخے سے بازی لے گیا ہے۔ قرآن کا یہ نسخہ حد درجے سجا سجایا ہے، بہت بڑی تقطیع پر لکھا گیا ہے۔ اس کے چوڑے حاشیے پر ایک فارسی تفسیر نیلے حرفوں میں لکھی ہوئی ہے۔ کتابوں کی حد تک اس سے زیادہ مرصّع اور اس سے زیادہ مزیّن اور آراستہ پیراستہ کتاب کا تصور بھی مشکل ہے۔ ہر سورۃ دُہرے صفحے سے شروع ہوتی ہے۔ اس پر نیلا اور طلائی کام ہے۔ لاجوردی، فیروزی اور معدنی لاجورد سے نازک گل بوٹے بنائے گئے ہیں اور سرخ اور شنگرفی رنگوں کے ملاپ سے ایک منتے رنگ میں گل کاری کی گئی ہیں۔ ان دُہرے صفحوں پر جو گل کاری کی گئی ہے وہ ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہر دوہرے صفحے کی گل کاری انفرادی شان رکھتی ہے۔ ہر سورۃ کا عنوان سفید حرفوں میں لکھا گیا ہے۔ ہر سورۃ کی ابتدا سفید حرفوں سے ہوتی ہے جو گہری نیلی زمین پر لکھے گئے ہیں۔ اس کا کاغذ جلادار ہے اور ریشم کی طرح ہلکا، اس کے باوجود اس شاہانہ جلد کا وزن جس پر خالص سونا مڑھا گیا ہے، دس سیر سے کم نہ ہو گا۔ یہ پتا نہیں یہ نسخہ کہاں سے اور کیسے یہاں آیا، پر اتنا یقین ہے کہ کسی مرفّہ الحال اور پُر شکوہ عہد ہی میں عالمِ وجود میں آیا ہو گا، شاید اس کے لیے جس نے تاج محل بنایا ہے۔"

"ان نسخوں کے ساتھ ہی میرے سامنے نہایت چھوٹی تقطیع کا ایک تختہ رکھا ہے۔ یہ زمانے کے ہاتھوں سیاہ پڑ چکا ہے۔ اس کی ساری تزئین بس سادے سے پھول دار حاشیے میں جو ایک یا کہیں دُہرے صفحے پر بناتے گئے ہیں۔ یہ کتاب ایک کرم خوردہ چرمی جلد کے اندر بندھی ہے اور شیرازہ تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ عربی حروف کے اوپر نقطے نہ

ہونے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب تیسری صدی ہجری کی لکھی ہوئی ہے اور اس طرح یہ اس کتب خانے کی سب سے پرانی کتاب ہے۔ قرآن چاہے شان دار لکھے ہوئے ہوں یا سیدھے سادے، اُن میں سچے مردِ مومن کی نجات کا وہ راستہ معیّن کر دیا گیا ہے جو اسے اس دارالمحن کے پُرخار راستوں سے بچاتا ہوا سیدھا اپنے مولا تک پہنچا دیتا ہے۔ اس مولا تک جو اللہ ہے، رحمٰن ہے اور رحیم ہے"۔

کتب خانۂ حبیب گنج

ہندوستان کے نامور ہندو فاضلِ عربی جناب مالک رام، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے کتب خانے کی زیارت کی غرض سے حبیب گنج پہنچے۔ کتب خانۂ حبیب گنج جو مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی وفات کے بعد مولانا آزاد لائبریری مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے سپرد کر دیا گیا ہے، متحدہ ہندوستان کے چوٹی کے کتب خانوں میں شمار ہوتا تھا اور اپنے نادر و نایاب مخطوطات اور منقش، مرصّع اور مطلّا نسخوں، ممتاز اکابر و مشاہیر کے مکاتیب، مسلم سلاطین کے فرامین اور نامور خطّاطوں کی خوش نما اور خوش وضع وصلیوں کی بنا پر ایک خاص شہرت رکھتا تھا۔ مالک رام نوّاب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان کی میزبانی کا لطف اٹھایا اور ان کے کتب خانے کی زیارت سے مشرف ہوئے تو بے اختیار پکار اٹھے: "اللہ اللہ! اب مَیں اپنے تاثرات کا حال کیا لکھوں۔ ہر طرف ہزاروں بیش قیمت کتابیں قرینے سے الماریوں میں چُنی رکھی تھیں۔ غالبؔ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر کسی پچھلے شاعر کے ہاں کوئی ایسا مضمون بندھ گیا ہے جو میرے ہاں بھی پایا جاتا ہے تو اس سے یہ خیال نہ کرو کہ توارد ہو گیا ہے، بلکہ یقین جانو کہ اس نے نہاں خانۂ ازل سے میرے مضمون کی چوری کر لی تھی! کچھ ایسا ہی حال میرا اس وقت ہوتا ہے جب مَیں کسی جگہ کوئی اچھی کتاب دیکھتا ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے غلطی سے میرے حصّے کی چیز یہاں آ گئی ہے اور یہاں تو ایک دو نہیں ہزاروں کتابیں میرے اردگرد پڑی تھیں:

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا

نواب صاحب کا عجیب عالم تھا۔ وہ ایک کتاب منگواتے، مجھے دکھلاتے اور پھر اس کی خصوصیات گنوانا شروع کرتے: یہ ملک الشعرا طالب آملی کا دیوان ہے۔ اس میں بہت سا کلام خود طالب کے قلم سے لکھا ہوا ہے۔ یہ مثنوی کا ایک قدیم نسخہ ہے۔ جہاں تک معلوم ہو سکا اس سے قدیم تر نسخہ جرمنی کے شہر میونخ کے کتب خانے میں ہے جو اس سے صرف چھے برس پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ یہ میرا نسخہ حضرت اورنگ زیب عالمگیر کے کتب خانے میں رہا ہے۔ یہ رہیں اُن کی مہریں، صاف پڑھا جاتا ہے "محمد اورنگ زیب بادشاہ"۔ یہ شیخ سعدی کی بوستان ہے۔ اس پر اودھ کے تین بادشاہوں کی مہریں ہیں: نصیرالدین حیدر، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ۔ چند دن پہلے ایک تازہ کتاب آئی تھی، ملّا سعد الدین تفتازانی کی "مطول"۔ مہتمم سے کہہ کر اُسے منگوایا۔ اس کے شروع میں پانچ چھے سطریں اس شان سے لکھی تھیں کہ آدھی عبارت بہت قدیم اور مخدوش تھی اور باقی آدھی تازہ (بعد میں معلوم ہوا کہ یہ حصہ خود نواب صاحب نے پورا کیا تھا) پاس ہی میز پر محدب شیشہ پڑا تھا، اٹھایا اور اسے میرے ہاتھ میں دے کے فرمانے لگے، "دیکھیے تو، یہ عبارت پڑھ سکتے ہیں؟" میں رُک رُک کے پڑھنے لگا۔ آخر میں "نورالدین بن اکبر شاہ غازی" کے الفاظ تھے۔ گویا یہ خود جہانگیر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر تھی اور اسی لیے انھوں نے مجھے اس کے پڑھنے کے لیے کہا تھا غرض دیر تک ہم اس جنتِ نگاہ کے نظارے میں مشغول رہے۔ وہ کتاب نکلواتے، اسے دکھلاتے اور اس کی خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے جاتے۔ اگر میں کوئی ایسی بات کہہ دیتا جس سے اس کی کسی طرح کی اہمیت واضح ہوتی تھی تو خوشی کا اظہار فرماتے۔ وہ مجھے کتابیں اس طرح دکھا رہے تھے، جیسے میں کوئی بہت بڑا مبصر یا صاحبِ علم و فن ہوں۔ وہ ہر طرف سے بے پروا ہو کر یوں کتاب پر کتاب نکلوا رہے تھے گویا آج پہلی مرتبہ انھیں کوئی کتابوں کا قدر دان ملا ہو اور میں اپنی بے مائگی اور ان کی ذرہ نوازی پر عرق عرق ہوا جا رہا تھا۔

حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کا شعر ہے ؎

یاراں ز مہربانی دانند ہر چہ دانند
ما خوب می شناسیم اے درد آنچہ مائیم

امریکی کانگرس لائبریری

لکھنؤ یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو کے صدر اور برصغیر کے مشہور ناقد پروفیسر احتشام حسین نے اپنے سفرنامے "ساحل و سمندر" میں امریکا کے سب سے بڑے کتب خانے "کانگرس لائبریری" کے متعلق تحریر فرمایا تھا:

"میں دو بجے لائبریری پہنچا۔ آج ذرا اندر تک داخل ہوا۔ خدا کی پناہ کیسی خوب صورت، شان دار اور وسیع عمارت ہے! کیسے مجسّمے اور چھتیں ہیں! دیواروں پر کیسی تصویریں ہیں! چپّے چپّے سے علم کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں۔ ایک طرف ترکی کے علوم و فنون کی کتابوں اور تصویروں کی نمائش ہو رہی ہے تو دوسری طرف انجیل مقدّس کے ہزاروں نسخوں کی۔ دو نسخے حیرت انگیز دیکھے: ایک تو چھاپے کے موجد گٹن برگ کا چھاپا ہوا تھا، دوسرا ٹھیک اسی زمانے کا قلمی مصوّر نسخہ، دونوں چیزیں نادر ہیں۔ ایک طرف امریکا کے صدروں کے خطوط وغیرہ کی نمائش ہو رہی ہے اور دوسری طرف امریکا کے اعلانِ آزادی کی اصل قلمی دستاویز کی۔ کوئی شخص ایک مہینے میں بھی دیواروں کی تصویروں، کتبوں، مجسموں اور تمام ضروری چیزوں کو پوری طرح نہیں دیکھ سکتا۔ اس لائبریری میں چھیاسی لاکھ سے زیادہ چھپی ہوئی کتابیں ہیں۔ اس تعداد میں رسائل اور اخبارات شامل نہیں ہیں۔ رسائل و اخبارات تقریباً ہر ملک کے موجود ہیں۔ اُن کی تو کوئی انتہا نہیں ہے۔ مختلف زبانوں اور مختلف قسم کے ایک کروڑ دس لاکھ قلمی نسخے ہیں۔ تصاویر، نقشوں، ریکارڈوں وغیرہ کی کوئی گنتی نہیں۔ یہ لائبریری دنیا کی سب سے بڑی لائبریری کہی جاتی ہے۔ ۱۸۰۰ء سے قائم ہے لیکن درمیان میں کئی دفعہ تباہ بھی ہو چکی ہے۔ موجودہ عمارت کی تکمیل ۱۸۹۷ء میں ہوئی اور اب یہ بالکل ناکافی ہے، اس لیے اس کے قریب ہی ایک بہت خوب صورت اور وسیع عمارت ۱۹۳۸ء میں اور بنا دی گئی ہے۔ یہ عمارت سادہ لیکن باوقار ہے۔ اصل

عمارت میں تین درجے ہیں اور اوپر سبز رنگ کا گنبد ہے، جس کے نیچے ریڈنگ رُوم ہیں۔ دیواروں میں ہر جگہ یونانی اور رومن وضع کی تصویریں اور مجسمے ہیں اور عمارت پر بھی اطالوی نشاۃِ ثانیہ کا اثر ہے۔ پہلی منزل سے دوسری منزل پر جاتے ہوئے پچی کاری کے کام میں علم کی دیوی منروا کی بہت بڑی تصویر ملتی ہے۔ اس کے مجسمے تو نہ جانے کتنے ہیں۔ فرش پر بھی بہت اچھی ڈیزائنیں اور بُرُوج کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ گنبد کی چھت میں جو تصویریں ہیں انسانوں کے تمدنی ارتقا کی مصوری کرتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ لائبریری حیرت خیز ہے۔ مَیں نے تھوڑا سا وقت ریڈنگ رُوم میں بھی صرف کیا اور کیٹلاگ دیکھتا رہا۔ ہر ملک کی طرح ہندستان سے متعلق بھی ایک الگ شعبہ ہے اور بہت بڑا ہے۔ ہندستانی سیکشن میں مسٹر والٹر مارر اور مسٹر مراری لال ناگر سے ملاقات ہوئی۔ مسٹر مارر نے لائبریری کی پوری مشین دکھائی۔ وہ سنسکرت کے طالبِ علم ہیں اور دن رات لائبریری کے شعبے کی ترتیب اور تنظیم میں لگے رہتے ہیں۔ جس طرح کتابیں نکالی جاتی ہیں، جس طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتی ہیں، وہ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ سارا کام مشین سے ہوتا ہے، اور ہر کتاب پندرہ منٹ کے اندر کوئی کہیں بھی بیٹھا ہو، اُسے مل جاتی ہے۔ کتابیں خاص طرح کے بجلی کے بکسوں میں زمین کے اندر اندر چلتی ہیں۔ اُردو ہندی کا ذخیرہ چھوٹا ہے، مگر بڑھایا جاسکتا ہے۔ ہندستان کے متعلق البتہ چار لاکھ سے زیادہ کتابیں انگریزی اور یورپ کی دوسری زبانوں میں موجود ہیں۔ دنیا میں ہندستان کے متعلق اتنا بڑا علمی خزانہ شاید ہی کہیں ہو۔"

انڈیا آفس لائبریری

لندن میں اُنھوں نے انڈیا آفس لائبریری کی زیارت کی۔ وہ لکھتے ہیں کہ "انڈیا آفس لائبریری کا شوق گیارہ بجے وائٹ ہال کی سڑکوں پر لے گیا۔ یہ وہ مقام ہے کہ کبھی یہاں سے ساری دنیا کی نبضوں پر انگلیاں رکھی جاتی تھیں۔ قریب ہی نمبر دس ڈاؤننگ اسٹریٹ ہے۔ بالکل غیر مرعوب کُن! یہ انڈیا آفس ہے، جسے اب کامن ویلتھ ریلیشن آفس کہتے ہیں۔ کیسی بڑی، پیچیدہ اور مضبوط عمارت ہے۔ مختلف راہوں سے گزرتے ہوتے ہمیں ہر

طرف کتابوں کے ذخیرے، تصویریں اور مجسّمے نظر آ رہے ہیں۔ کوئی مانے یا نہ مانے میرے دل میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ یہاں یہ تمام چیزیں محفوظ ہیں۔ اگر ہندوستان میں ہوتیں تو اب تک کب کی تباہ و برباد ہو چکی ہوتیں۔ کیا دیکھوں اور کیا نہ دیکھوں۔ دو صدیوں میں ہر طرف سے بیش قیمت کتابیں، نادر و نایاب مخطوطات اور گراں بہا مرقعے سمٹ سمٹ کر یہاں پہنچے ہیں اور یہ تو محض ایک مرکز ہے، ایسی نہ جانے کتنی جگہیں ہیں۔ جن لوگوں نے انفرادی طور پر یہ چیزیں ہندوستان میں حاصل کیں، انھوں نے یا تو ہدیتہً دے دیں یا بیچ دیں اور اس طرح وہ اس ادارے تک پہنچ گئیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس قسم کی بہت سی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ فاتح قوم نے مفتوح قوم سے اس قسم کی گراں قدر اور بیش قیمت اشیا کو بالجبر یا کوڑیوں کے مول حاصل کیا اور انھیں یہاں لا کر جمع کیا تھا۔ بہر حال اس لائبریری کا سلسلہ ۱۸۰۱ء میں شروع ہوا تھا۔ اس وقت اس میں تقریباً ڈھائی لاکھ مطبوعہ کتابیں اور اکیس ہزار مخطوطے ہیں۔ بیس ہزار مشرقی مخطوطوں کے علاوہ ہندوستانی اور ایرانی تصاویر بھی کوئی ڈیڑھ ہزار کی تعداد میں ہیں۔ مخطوطوں میں سب سے بڑی تعداد سنسکرت کی ہے، یعنی آٹھ ہزار تین سو۔ اس کے بعد فارسی کے چار ہزار آٹھ سو، عربی کے تین ہزار دو سو، اردو کے دو سو ستر اور ہندی کے صرف ایک سو آٹھ مخطوطات ہیں۔ علاوہ ازیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے دوران حکومت کی اہم خط و کتابت، ضروری کاغذات اور نجی روزنامچے نہ جانے یہاں کتنے موجود ہیں۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے، لیکن دیکھنا بہت کچھ ہے۔ چناں چہ میں نے شاہنامہ، کلیاتِ آملی شیرازی اور پدماوت وغیرہ جلد جلد دیکھ کر اس البم کو ہاتھ لگایا جو دارا شکوہ نے اپنی محبوب بیوی کے لیے تیار کرایا تھا۔ یہ بہت ہی خوب صورت اور دیدہ زیب ہے، اتنا کہ اس کا حسن بیان کرنے کے لیے مجھے الفاظ نہیں ملتے۔ یہاں قدیم تصویریں بھی بہت ہیں اور وصلیاں بھی زر کار، منقش، رنگین اور مرصع۔ ہر تصویر دیر تک دیکھے جانے کے قابل ہے۔ مغل اور راجپوت مصوری کے اتنے خوب صورت، حسین اور بہت سادے مرقعے میں نے کہیں نہیں دیکھے۔ مطبوعہ اردو کتابوں کا بھی یہاں بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ علم و دانش کا یہ خزانہ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں

سے کس کو ملے گا۔"

پروفیسر احتشام حسین کے ان الفاظ میں واقعی وزن محسوس ہوتا ہے کہ انڈیا آفس لائبریری میں یہ نادر و نایاب علمی و ثقافتی اثاثہ خواہ کسی ذریعے سے بھی حاصل ہوا ہے، بہر حال محفوظ تو ہے۔ اس مرحلے پر مجھے حضرت علامہ اقبال یاد آتے۔ طالبِ علمی کے شوق بے پایاں اور ذوقِ فراواں کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُنھوں نے بھی انگلستان اور جرمنی کی دانش گاہوں میں زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا اور جب انھوں نے عرب و عجم کے علم و حکمت کے ان گراں بہا نوادرات اور ادب و شعر کے ان بیش قیمت مجموعوں کو یورپ کے کتب خانوں کی زیب و زینت بنا دیکھا تو ان کے دلِ حساس پر چوٹ لگی اور ان کے جذبات کا دھارا اس شعر کی شکل میں بہہ نکلا ہے

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھا ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

کیمبرج یونی ورسٹی لائبریری

ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں شعبۂ عربی کے صدر ہیں اور غالبیات پر سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس موضوع پر ان کی دو کتابیں انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ شائع کر چکی ہے۔ پروفیسر احتشام حسین صاحب کی طرح اب سے کوئی پندرہ سولہ برس پہلے آرزو صاحب بھی حصولِ علم کی غرض سے انگلستان پہنچے تھے۔ قیامِ انگلستان کے دوران میں وہ جن اربابِ فضل و کمال سے ملاقی ہوتے اور جن علمی و ادبی اداروں کے دامن میں اُنھوں نے اپنا وقت صرف کیا، اُن کا دل چسپ حال اُنھوں نے اپنے پُر لطف سیاحت نامے زہے روانی عمرے کہ در سفر گزرد" میں پیش کیا ہے۔ اپنی اس داستانِ سفر کے ایک مقام پر وہ تحریر فرماتے ہیں۔

"کورپس کرسٹی کالج (کیمبرج) کے لائبریرین بہت دل چسپ اور خوش اخلاق نکلے۔ کالج پہنچا تو ایک معمر سے آدمی پر نظر پڑی جو ہاتھ اور چھڑی دونوں پشت پر رکھے ہوئے

کالج کے سبزہ زار کے گرد گھوم رہے تھے۔ میں نے اُن سے لائبریری کی راہ اور لائبریرین کی شکل پوچھی۔ کہنے لگے "تم بالکل صحیح جگہ پر اور صحیح آدمی سے بات کر رہے ہو"۔ (لائبریری دس قدم کے فاصلے پر تھی اور لائبریرین یہی حضرت تھے)۔ پانچ منٹ کے بعد جب لائبریری کھلی تو مجھے لے کر اندر داخل ہوئے۔ بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ مخطوطات کی الماریوں کے پاس ایک میز کے گرد بٹھا کر چلے گئے اور کہہ گئے کہ ان الماریوں میں کتابیں ہیں اور یہ رجسٹر ہے۔ جس کتاب کی ضرورت ہو، بلا تکلف نکالو اور پڑھو۔ یہ بڑا دلچسپ تجربہ تھا۔ شام تک بیٹھا کتابیں پڑھتا اور کتابوں سے گرد جھاڑتا اور اپنے کپڑے گرد آلود کرتا رہا اور لائبریرین صاحب سیاحوں اور زائروں کو قدیم کتابیں اور نوادر دکھاتے رہے۔ یہ شخص قدیم مطبوعاتِ یورپ پر بڑی گہری نظر رکھتا ہے اور اس لائبریری میں قدیم مطبوعات کا بہت اچھا ذخیرہ موجود ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جو لوگ اپنے فن کے ماہر ہوتے ہیں وہ کسی نہ کسی حد تک کھوئے رہتے ہیں اور سنکی سے معلوم ہوتے ہیں۔ یہی حال اِن حضرت کا تھا۔ وہ زمان و مکان سے بے نیاز ہو کر لوگوں کو کتابیں دکھا رہے تھے۔ ایک خاندان کہیں باہر سے کیمبرج آیا ہوا تھا، وہ کسی طرح ان کی زد میں آگیا۔ یہ خاندان ایک بوڑھے مرد اور تین بوڑھی عورتوں پر مشتمل تھا۔ اِن حضرت نے ان کے سامنے معلومات کا دریا بہانا شروع کر دیا۔ وہ حوالے پر حوالے دیے جا رہے تھے اور کتابوں پر کتابیں ان کے سامنے رکھے جا رہے تھے۔ یہی نہیں، اُنھوں نے اِن لوگوں سے پڑھوانا بھی شروع کر دیا۔ ایک آدھ صفحے تک تو خیر مضائقہ نہ تھا، لیکن اس سے زیادہ کے لیے وہ تیار نہ تھے، اس لیے کہ بدقسمتی سے ان کی نظر کمزور تھی اور عینک بقول ان کے ان کی بیوی کے پاس رہ گئی تھی۔ ایک بڑھیا نے بدقسمتی سے کسی مصنف کا نام لے دیا کہ میں جانتی ہوں، اس نے یہ بھی لکھا ہے۔ ارے صاحب، یہ تو ان کی طبع کے لیے تازیانہ ہوا۔ وہ فوراً اس کتاب کو بھی لے آئے اور اس کی عبارتیں پڑھوانی شروع کر دیں۔ اسی اثنا میں ایک فرانسیسی ترجمے کا ذکر آیا۔ وہ ایک الماری کی طرف بڑھے۔ خواتین نے بہت کہا کہ رہنے دیجیے، لیکن وہ بھلا کہاں ماننے والے تھے۔ لمحوں میں اس کو بھی لے آئے، اور پھر ان پر

مسلط ہو گئے۔ خواتین کی عجیب حالت تھی، انھیں نوادر دیکھنے کا تو شوق ضرور تھا، لیکن کچھ اس قسم کا جس طرح آزادی کے بعد مولانا آزاد لائبریری (مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ) میں کسی گاؤں کے مکھیا یا مہنت قسم کے ایک صاحب لائبریری دیکھنے کے لیے آئے۔ وسط ہال میں کھڑے ہو کر انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور بولے "ارے یہاں تو بڑی پستکیں جمع ہیں!" یہ کہا اور پھر واپس چلے گئے۔ تو حضرات اِن خواتین کا معاملہ بس اس قسم کا تھا، لیکن یہ بے چاری ہمارے پروفیسر صاحب کے چکر میں آگئیں۔ ایک ان میں سے زیادہ سوجھ بوجھ کی تھیں، انھیں یاد آیا کہ گاڑی چھوٹنے میں اب صرف آدھ گھنٹہ باقی رہ گیا ہے، اس لیے پروفیسر صاحب اُن کو اجازت دیں۔ اِس طرح ان لوگوں کو ان لائبریرین صاحب سے نجات ملی۔ تفنّن برطرف مہتمم کتب خانہ کا عہدہ واقعی اس امر کا متقاضی ہے کہ اس عہدے پر اس شخص کو فائز ہونا چاہیے، جو حقیقت میں فنافی الکتاب ہو اور اس گہوارۂ علمی میں رکھی ہوئی ہر کتاب کے متعلق اس کی معلومات وسیع اور تازہ ترین ہو۔

مولانا آزاد لائبریری: مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ

پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی سابق صدر شعبۂ اُردو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، مولانا آزاد لائبریری کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ مولانا آزاد لائبریری میں مخطوطات کی تعداد کم وبیش چھے ہزار ہے۔ جس میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اب تک بعض مجبوریوں کے سبب سے اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ ہمارے کتب خانے میں کیا کیا نوادر اور بیش بہا قلمی نسخے موجود ہیں اور علمی تحقیقات کا کام کرنے والوں کو مخطوطات اور حوالوں کی کتابوں کی دست یابی اور مطالعے میں بڑی دِقّت ہوتی تھی۔

اِس دِقّت کی طرف سب سے پہلے ہمارے فاضل وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے توجہ فرمائی اور حسبِ منشائے موصوف اس کام کو اچھے پیمانے پر نفاست اور سلیقے سے شروع کیا گیا، مخطوطات اور دیگر علمی نوادر کا سیکشن علاحدہ کیا گیا۔ اس کے لیے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (سلطان جہان منزل) کا وسیع اور خوب صورت

ہال مع گیلری کے حاصل کیا گیا جس کی خوب صورتی اور افادیت میں فنِ تعمیرات کے مشہور جرمن ماہر مسٹر ہائنس نے ضروری ترمیم و اصلاح کرکے معتد بہ اضافہ کر دیا۔ مطالعہ کرنے والوں کی آسائش اور ہال کی زیبائش کے لیے ماہر موصوف نے نئے نئے انداز کے نہایت آرام دہ اور خوب صورت فرنیچر ڈیزائن کیے جو اَب ہال کی زینت بنے ہوتے ہیں۔

اس سیکشن کا انتظام و انصرام مختار الدین آرزو صاحب ایم اے (علیگ) کے سپرد کیا گیا جن کو تحقیقاتِ علمیہ کے صِلے میں اسی سال یونی ورسٹی نے عربی میں ڈاکٹریٹ تفویض کی ہے۔ آرزو صاحب یونی ورسٹی کے بڑے ہونہار اور نہایت نیک نام طالبِ علم رہے ہیں اور اپنی مسلسل علمی و ادبی خدمات کے سبب سے علی گڑھ سے باہر بھی اربابِ علم و ذوق سے رُوشناس ہو چکے ہیں۔ انھوں نے بڑی محنت اور سلیقے سے قدیم نادر مخطوطات، مصوّر اور خوش خط نسخوں، مرصّع اور منقّش کتابوں، مشاہیر کے خطوط اور خطّاطوں کی بے مثل وصلیوں کو چھے ہزار کتابوں کے انبار سے انتخاب کرکے انھیں موزوں مقامات پر نہایت سلیقے سے چُن دیا ہے۔

بجلی کی دودھیا روشنی میں ہال کی فضا، طلوعِ سحر اور شائقینِ علم کا انہماکِ مطالعہ، عبادتِ سحری کا سماں پیش کرتا معلوم ہوتا ہے! چناں چہ یہاں کی مسجد، اسٹریچی ہال، یکّی پارک، سائنس لیبورٹیریز، انجینیرنگ کالج، سوئمنگ باتھ، کرکٹ فیلڈ اور باغات کی طرح مخطوطات اور دیگر نوادرِ علمیہ کا یہ ذخیرہ بھی اب مرجعِ انام ہے!

ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ یونی ورسٹی میں کچھ مہمان آئے ہوئے تھے جن میں خواتین بھی شامل تھیں۔ مجھے اس پر متعین کیا گیا کہ مَیں اُن کو اِن نوادر کی سیر کرا لاؤں۔ آرزو صاحب اس وقت موجود نہ تھے۔ یہ میرے لیے بڑی آزمائش کا موقع تھا، مجھے کیا معلوم کہ شیشے کی اِن الماریوں میں آرزو صاحب نے کہاں پریوں کو اُتارا ہے۔ اور کہاں جنّات قید کر رکھے ہیں۔ کم لوگ جانتے ہوں گے، بشرطے کہ میری طرح وہ بھی معلّم نہ ہوں کہ جو چیز معلوم نہ ہو اس پر گفتگو کرنا کتنا مشکل کام اور دل چسپ مشغلہ ہے!

خیریت یہ ہوئی کہ مرد مہمان قومی قسم کے لوگ تھے جنھوں نے لنچ، خوان یغما سمجھ کر خاصے خشوع وخضوع سے کھایا تھا۔ اس لیے وہ تو ہال میں داخل ہوتے ہی آرام کرسیوں پر مُراقبے میں چلے گئے۔ رہیں خواتین، انھوں نے گفتگو کا کچھ ایسا انداز رکھا گویا نوادر سے تعارف حاصل کرنا اتنا اہم نہ تھا جتنا کہ اُن نوادر سے خود اپنا تعارف کرانا۔ اس وقت مجھے شیفتہ کا ایک شعر بے اختیار یاد آگیا۔

تھوڑا سا میرے حال پہ فرماکے التفات
کرتے رہے وہ اپنی بڑائی تمام شب

اس آزمائش سے چھٹکارا پاتے ہی (اور اب آرزو صاحب بھی آچکے تھے) مَیں نے آرزو صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ تھوڑی سی تکلیف گوارا فرماکر اِن نوادر کی ایک طرح کی خود وضاحتی فہرست مرتب فرمادیں، اس سے نہ صرف اُن بزرگوں اور عزیزوں کو سہولت بہم پہنچے گی جو یہاں آئیں گے، بلکہ وہ حضرات جو دور دراز مقامات پر ہوں گے وہ بھی ان سے متعارف ہوجائیں گے اور فائدہ اٹھائیں گے۔ مَیں نے تو یہاں تک کہا کہ اگر ان نوادر کا ایک نہایت خوب صورت مرتّب اور مصوّر کتابچہ شائع کر دیا جائے تو اس ذخیرے کی اشاعت بھی ہوجائے گی، نیز معززاور علم دوست مہمانوں کو بطور تحفہ پیش کیا جاسکے گا۔

مجھے بڑی خوشی ہے کہ آرزو صاحب نے بڑے شوق اور محنت سے اس ذخیرے کی فہرست مرتّب کردی۔ آیئے جہاں تہاں سے ان کا تعارف مَیں آپ سے کرادوں۔

اس میں سب سے پہلے بعض تاریخی کتابوں کا ذکر ہے، پھر دو ایسے نسخوں کا حال بتایا گیا ہے جو دنیا میں کہیں اور دست یاب نہیں۔ یہ ہیں "حال نامہ" اور "نفائس المآثر"۔ "حال نامہ" بایزید انصاری کی تصنیف اور اس کا تعلق اکبری دَور کی روشنیہ تحریک سے ہے جب کہ نفائس المآثر کے مصنّف علاء الدولہ تھے اور یہ تیمور سے اکبر تک کے زمانے کی تاریخ ہے۔

• نفائس المآثر کو وہ خود ایڈیٹ کر رہے ہیں اور اس طرح دسویں صدی ہجری کی ایک نایاب کتاب سے ارباب علم روشناس ہوسکیں گے۔ پھر ایسے نسخوں کا حال لکھا گیا

ہے جو خود مصنفین کے ہاتھ کے لکھے ہوتے ہیں، ان میں صائب کا دیوان جو بخط صائب ہے، دیکھنے کے لائق ہے۔

اب ایسے نسخوں کی باری آتی ہے جن پر مشاہیر کے دستخط یا تحریریں ہیں، یہاں جہانگیر کی تحریر ملے گی، جامی کی شانِ خط کا اندازہ ہوگا، فیضی کے دستخط اور مہر بھی دیکھنے کو ملے گی جو غالباً کہیں اور آپ نہ دیکھ سکیں گے۔

پھر عربی کتابیں، اِن میں "نہج البلاغہ" کا ایک قدیم نسخہ ملے گا، ایسا قدیم کہ اس سے قدیم تر نسخہ دنیا میں شاید اور کوئی نہ ہوگا اور لطف یہ کہ لکھا ہوا بھی شبیر خرما کی روشنائی سے ہے۔

اب مصوّر اور مرصّع و منقّش نسخوں کی باری آتی ہے۔ اِن میں "کریما" اور "ہفت بند کاشی" دیکھنے کی اور بس دیکھتے ہی رہنے کی چیزیں ہیں۔

قرآن پاک کے نسخوں میں عبد الباقی حدّاد کا لکھا ہوا نسخہ بوسہ دینے اور آنکھوں سے لگانے کے قابل ہے۔ قرآنِ حکیم کے وہ اوراق بھی زیارت کے قابل ہیں جو خطِ کوفی میں لکھے گئے ہیں اور جن میں کاغذ کی جگہ ہرن کا چمڑا استعمال کیا گیا ہے۔

مطبوعات میں "قانون ابن سینا" کا وہ نسخہ دیکھنے کی چیز ہے جو روم میں سولھویں صدی عیسوی میں چھاپا گیا تھا، سر سید کی سن ستاون سے پہلے کی چھپی ہوئی بعض نادر کتابیں بھی یہاں موجود ہیں۔

مکاتیب کا بھی یہاں بڑا اچھا ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے اور بعض تو بڑے اہم اور دلچسپ ہیں۔

وصلیاں آپ کو تقریباً ساری مشہور خطّاطوں کی دیکھنے کو مل جائیں گی۔ یہاں ۴۲ وصلیاں نمائش کے لیے رکھی ہوئی ہیں، پھر بھی آرزو صاحب کو شکایت رہ گئی کہ جگہ کی قلّت کی وجہ سے بہت سی وصلیوں کو وہ جگہ نہ دے سکے۔

تصویریں تھوڑی بہت ہیں، لیکن ان میں ہر قسم اور قماش کے لوگ آپ کو دیکھنے کو مل جائیں گے، یہاں نادر شاہ سے لے کر تانا شاہ تک موجود ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر

کے ساتھ محمد شاہ رنگیلے اور مولانا فخر الدین دہلوی کے پاس طوطی بیگم کی تصویر رکھی ہوئی ملے گی جو محمد شاہ کی محبوبہ تھی۔

اس کے علاوہ سمندر پار کی کتابوں کے فوٹو گراف، مائکرو فلم اور فرامین کے انبار کے ساتھ ساتھ آپ کو روپہلی اور سنہری سکوں کی جھنکار بھی سنائی دے گی۔

آپ نے چاول یا چنے کی دال پر قل ھو اللہ اور پگڑی اور پیرہن پر قرآن پاک لکھے جانے کا ذکر اکثر سنا ہوگا۔ یہاں چاول، چنے کی دال، پیرہن، دستار، سب کچھ موجود ہے۔

امید ہے میرے اس مختصر" پرچۂ ترکیبِ استعمال" سے بہنوں کا بھلا ہوگا"!

تحریکِ پاکستان

کتابوں کی دُنیا میں"!

انگلستان کی مشہور و معروف درس گاہ کیمبرج یونی ورسٹی میں زیرِ تعلیم متحدہ ہندوستان کے اُس مسلمان طالب علم کے تصوّر میں بھی کبھی یہ بات نہ آئی ہوگی کہ وہ ۱۹۲۷ء میں سینۂ ہند پر ایک آزاد مسلم مملکت کے قیام کا جو خواب دیکھ رہا ہے اور جس کا نام اس نے اپنے طور پر "پاکستان" تجویز کیا تھا وہ آگے چل کر نہ صرف مسلمانانِ ہند کی عظیم اکثریت کے متفقہ مطالبے کی صورت اختیار کرے گا، بلکہ بیس سال کے بعد ایک واضح حقیقت کا بھی روپ دھارے گا۔ کیمبرج یونی ورسٹی کے یہ مسلمان طالب علم ضلع ہوشیار پور (مشرقی پنجاب) کے چودھری رحمت علی مرحوم تھے جنھوں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں ایک کتابچہ بعنوان NOW OR NEVER لکھا تھا جس میں اُنھوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ جب ہندوستان آزاد ہو تو اس وقت اس برِ صغیر کے مسلم اکثریت کے خطّوں پر مشتمل ایک آزاد مسلم مملکت کا قیام عمل میں لایا جائے۔ چودھری رحمت علی کی تقسیمِ ہند کی یہ تجویز اگرچہ کوئی نئی تجویز نہ تھی، کیوں کہ ایسی تجاویز جن کا مختصر تذکرہ آیندہ سطور میں کیا جائے گا، ماضی میں مختلف حضرات کی جانب سے پیش کی جاتی رہی تھیں، تاہم لفظ "پاکستان" کی دریافت کے اعزاز کی مستحق صرف اُنھی کی ذات گرامی ہے۔

تحریکِ پاکستان کا پس منظر

تحریکِ پاکستان کے محرکات کیا تھے اور متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کے دل و دماغ

میں ایک علاحدہ مملکت کے قیام کے مطالبے نے کیوں جنم لیا، یہ تاریخ برِصغیر کی ایک طویل اور دردناک داستان ہے جس کی بنیاد ہندو مذہب کے چھوت چھات کے نفرت انگیز فلسفے پر رکھی ہوتی ہے۔ اس مذہب نے جہاں اپنے معتقدین کے ایک گروہ کو نسلی برتری کا اتنا بڑا اعزاز بخشا کہ وہ دیوتاؤں کے ہمسر قرار پائے وہاں اپنے دوسرے پیروؤں کے ساتھ اس قدر ذلّت آمیز اور غیر انسانی سلوک کیا کہ وہ ہزاروں سال گزرنے کے باوجود بھی اپنے آپ کو اس عذاب کے چنگل سے رہا نہ کرا سکے۔ ہندو مذہب کے اس "مقدس" طائفے نے مسلمانوں کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھا۔ زندگی کے ہر مرحلے پر وہ اُن سے اپنی نفرت کا مظاہرہ کرتے رہے حتیٰ کہ اُن کے سائے سے بھی گریزاں رہے اور ان کی یہ پست ذہنیت مسلمان حکمرانوں کے دور میں سیکڑوں برس بہ حیثیت رعایا گزارنے کے علی الرغم بھی جوں کی توں برقرار رہی۔ مسلمان بادشاہوں کے اس احسانِ عظیم کو ہندو تسلیم کریں یا نہ کریں، لیکن یہ ایک ناقابلِ تردید تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان کے مسلم حکمران اگرچہ ہندو راجاؤں سے اُن کی شورہ پشتی اور بدعہدی کی وجہ سے وقتاً فوقتاً برسرِ پیکار رہے، تاہم اُنھوں نے ان شہری آبادیوں کا ہمیشہ تحفظ کیا جو ہندو عوام پر مشتمل تھیں۔ اُنھوں نے ان کی عبادت گاہوں کا احترام کیا اور ان کے مذہب میں ہلکی سی مداخلت سے بھی گریز کیا۔ دوسری طرف ہندوؤں کی تنگ دلی اور کوتاہ نظری کا یہ عالم ہے کہ وہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر اور سیوا جی مرہٹے کے درمیان سیاسی کش مکش کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں کہ مسلمان حکمرانوں کی رواداری اور بے تعصبی کے تمام تر تاریخی مواد کو غارت کرنے پر تُل جاتے ہیں۔ بقول علامہ شبلی مرحوم ؎

اُنھیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ اورنگ زیب ہندو کُش تھا، ظالم تھا، ستم گر تھا

وگرنہ تاریخی پس منظر میں اس مناقشے کی پوری ذمّے داری مرہٹوں پر عائد ہوتی ہے۔ بہرحال سرزمینِ ہند کے مسلمان حکمرانوں نے اپنی ہندو رعایا کے معاملے میں فراخ

حکمِ "لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ" کے تحت جو کچھ کیا، وہ قابلِ تعریف ہے، لیکن اگر وہ قرآن کریم کے دوسرے حکم "بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ" کو بھی پیشِ نظر رکھتے تو آج برِصغیر میں تصویر کا رنگ بالکل مختلف ہوتا۔ ہمیں بہ حیثیت مسلمان، خاندانِ غلاماں سے لے کر خاندانِ مغلیہ تک کے ان تمام بادشاہوں کی اس بے جا رواداری سے ہمیشہ شکایت رہے گی۔ جنھوں نے اپنے دورِ حکومت میں اس حکمِ قرآنی کا احترام نہ کیا اور اسلامی تبلیغ کا جائز فریضہ کما حقہٗ سرانجام نہ دیا۔ ہمارے یہ مسلم حکمران اگر اس اہم اور عظیم کام کا بیڑا اٹھا لیتے تو سات آٹھ صدیاں گزر جانے کے بعد برِصغیر میں ہندو اتنی بڑی عددی اکثریت میں نہ رہ جاتے۔ ہمارے حکمرانوں کی اس کوتاہ نظری اور عاقبت نا اندیشی کے باوجود پاکستان اور بھارت میں جو کروڑوں کی تعداد میں مسلمان نظر آتے ہیں وہ اَدوارِ گزشتہ کے جلیل القدر علما اور محترم المقام صوفیا کی دینی کوششوں اور تبلیغی کاوشوں کا ثمرہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب پر اپنی رحمت کا نزول فرمائے۔

حیدر آباد دکن اور ہندو

غیر معمولی رواداری اور بے جا مروت بعض اوقات اس قدر ضرر رساں ثابت ہوتی ہیں کہ ان کے باعث قوموں کے مقدر بدل جاتے ہیں۔ یہاں ہم مثال کے طور پر ریاست حیدر آباد دکن کا قصہ پیش کرتے ہیں۔ حیدر آباد میں گو مسلمانوں کی حکومت تھی، مگر مسلمان آبادی کا صرف پندرہ بیس فی صد حصہ تھے۔ اس ریاست میں ہندوؤں کی عظیم اکثریت اور اس سے آیندہ پیدا ہونے والے خطرات کو پہلی مرتبہ جس شخص کی عقابی نگاہوں نے بھانپا وہ حیدر آباد کے وزیر اعظم موتید الملک سر علی امام مرحوم تھے جنھوں نے ۱۹۲۱ء میں نظامِ دکن کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ اس مسلمان ریاست میں ہندوستان کے مسلم اکثریت کے علاقوں سے آہستہ آہستہ مسلمان لا لاکر بسائے جائیں تاکہ آبادیوں کا یہ زبردست تفاوت ختم ہو جائے، مگر افسوس کہ نظام نے اپنی

رواداری اور فراخ دلی کا نامناسب مظاہرہ کرتے ہوئے اس اہم تجویز کو رد کر دیا اور سر علی امام بددل ہو کر ریاست سے رخصت ہو گئے، لیکن اس واقعے کے ستائیس اٹھائیس سال بعد ریاست حیدر آباد، نظام دکن اور وہاں کے مسلمان باشندوں کا اکثریت کے ہاتھوں جو حشر ہوا اس پر تاریخ کے صفحات ہمیشہ ماتم کناں رہیں گے۔

متحدہ ہندستان میں مسلمانوں کے اس سات آٹھ سو سالہ دورِ حکومت میں حتیٰ کہ ۱۸۵۷ء میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے وقت تک ہندوؤں کی تمام تر نفرت اور عصبیت کے باوجود جہاں تک عوام کا تعلق تھا ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات ہمیشہ پُرامن ہی رہے۔ شاید یہ حکومتِ وقت کا رعب اور دبدبہ تھا جس نے ہندوؤں میں کبھی یہ حوصلہ پیدا نہ ہونے دیا کہ وہ مسلم اقلیت پر اپنی اکثریت کا بے جا مظاہرہ کریں۔ اور فتنہ وفساد کا بازار گرم کریں۔ ہندو عوام دبے دبے سے رہے اور مسلمانوں سے ہمیشہ خم کھاتے رہے، لیکن ۱۸۵۷ء میں جب مغلیہ سلطنت کا آفتابِ اقبال غروب ہو گیا تو انگریزوں کے زیر سایہ انھیں مسلمانوں کے خلاف کھل کھیلنے کے مواقع میسر آگئے۔

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء اور سر سیّد کا کردار

۱۸۵۷ء کی مشہور جنگِ آزادی کا جسے انگریز نے غدر کے نام سے موسوم کیا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ جنگ صرف انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان ہی لڑی گئی تھی۔ اس جنگ میں ہندوؤں نے واضح طور پر انگریز کا ساتھ دیا۔ اور من حیث القوم مسلمانوں کو جتنا نقصان وہ مالی اور جانی طور پر پہنچا سکتے تھے، پہنچایا۔ ہندوؤں میں بہت کم لوگ تھے جو خلوص اور دیانت کے ساتھ اس کٹھن مرحلے پر مسلمانوں کے ہم رکاب رہے، ورنہ اکثریت کی حیثیت تماشائیوں کی سی رہی۔ جب انگریزوں نے مسلمانوں کو شکست دے کر یہ جنگ جیت لی تو غدار مسلمانوں کے ایک حقیر سے طبقے سے قطع نظر پورے ملک کے مسلمان انگریز کے زیرِ عتاب

آ گئے اور اس وقت یہ حالت ہوتی کہ ؎

جسے دیکھا حاکمِ وقت نے کہا یہ بھی قابلِ دار ہے

یہی وہ وقت تھا جب معتوب و مغضوب مسلمانوں کے مقابلے میں ہندو انگریز کے چہیتے اور محبوب بنے۔ جن حضرات نے مشہور انگریز مؤرخ ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہنٹر کی کتاب OUR INDIAN MUSALMANS (اس کتاب کا ترجمہ بہ عنوان "ہمارے ہندوستانی مسلمان" قیامِ پاکستان سے قبل شائع ہو چکا ہے) ملاحظہ فرمائی ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء میں اقتدار پر قبضہ پا لینے کے بعد انگریز نے مسلمانوں کو تعلیمی، تہذیبی، معاشرتی، سیاسی، غرض کہ زندگی کے ہر میدان میں مفلس و قلاش بنانے میں کس قدر پست اور ظالمانہ کردار ادا کیا جب کہ ہندو ہر لحاظ سے اس کی نگاہِ لطف و کرم سے فیض یاب ہوتے رہے۔ سر سید احمد خان اگرچہ اس زمانے میں سرکاری ملازم تھے، تاہم انھوں نے جرأتِ رندانہ اور ہمّتِ مردانہ سے کام لے کر جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے اسباب و علل پر اگلے برس ہی یعنی ۱۸۵۸ء میں اپنی کتاب "اسبابِ بغاوتِ ہند" لکھ ڈالی جس کی اشاعت نے حاکمانِ وقت کی جبینوں پر بل ڈال دیے۔ چناں چہ برطانوی پارلیمنٹ میں بعض ارکان کی جانب سے مطالبہ کیا گیا کہ اس کتاب کو ضبط کر لیا جائے اور مصنّف کے خلاف سخت کارروائی کی جائے، کیوں کہ اس کتاب میں سیّد صاحب نے ہندستان میں انگریزوں کی پالیسی پر ناقدانہ انداز میں تبصرہ کیا تھا۔ اس مرحلے پر کچھ منصف مزاج ارکان درمیان میں آ گئے ورنہ سر سیّد عتاب کی لپیٹ میں آئے بغیر نہ رہتے۔ بہرحال ۱۸۵۷ء کے بعد کا ماحول ہندوؤں کے لیے بڑا ساز گار تھا اور اُنھوں نے اُس سے فائدہ اٹھانے کی خاطر خواہ کوششیں کیں۔

انگریزی اقتدار اور ہندوؤں کے تین محاذ

چناں چہ اس زمانے میں ہمیں ہندوؤں کے تین طاقت ور گروہ نظر آتے ہیں۔ پہلے گروہ نے انگریزی تعلیم سے بہرہ ور ہو کر انگریز کے زیرِ سایہ اقتدار پر قبضہ جما

لیا اور مسلمانوں کو ملازمتوں کے قریب نہ پھٹکنے دیا، دوسرے گروہ نے مسلمانوں کی مخالفت کے لیے مذہبی میدان کا انتخاب کیا جب کہ تیسرا گروہ حکومت سے باہر رہ کر اپنی قوم کے لیے زیادہ سے زیادہ سیاسی مراعات کا طالب ہوا۔

سوامی دیانند سرسوتی ــ بانی آریہ سماج

سوامی دیانند سرسوتی نے آریہ سماج جیسی متعصب اور فتنہ پرور جماعت کی بنیاد اسی دور میں رکھی۔ سوامی دیانند ایک ہندو مبلغ اور مصلح کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ ابتدا میں اُنھوں نے ہندوؤں میں بت پرستی اور چھوت چھات کے رجحان کی مذمت کی اور اصلاحِ احوال کا بیڑا اٹھایا، لیکن بعدازاں انھوں نے اسلام کی مخالفت کو اپنا مطمح نظر قرار دیا اور اپنی کتاب "ستیارتھ پرکاش" میں قرآن کریم پر ایک سو انسٹھ اعتراضات کیے۔ جن کا پیرایۂ بیان نہایت قابلِ اعتراض اور اشتعال انگیز تھا۔ سوامی دیانند کی دل آزار تقریروں اور "ستیارتھ پرکاش" کی اشاعت سے ملک میں پہلی مرتبہ شدید قسم کے مذہبی اختلافات پیدا ہوئے۔ اور دونوں فرقوں کے درمیان کھلم کھلا دشمنی اور باہمی تصادم کے واقعات رونما ہونے لگے۔

آریہ سماج کی اسلام کے خلاف محاذ آرائی

حالات کو مزید خراب کرنے کے لیے آریہ سماج نے "آریہ" "آریہ مسافر" "آریہ گزٹ" اور "کیسری" اور اسی قبیل کے دوسرے ہفت روزے اور ماہنامے جاری کیے جن کا مقصد اوّلین اسلام کی مخالفت تھا۔ آریہ سماج کے دوسرے رہنماؤں میں آگے چل کر ماسٹر آتما رام نے "ستیارتھ پرکاش" کا اردو میں ترجمہ کیا، پنڈت چموپتی ایم اے نے "رنگیلا رسول" (نعوذ باللہ) جیسی دل آزار کتاب لکھی، دھرم پال نے "ترک اسلام" کے ساتھ "نخل اسلام" اور "تہذیب الاسلام" کی شکل میں زہر چکانی کی اور پنڈت ست دیو نے "کتاب اللہ وید ہے یا قرآن" جیسی خرافات پیش کی جن کی اشاعت سے دونوں قوموں

کے درمیان منافرت عروج پر پہنچی۔

انڈین نیشنل کانگرس کا قیام

سیاسی مراعات کے تحفظ کے نام پر ۱۸۸۵ء میں "انڈین نیشنل کانگرس" قائم ہوئی جس کے بانی امپیریل سول سروس کے ایک ریٹائرڈ انگریز رکن مسٹر اے۔او۔ ہیوم صاحب تھے۔ اس جماعت نے متحدہ قومیت کا لبادہ اوڑھا ہوا تھا، لیکن مسلمان اس میں برائے نام شریک تھے۔ ابتدا میں اس جماعت کے بیشتر ارکان سرکاری نیاز مندوں پر مشتمل تھے، لیکن بیسویں صدی کے شروع میں بال گنگا دھر تلک جیسے انتہا پسند ہندو بھی اس جماعت میں شامل ہو گئے۔ بال گنگا دھر تلک، سیواجی مرہٹے سے بڑے متاثر تھے۔ انھوں نے گنپتی کے نام سے ایک ہندو تہوار کی بنیاد رکھی جس کا مقصد ہندوؤں میں فوجی سپرٹ پیدا کرنا تھا۔ مولانا حسرت موہانی کا شمار محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج علی گڑھ کے ان طلبا میں ہوتا تھا جنھوں نے زمانۂ طالب علمی ہی میں انگریز کی مخالفت کو اپنا شعار بنالیا تھا۔ حسرت کالج سے نکلے تو تلک کا دم بھرنے لگے۔ اس زمانے میں انھوں نے تلک کی شان میں متعدد نظمیں لکھیں جن میں انھوں نے اپنے جذباتِ عقیدت کا والہانہ اظہار کیا تھا۔ اُنھی مولانا حسرت کو جب تلک کے یہ فرقہ پرستانہ خیالات معلوم ہوئے تو ان کے جذباتِ عقیدت کو ٹھیس لگی اور وہ اس جماعت سے الگ ہو گئے۔

بال گنگا دھر تلک اور دوسرے متعصب ہندو اکابر

بال گنگا دھر تلک کا قائم کردہ گروہ کانگرس میں ہمیشہ موجود رہا جس میں بعد ازاں لالہ لاجپت رائے، پنڈت مدن موہن مالویہ، سوامی شردھانند، مسٹر ولبھ بھائی پٹیل، مسٹر مرارجی ڈیسائی، مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن، مسٹر کے ایم۔ منشی اور مسٹر سمپورنانند جیسے متعصب ہندو رہنما شامل ہوتے جو مسلمانوں کے معاملات میں کبھی مخلص نہ تھے یہی وجہ تھی کہ انڈین نیشنل کانگرس سے آہستہ آہستہ قائداعظم محمد علی جناح، مولانا محمد علی،

مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خان اور مسیح الملک حکیم اجمل خان جیسے مسلم اکابر جدا ہونے پر مجبور ہوئے۔ ہندوؤں کے ایک اور گروہ کو کانگرس کی نام نہاد رواداری بھی نہ بھائی اور اُنھوں نے ۱۹۲۵ء میں آل انڈیا ہندو مہاسبھا کی بنیاد رکھ دی جس میں ساورکر، مونجے، جیکار، ہردیال اور بھائی پرمانند جیسی ذہنیت کے لوگوں نے شرکت کی۔ اس جماعت کا نعرہ تھا کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں اور انھیں اس ملک سے باہر نکال دیا جائے۔

سوامی شردھانند اور شدھی تحریک

اس دور میں سوامی شردھانند نے جو آریہ سماجی ذہن رکھنے کے باوجود کانگرس میں شریک تھے کانگرس سے علیحدہ ہو کر آل انڈیا شدھی سنگھٹن کی بنا ڈالی جس نے مسلمانوں کو ارتداد کا نشانہ بنانے کا فتنہ اٹھایا اور ملک کے فرقہ وارانہ حالات کو تہ و بالا کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ تقسیم ہند کی ذمہ دار ہندوؤں کی یہی متعصب اور مشتعل مزاج سیاسی اور مذہبی تحریکیں تھیں جن کے زہریلے اثرات سے متاثر ہو کر ہندوستان کے مسلمانوں میں ہندوؤں سے علاحدگی کا جذبہ پیدا ہوا جو آخر کار ایک مسلسل جدوجہد کے بعد، ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے قیام پر منتج ہوا۔

سر سیّد احمد خاں: ایک دُور اندیش مسلم رہنما

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جس مسلمان رہنما کو ہندوستان کے مسلمانوں کی بدحالی اور کس مپرسی کا سب سے زیادہ احساس ہوا، وہ بابائے علی گڑھ سر سیّد احمد خاں تھے۔ مسلمان تازہ تازہ بازی ہار چکے تھے اور انگریز سے دوبارہ لڑنے بھڑنے کا موقع اب دُور نکل چکا تھا۔ حالات کا تقاضا تھا کہ اب معاملات کو جذبات سے بالا رہ کر سوچا جائے اور ایک خاص حکمت عملی کے تحت اُنھیں طے کیا جائے۔ چناں چہ سر سیّد نے بڑی دانش مندی اور خلوص کے ساتھ اپنا پروگرام مرتب کیا۔ اس وقت اُنھیں دو محاذوں پر جنگ لڑنا

تھی۔ ایک طرف مسلمانوں کو انگریز کے ظلم و ستم اور بے انصافیوں کا نشانہ بننے سے بچانا تھا اور دوسری طرف ہندوؤں کے غلبے اور دست بُرد سے اُنھیں محفوظ رکھنا تھا۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کا قیام اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ چناں چہ وقت آنے پر اسی کالج کے طلبہ نے مستقبل کی تحریکِ آزادی کے رہنماؤں کی شکل میں جنم لیا اور صرف نوّے سال کے بعد برِصغیر سے انگریز اقتدار کی جڑیں اکھاڑ دیں۔ جہاں تک ہندوؤں سے مقابلے کا تعلق تھا اُنھوں نے ۱۸۸۶ء میں یعنی انڈین نیشنل کانگرس کے قیام کے صرف ایک سال بعد ہی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کی بنیاد رکھ دی۔ علی گڑھ میں قائم ہونے والا یہ پہلا ادارہ تھا جس کے ذریعے نہ صرف مسلمانانِ ہند کی تعلیمی و تہذیبی زندگی میں انقلاب آیا، بلکہ اس کی صورت میں مسلمانوں کو اپنے سیاسی مطالبات پیش کرنے کی غرض سے ایک مضبوط پلیٹ فارم بھی فراہم ہوا۔ دراصل سرسید کی دور بین نگاہوں سے یہ امر پوشیدہ نہ رہا تھا کہ ہندو اب آہستہ آہستہ مسلمانوں پر غلبہ پانے کی کوشش کریں گے۔ اسی لیے اُنھوں نے ۱۱ر دسمبر ۱۸۸۷ء کو لکھنؤ میں مسلمانوں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ ہندو اور مسلمان دو علاحدہ علاحدہ قومیں ہیں۔ اگر مستقبل میں مشترکہ انتخابی اِدارے قائم ہوئے تو مسلمان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کے غلام بن کر رہ جائیں گے۔ اُنھوں نے یہ بھی فرمایا کہ کانگرس جیسی جماعت میں شمولیت اختیار کرنے سے مسلمانوں کو من حیث القوم نقصان پہنچے گا۔ اسی زمانے میں اُنھوں نے میرٹھ میں بھی ایک تقریر کی جس میں اُنھوں نے اس امر کا اعادہ کیا۔ کہ کانگرس ایک ایسی سیاسی جماعت ہے جس کا ہر اقدام آیندہ زمانے میں مسلمانوں کے مفادات کے لیے ضرر رساں ہوگا۔ سرسید کی اس قسم کی تقاریر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ خود دو قومی نظریے کے خالق تھے ۱۸۹۸ء کی ابتدا میں سرسید انتقال فرماگئے۔ اس حادثۂ فاجعہ کے مًعا بعد ہی ہندوستان کی سیاست میں ایک اور اہم واقعہ پیش آیا جس نے ہندو مسلم تعلقات میں مزید بدمزگی پیدا کر دی۔

اُردو زبان کے خلاف سازش اور نواب محسن الملک

دونوں قوموں کے درمیان اس تلخی کو ہوا دینے والے یو۔پی کے گورنر میکڈانل تھے۔ جنھوں نے ہندوؤں کے ساتھ سازش کر کے ہندی زبان کو صوبے کی عدالتی زبان قرار دیے جانے کا فیصلہ صادر کیا۔ اس سازش کا مقابلہ سرسید کے جانشین نواب محسن الملک نے بڑی جسارت کے ساتھ کیا۔ انھوں نے اُردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی اور ۱۸ اگست ۱۹۰۰ء کو قیصر باغ لکھنؤ میں مسلمانوں کے ایک عظیم الشان جلسے کی صدارت کی جو اردو زبان کی حمایت میں منعقد کیا گیا تھا۔ اس جلسے میں انھوں نے خود بھی ایک پُر درد اور مؤثر تقریر کی جس کا اختتام انھوں نے اس شعر پر کیا۔

چل ساتھ کہ حسرت دلِ محروم سے نکلے
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اس شعر نے غضب کا کام کیا اور دفورِ جذبات سے سامعین آبدیدہ ہو گئے۔ نواب محسن الملک کے اس دلیرانہ اقدام کا ردِ عمل یہ ہوا کہ میکڈانل ان کا دشمن بن گیا اور سیاسی میدان میں انھیں زک دینے کے منصوبے بروئے کار لانے لگا۔ اُس نے نہ صرف ان کے خطاب "محسن الملک" جو انھیں ریاست حیدر آباد دکن سے ملا تھا کے استعمال پر پابندی عائد کر دی، بلکہ انھیں محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج علی گڑھ کے سیکرٹری کے عہدے سے بھی ہٹانا چاہا۔ میکڈانل کے اس اقدام سے ہندو حلقوں میں گھی کے چراغ جل اُٹھے اور مسلمان بددل ہو گئے۔ بعد ازاں حالات نے کچھ ایسا رُخ اختیار کیا کہ یہ انگریز گورنر اپنے پورے جاہ و جلال کے باوجود نواب محسن الملک کا کچھ نہ بگاڑ سکا، بلکہ ان کا خطاب بھی بحال کرنا پڑا، لیکن ہندی یوپی کی عدالتی زبان تسلیم کر لی گئی۔

نواب محسن الملک نے نہ صرف سرسید کے لگائے ہوتے پودے محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج علی گڑھ کی آبیاری کر کے مسلمانوں کو تعلیم کے میدان میں آگے بڑھایا، بلکہ ان کے دو قومی نظریے کی بھی حفاظت کی۔ ۱۹۰۶ء کے اوائل میں برطانوی پارلیمنٹ کے

بجٹ اجلاس میں وزیر ہند مسٹر مارلے نے جو تقریر کی تھی اس سے مترشح ہوتا تھا کہ حکومت برطانیہ عن قریب ہندوستان کو اصلاحات سے نوازنا چاہتی ہے۔

شملہ وفد

اس خبر کے اخبارات میں گشت لگاتے ہی نواب محسن الملک نے اس زمانے کے تمام سرکردہ مسلمان رہنماؤں کے نام خطوط ارسال کیے اور اُن سے مشورے کے بعد طے پایا کہ ایک وفد مرتب کیا جائے اور متوقع اصلاحات کے موضوع پر ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ منٹو سے ملاقات کی جائے۔ ہندوستان کے پینتیس مسلم مشاہیر پر مشتمل یہی وہ تاریخی وفد تھا جس نے سر آغا خان کی قیادت میں یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو شملے میں لارڈ منٹو سے ملاقات کر کے اپنی معروضات پیش کیں اور بڑی کامیابی سے ملکِ معظم کے نائب کو اپنا ہم خیال بنایا۔ یہ اسی وفد کی کوششوں کا ثمرہ تھا کہ منٹو مارلے سکیم کے تحت ہندوستان میں جو نئی اصلاحات نافذ ہوئیں ان میں مسلمانوں کے حقوق کا بخوبی خیال رکھا گیا اور پہلی مرتبہ ان کے حقوق متعین کیے گئے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام

اس واقعے کے تین ماہ کے بعد ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکے میں آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے مسلمانوں کی ایک خالص سیاسی جماعت قائم کی گئی اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو مسلمانوں کی تعلیمی سرگرمیوں تک محدود کر دیا گیا۔ سر آغا خان آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے اور جن مسلمان اکابر نے اس جماعت کے پہلے اجلاس میں شرکت کی اُن میں نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، نواب سلیم اللہ، سر عبدالرحیم، سر علی امام، مسٹر مظہر الحق سر فضل حسین، سر محمد شفیع، مسٹر حسن امام، نواب عماد الملک، صاحبزادہ آفتاب احمد خان، نواب مزمل اللہ خان، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خان اور اسی مرتبے کے دوسرے بزرگ شامل تھے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام سے کوئی ڈیڑھ سال پیشتر ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن کے

زمانے میں بنگال کو تقسیم کر دیا گیا تھا۔ چوں کہ اس تقسیم سے مسلم اکثریت کا ایک صوبہ عالم وجود میں آتا تھا، اس لیے اس کے خلاف ہندوؤں کی جانب سے ایک مضبوط اور طویل تحریک چلائی گئی تاآنکہ دسمبر ۱۹۱۱ء میں شہنشاہ جارج پنجم کی تشریف آوری کے موقع پر اس تقسیم کو منسوخ کر دیا گیا۔

بندے ماترم

مشہور بنگالی ادیب بنکم چندر چٹرجی نے انھی ایام میں اپنا ناول "آنند مٹھ" لکھا تھا جس میں وہ گیت بھی شامل تھا۔ جسے بندے ماترم کہا جاتا ہے۔ تقسیم بنگال کے خلاف یہ ہندو تحریک دراصل آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کا ردِ عمل تھی اور اس ناراضی کا مظہر بھی کہ منٹو مارلے اسکیم میں مسلمانوں کے مطالبات کیوں تسلیم کیے گئے۔ انگریزی دور میں ۱۹۱۲ء سے لے کر ۱۹۲۱ء تک کا زمانہ ہی ایک ایسا زمانہ ہے جس میں ہمیں ہندو مسلم اتحاد کی چند علامتیں نظر آتی ہیں۔

دو غیر متعصب ہندو رہنما

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس زمانے میں ہندو رہنماؤں میں مسٹر سی آر داس اور مسز سروجنی نائیڈو جیسی بے تعصب اور صاحب دل شخصیتیں سرفہرست موجود تھیں۔ مسٹر سی آر داس تو اس قدر فراخ دل تھے کہ وہ برملا ہندوؤں سے کہتے تھے کہ مسلمانوں کو پچاس فی صد حقوق بھی دینے پڑ جائیں تو دے دیں اور انھیں کسی قیمت پر ناراض نہ کریں۔ اسی دَور میں مسلمانوں کی ولولہ انگیز تحریک "تحریکِ خلافت" جاری ہوئی جس میں ہندو مسلم اتحاد کے بعض روح پرور منظر دیکھنے میں آئے۔ گاندھی جی اور سوامی شردھانند جو ابھی تک کانگرس میں شامل تھے، جامع مسجد دہلی کے منبر پر تقریر کر گئے۔ ہندوؤں نے اپنے جلسے اور جلوسوں میں اللہ اکبر کے نعرے لگائے جب کہ مسلمانوں نے بندے ماترم کے راگ الاپے، لیکن یہ دَور عارضی ثابت ہوا اور جلد ہی دونوں قوموں میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس دَور میں اگرچہ مسیح الملک حکیم اجمل خان، مولانا محمد علی، مولانا شوکت

علی، مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے مسلمان اکابر نے بڑے خلوص اور دیانت کے ساتھ ہندو مسلم تعلقات کو پروان چڑھانے کی کوششیں کیں، مگر ہندوؤں کی منافقت کے سبب کامیابی نہ ہوتی۔ ان حالات میں تقسیمِ ہند کا تصور بعض مسلمانوں کے ذہن میں جگہ پانے لگا یعنی سر سید نے جس بات کو اشاروں میں کہا تھا، یہ لوگ اس بات کو برملا زبان پر لے آئے۔

مولانا عبدالحلیم شررؔ اور تقسیمِ ہند

چناں چہ مشہور تاریخی ناول نگار مولانا عبدالحلیم شررؔ نے ۱۸۹۰ء میں پہلی مرتبہ اپنے ماہنامہ "دلگداز" میں تقسیمِ ہند اور تبادلہ آبادی کا ذکر کیا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مذہبی رسوم ایک دوسرے کے اس قدر متضاد واقع ہوئی ہیں کہ ایک کی ادائی سے دوسرے کے جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں اور معاملہ قتل و غارت تک پہنچتا ہے، اس لیے دونوں قوموں کے مفادات کا تقاضا یہی ہے کہ ہندستان کو ہندو صوبوں اور مسلم صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے اور آبادیوں کا تبادلہ ہو جائے۔

تقسیمِ ہند کا ذکر اور دوسرے مسلم اکابر

۱۹۱۳ء میں مسٹر ولایت علی بمبوقؔ نے جو مولانا محمد علی کے اخبار "کامریڈ" کے سب ایڈیٹر تھے "کامریڈ" کے فکاہی کالم "گپ" میں ایک اسی قسم کی تجویز کا ذکر کیا، گو اس موقع پر یہ بات غیر سنجیدہ الفاظ میں کہی گئی تھی، لیکن کسے معلوم تھا کہ وقت گزرنے پر یہی بات ایک واضح حقیقت کی شکل میں تبدیل ہو جائے گی۔ ۱۹۱۶ء میں ڈاکٹر عبدالجبار خیری ایم اے، پی ایچ ڈی اور اُن کے چھوٹے بھائی مسٹر عبدالستار خیری ایم اے نے جو دہلی کے رہنے والے اور علی گڑھ کالج کے فارغ التحصیل تھے ایمسٹرڈم (جرمنی) میں ہندستانی نوجوانوں کی ایک کانفرنس میں تقسیمِ ہند کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ایک اور ذریعے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خیری برادران نے اس قسم کی تجویز سویڈن کے دارالحکومت اسٹاک ہالم میں منعقدہ سوشلسٹ انٹرنیشنل کانگرس کے ایک اجلاس میں

۱۹۱۷ء میں پیش کی تھی۔ ۱۹۲۰ء میں اخبار ذوالقرنین بدایوں میں گاندھی جی کے نام کھلا خط شائع ہوا جس میں ہندو مسلم مناقشات کے تصفیے کا حل تقسیم ہند کو بتایا گیا تھا۔ اس خط کے لکھنے والے قاضی عزیز الدین احمد بلگرامی تھے جو بعد ازاں ریاست دہتیا کے مشہور دیوان ہوئے۔ قاضی صاحب چوں کہ اس زمانے میں یوپی کی صوبائی سول سروس میں تھے اس لیے انھوں نے اپنے نام کی بجائے اپنے بھائی محمد عبدالقدیر بلگرامی کا نام لکھا۔ ۱۹۲۳ء میں ڈیرہ اسماعیل خاں کے سردار گل محمد خاں نے فرنٹیر انکوائری کمیٹی کے سامنے ہندوستان کو تقسیم کرنے کے دلائل دیے تھے اور کہا تھا کہ مجوزہ مسلم مملکت پشاور سے آگرے تک کے علاقوں پر مشتمل ہونی چاہیے۔ ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الٰہ آباد میں علامہ اقبال نے اپنے خطبۂ صدارت میں مسلمانان ہند کے لیے ایک علاحدہ مملکت کا جو ہندوستان کے شمالی علاقوں پر مشتمل ہوگی، مطالبہ کیا۔ اس اجلاس کے کچھ عرصے کے بعد جن دنوں لندن میں گول میز کانفرنس منعقد ہو رہی تھی، چودھری رحمت علی نے تقسیم ہند کی ضرورت پر زور دیا اور یہ مطالبہ کیا کہ پنجاب، کشمیر، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ایک علاحدہ اسلامی مملکت قائم کی جائے۔ انھوں نے اپنے مطالبے میں یہ بھی تجویز کیا تھا کہ آسام اور حیدر آباد دکن سمیت بنگال کی الگ خود مختار ریاست قائم کر دی جائے جو مجوزہ پاکستان کے ساتھ ملحق ہو۔ تقسیم ہند کے یہ تمام تر مطالبات ابھی تک بے جان اور کمزور سے تھے، لیکن مستقبل قریب میں مسلمانوں کے ان مطالبات کو جس چیز نے بھرپور زندگی سے ہم کنار کیا وہ انڈین نیشنل کانگرس کی مسلم کش پالیسی تھی۔

پیرپور کمیٹی رپورٹ

کانگرس نے ۱۹۳۷ء میں انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت مختلف صوبوں میں وزارتیں سنبھالنے کے بعد مسلم اقلیت کو اپنے ظلم اور جبر کا ایسا نشانہ بنایا کہ وہ چیخ اٹھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ راجہ صاحب پیرپور کے زیرِ صدارت مسلم لیگ نے ایک کمیٹی مقرر کی جس نے یوپی، سی پی، اور بہار میں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کی تحقیقات کی اور ایک جامع

رپورٹ مرتب کی جسے پیرپلور کمیٹی رپورٹ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ان حالات میں ہندوستان کے مسلمان مجبور ہو گئے کہ سرزمین ہند پر اپنے لیے ایک علاحدہ وطن کا پرزور مطالبہ کریں جس میں وہ ایک آبرومندانہ زندگی گزار سکیں۔

قراردادِ پاکستان ۱۹۴۰ء

مسلمانوں کا یہ مطالبہ اب کسی فردِ واحد کا مطالبہ نہ تھا۔ بلکہ کروڑوں دلوں کی دھڑکن بن گیا تھا جس پر آل انڈیا مسلم لیگ نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو اپنے اجلاس منعقدہ لاہور میں مہرِ تصدیق ثبت کردی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے اس مطالبے کی تائید و حمایت میں جہاں قائدِ اعظم اور آل انڈیا مسلم لیگ کے دوسرے چھوٹے بڑے اکابر سینہ سپر رہے اور اپنے خطبات اور تقاریر سے اس اہم موضوع میں زندگی کی روح بھرتے رہے اور ہندو اور انگریز کے مخالفانہ پروپیگنڈے کا منہ توڑ جواب دیتے رہے، وہاں ہمارے اخبارات مثلاً "ڈان" دہلی، "منشور" دہلی، "الامان" دہلی، "وحدت" دہلی، "پاکستان ٹائمز" لاہور، "نوائے وقت" لاہور، "زمیندار" لاہور، "خلافت" بمبئی، "عصرِ جدید" کلکتہ اور "تنویر" لکھنؤ وغیرہ نے قلم کی جس طاقت کا مظاہرہ کیا، وہ ہماری قومی تاریخ کا ایک درخشندہ باب ہے۔

متحدہ ہندوستان میں ہندو مسلم کش مکش کی اس داستان کو جسے میں نے مجمل طور پر گزشتہ اوراق میں بیان کیا پاکستان، ہندوستان اور انگلستان کے بعض ممتاز اہلِ قلم حضرات، اردو اور انگریزی زبانوں میں بڑی وسعت اور تفصیل کے ساتھ موافقانہ اور مخالفانہ انداز میں قلم کی زبان پر لاتے ہیں۔ ان کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ قرار داد پاکستان سے کچھ عرصے قبل شروع ہوا اور اب تک جاری ہے۔

مولانا مودودی: "مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش"

چناں چہ آل انڈیا مسلم لیگ کی نشاۃِ ثانیہ کے ساتھ ساتھ، ۱۹۳۷ء میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش" جلد اول منظرِ عام پر آئی۔ مولانا صاحب

اس کتاب کی جلد سوم کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ یہ کتاب میرے ان مضامین پر مشتمل ہے جو میں نے ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء میں لکھے تھے اس سے پہلے میں نے ۱۹۳۷ء میں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش" جلد اول اور ۱۹۳۸ء میں جلد دوم اور اپنی ایک دوسری کتاب "مسئلہ قومیت" لکھ کر مسلمانوں کو کانگریس کی تحریک اور متحدہ قومیت سے بچانے کی کوشش کی تھی اور "سیاسی کش مکش" حصہ سوم ۴۰۔۱۹۳۹ء میں اس غرض کے لیے لکھی تھی کہ مسلمانوں کی قومی تحریک کو ایک قومی ریاست کے بجائے ایک اسلامی ریاست کے نصب العین کی طرف موڑنے کی کوشش کروں۔"

کنفیڈریسی اوف انڈیا

۱۹۳۹ء میں تحریک پاکستان کی حمایت میں ایک اہم کتاب CONFEDERACY OF INDIA شائع ہوئی جس کے مصنف میجر کفایت علی تھے۔ میجر صاحب چوں کہ ان ایام میں ہندستانی فوج سے منسلک تھے اس لیے انھوں نے اس کتاب کے مصنف کے طور پر اپنا قلمی نام A PUNJABI اختیار کیا۔ اس کتاب کی اشاعت کا تمام تر اہتمام نواب محمد شاہ نواز خاں والئی ممدوٹ نے کیا تھا جو اس زمانے میں پنجاب مسلم لیگ کے صدر تھے۔

تقسیم ہند : کچھ کتابچے

۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان پیش کیے جانے کے بعد تین کتابچے منظر عام پر آئے جن میں مجوزہ پاکستان کی تشکیل کے مختلف منصوبے پیش کیے گئے تھے۔ پہلا کتابچہ حیدرآباد دکن کے ڈاکٹر سید عبد اللطیف کا .... MUSLIM PROBLEMS IN INDIA دوسرا سر سکندر حیات کا OUTLINES OF A SCHEME OF INDIAN FEDERATION. اور تیسرا مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے پروفیسر سید ظفر الحسن اور پروفیسر افضال حسین قادری کا

ALIGARH SCHEME تھا

اسی سال ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اپنا مختصر کتابچہ PAKISTAN لکھا جس میں پاکستان کے متعلق پیش کی جانے والی مختلف اسکیموں کا جائزہ لیا گیا تھا۔ سابق صدر جمہوریہ بھارت نے پاکستان کے متعلق اپنی دوسری کتاب INDIA DIVIDED اُن دنوں لکھی جب وہ ۱۹۴۲ء میں "ہندوستان چھوڑدو" تحریک کے سلسلے میں قید و بند کے مرحلوں سے گزر رہے تھے۔

"چند اہم کتابیں"

۱۹۴۱ء میں جناب عبدالوحید خان (سابق مرکزی وزیر اطلاعات) نے جب وہ لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے "مسلمانوں کی سیاسی زندگی" کے نام سے اپنی کتاب تحریر کی۔ اسی سال پروفیسر اشفاق علی خان "الہمزہ" کے قلمی نام سے اپنی انگریزی کتاب PAKISTAN: A NATION منظرِ عام پر لائے۔ پروفیسر صاحب ان دنوں گورنمنٹ کالج کیمبل پور سے منسلک تھے انھی دنوں مخالفانہ زاویۂ نگاہ سے HINDU MUSLIM QUESTION نامی کتاب شائع ہوئی جس میں ڈاکٹر تاراچند، ڈاکٹر ایشوری پرشاد، مسٹر ایم ایچ سیّد، مسٹر پی سی جین، ڈاکٹر سعید حسن اور ڈاکٹر ایم بی۔ زبید کے مضامین شامل تھے۔ کیلاش چندر کی TRAGEDY OF JINNAH، انٹرنیشنل پبلشرز کی VERDICT ON PAKISTAN اور چودھری افضل حق کی PAKISTAN AND UNTOUCHABILITY بھی انھی دنوں ہی میں شائع ہوئیں۔ چودھری افضل حق کی کتاب کا ترجمہ بعدازاں "پاکستان اور اچھوت" کی شکل میں اردو میں بھی شائع ہوا۔

محمد نعمان زبیری: "مسلم انڈیا"

۱۹۴۲ء میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے مشہور طالب علم مسٹر محمد نعمان زبیری کی کتاب MUSLIM INDIA شائع ہوئی۔ ۴۲۰ صفحات کی ضخامت پر مشتمل اس

کتاب کا مسودہ قائداعظم کی نظر سے گزرا تھا۔ نعمان صاحب نے موضوع پر محققانہ انداز میں قلم اٹھایا تھا اور یہ کتاب اس قابل ہے کہ اسے ہماری یونی ورسٹیوں کے کورس میں شامل کیا جائے۔
اسی سال ڈاکٹر امبیدکر کی کتاب FEDERATION VERSUS FREEDOM بھی شائع ہوئی۔

بیورلے نکلس: "فیصلۂ ہندستان"

۱۹۴۴ء میں برطانوی مصنف مسٹر بیورلے نکلس کی مشہور کتاب VERDICT ON INDIA کی اشاعت ہوئی۔ نکلس نے تحریکِ پاکستان کی حمایت اور قائداعظم کی تعریف کی تھی۔ ۱۹۴۵ء میں اس کتاب کا اردو ترجمہ "فیصلۂ ہندستان" شائع ہوا۔ مترجم مولوی عبدالقدوس ہاشمی تھے۔

قائداعظم: کچھ اہم کتابیں

۱۹۴۵ء میں مسٹر زیڈ اے سلیری کی کتاب MY LEADER اشاعت پزیر ہوئی۔ کتاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قائداعظم کی سوانح حیات ہوگی، مگر حقیقت میں اس کتاب میں قائداعظم کی اس جدّوجہد کا ذکر کیا گیا تھا جو انھوں نے تحریکِ پاکستان کے لیے کی۔ اس کتاب کا ترجمہ بعد ازاں "میرا قائد" کے زیرِ عنوان ہوا جو سلیری صاحب ہی کے قلم سے تھا۔
۱۹۴۶ء میں قائداعظم کی دو ضخیم سوانح حیات لکھی گئیں۔ پہلی کتاب "حیات محمد علی جناح" تھی جس کے مصنف جناب رئیس احمد جعفری تھے، جب کہ دوسری کتاب "سیرت محمد علی جناح" تھی جو جناب سردار محمد خان کی تصنیف تھی۔ اسی سال دیوان رام پرکاش نے STORY OF SIMLA اور CABINET MISSION IN INDIA پیش کیں جو مسلم لیگ کے مخالف زاویۂ نگاہ کی حامل تھیں۔ انھی ایام میں مسٹر اے۔ بی۔ راجپوت نے بھی CABINET MISSION

کے نام سے ایک کتاب اشاعت کے لیے پیش کی تھی۔ مسٹر راجپوت نے مسلم لیگ کی ایک مختصر تاریخ MUSLIM LEAGUE: YESTERDAY AND TODAY بھی ۱۹۴۷ء میں لکھی تھی۔

تحریکِ پاکستان پر تحقیقی کام

یہ تو تھا قیامِ پاکستان سے قبل قلمی کاوشیں سرانجام دیے جانے کا تفصیلی جائزہ، لیکن قیامِ پاکستان کے بعد تحریکِ پاکستان کے محرکات، اُس کا آغاز، اُس کا عروج اور اُس کے کامیابی و کامرانی سے ہم کنارِ انجام کے سلسلے میں پاکستان، ہندوستان اور انگلستان میں جو تحقیقی و تصنیفی کام موافقانہ اور مخالفانہ انداز میں ہوا، اُس کا ذکر کچھ یوں کیا جاسکتا ہے، لیکن پہلے فسادات ۱۹۴۷ء:

قیامِ پاکستان اور فسادات ۱۹۴۷ء

۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کو آخرکار اسلامیانِ ہند کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی اور اس مبارک دن عالمِ اسلام میں پاکستان کے نام سے ایک عظیم مسلم مملکت کا اضافہ ہوا۔ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد مسلمانانِ ہند کو آگ اور خون کے ایک ایسے ہول ناک طوفان سے گزرنا پڑا جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان روح فرسا ایام کی داستان جس انداز میں لکھی جانی چاہیے تھی، نہیں لکھی گئی، تاہم ہمارے بعض اہلِ قلم حضرات نے تاریخ کا یہ تاریک ترین رُخ پیش کر کے حقائق پر سے پردہ اٹھانے کی کامیاب کوششیں ضرور کیں۔ ان نگارشات میں مرتضےٰ احمد خاں میکش کی کتاب "اخراجِ اسلام از ہند"، شاہد احمد دہلوی کی "دِلّی کی بِپتا"، ایم۔ اے۔ باری کی "محشرستانِ ہند"، تاج الدین انصاری کی "خون کی لکیر"، رئیس احمد جعفری کی "خون کی ہولی"، ابراہیم جلیس کی "دو مُلک ایک کہانی"، فرخ امرتسری کی "وہ امرتسر تھا"، خواجہ افتخار احمد کی "جب امرتسر جل رہا تھا" اور مشکور حسین یاد کی "آزادی کے چراغ" قابلِ ذکر ہیں۔ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد اُس زمانے کی حکومت مغربی پنجاب کے محکمہ نشرواشاعت نے بھی کچھ کتابچے شائع کیے تھے جن میں ہندو اور سکھ فرقہ پرست جماعتوں کے عزائم سے پردہ

اٹھایا گیا تھا۔

تحریکِ پاکستان اور انگریز مصنّفین

تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے موضوع پر انگلستان میں شائع ہونے والی کتابوں میں
مسٹر ایلن کیمبل جانسن کی کتاب MISSION WITH MOUNTBATTEN
کو اوّلیت کا شرف حاصل ہے جو ۱۹۵۱ء میں انگلستان میں شائع ہوئی۔ مسٹر جانسن لارڈ
ماؤنٹ بیٹن کے پریس اَتاشی تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب کی بنیاد اپنے نوٹس، خطوط اور
یادداشتوں پر رکھی ہے اور اس کا مقصد محض اس عہد کی داستان بیان کرنا ہے جس عہد
میں ہندستان کو اختیارات منتقل کیے گئے۔ کتاب ۱۹ دسمبر ۱۹۴۶ء سے لے کر ۲۸ جون
۱۹۴۸ء تک کے دَور پر محیط ہے اور کافی دل چسپ ہے۔ اِس کتاب کا ترجمہ اردو زبان
میں بعد ازاں "عہدِ لارڈ ماؤنٹ بیٹن" کے نام سے شائع ہو گیا تھا۔

ایلن کیمبل جانسن کی کتاب کے معاً بعد دو کتابیں اور بھی اشاعت پذیر ہوئیں۔ یہ
کتابیں ہندستان فوج کی مشرقی ہائی کمان کے آفیسر کمانڈنگ لیفٹیننٹ جنرل سر فرانسس
ٹکر کی کتاب WHILE MEMORY SERVES اور مشہور آئی سی ایس
افسر مسٹر پنڈرل مُون جو قیام پاکستان کے وقت ریاست بہاول پور کے وزیر مال تھے کی کتاب
DIVIDE AND QUIT تھیں جن میں قیام پاکستان کے پس منظر کو اُجاگر کیا گیا تھا
اور اس دور کے فسادات کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا تھا۔

تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے موضوع پر انگلستان میں شائع ہونے والی کتابوں میں
مسٹر سائی مونڈز کی کتاب MAKING OF PAKISTAN ایک قابلِ قدر
اضافہ ہے۔ اسی طرح مسٹر لیونارڈ موسلے نے اپنی کتاب LAST DAYS
OF BRITISH RAJ میں برصغیر کی تقسیم پر کھل کر باتیں کی ہیں۔
ہندستان کے مشہور اخبار STATESMAN کے سابق ایڈیٹر مسٹر
ائین سٹیفنز جنھیں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تحریکِ پاکستان کی حمایت کے "جُرم" میں
STATESMAN سے علاحدہ ہونے پر مجبور کر دیا تھا، کی کتاب

PAKISTAN دوسرے مصنفین کی نسبت بڑے منصفانہ انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس موضوع پر سابق گورنر پنجاب سر فرانسس موڈی کی آپ بیتی بھی ایک عمدہ کاوش ہے اور سابق وائسرائے ہند لارڈ ویول کی کتاب WAVELL PAPERS کا تو تعلق ہی تقسیم ہند کے موضوع سے ہے۔

چند سال قبل لارڈ مونٹ بیٹن کا بھی ایک مفصل مضمون انگلستان اور ہندوستان کے اخباروں میں شائع ہو چکا ہے جس میں لارڈ مونٹ بیٹن نے اپنی بدنامی کے داغوں کو دھونے کی کوشش کی تھی۔ حال ہی میں انگلستان کے ایک مؤرخ مسٹر ہوڈسن کی کتاب THE GREAT DIVIDE منظر عام پر آئی ہے۔ مسٹر ہوڈسن نے لارڈ مونٹ بیٹن کے پرائیویٹ کاغذات تک رسائی حاصل کی اور ان وسائل کو بروئے کار لا کر یہ دل چسپ اور معلومات افزا کتاب پیش کی۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ اُسے اردو میں بھی منتقل کیا جائے۔

قائداعظم کی سوانح حیات اور ہیکٹر بولیتھو

مشہور برطانوی سیرت نگار مسٹر ہیکٹر بولیتھو ۱۹۵۳ء میں حکومت پاکستان کی دعوت پر قائداعظم کی مفصل سوانح حیات قلم بند کرنے کے لیے پاکستان آئے تھے۔ چوں کہ مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح مرحومہ نے بعض وجوہ کی بنا پر اُن سے تعاون نہ کیا تھا، اس لیے حکومت پاکستان نے بھی اس منصوبے کو ترک کر دیا، لیکن مسٹر بولیتھو نے ہمت نہ ہاری۔ انھوں نے اس مقصد کے لیے انگلستان، ہندوستان اور پاکستان سے اہم معلومات فراہم کیں اور اپنے طور پر قائداعظم کی ایک سوانح حیات مرتب کر ڈالی جس کا نام انھوں نے JINNAH: CREATOR OF PAKISTAN رکھا۔

کتاب اپنے مواد کے لحاظ سے دل چسپ ہے اور اس میں نہ صرف قائداعظم کا تذکرہ موجود ہے۔ بلکہ تحریک پاکستان پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مسٹر بولیتھو کی اس کتاب کا ترجمہ اردو زبان میں زہیر صدیقی نے "پاکستان کا بانی: محمد علی جناح" کے نام سے کیا تھا۔

تحریکِ پاکستان اور ہندوستانی مصنّفین

قیامِ پاکستان سے قبل گاندھی جی کی آپ بیتی "تلاشِ حق" اور پنڈت جواہر لال نہرو کی خود نوشت "میری کہانی" شائع ہو چکی ہیں، لیکن پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد ہندوستان میں شائع ہونے والی سیاسی آپ بیتیوں کی تعداد میں قابلِ ذکر اضافہ ہوا چنانچہ ہم یہاں ڈاکٹر راجندر پرشاد کی AN AUTOBIOGRAPHY ڈاکٹر رادھا کرشن SEARCH FOR TRUTH ڈاکٹر کھارے کی MY PUBIC MEMOIRS ڈاکٹر جیکر کی STORY OF MY LIFE ڈاکٹر سمپور نانند کی REFLECTIONS AND MEMORIES جسٹس مہاجن کی LOOKING BACK مسٹر کے ایم منشی کی END OF AN ERA اور اندرا گاندھی کی MY TRUTH جیسی کتابوں کا ذکر کر سکتے ہیں جن میں تقسیم ہند کا کسی نہ کسی طور ذکر کیا گیا ہے، لیکن ان کتابوں کی اشاعت سے کافی عرصے پیشتر قیامِ پاکستان کے موضوع سے متعلق ہندوستان میں دو اہم کتابیں اور بھی منظرِ عام پر آئی تھیں۔ یہ کتابیں مسٹر پٹیل کے دستِ راست اور ہندوستانی وزارتِ داخلہ کے اُس وقت کے سکرٹری مسٹر وی پی مینن کی STORY OF THE INTEGRATION OF INDIAN STATES اور TRANSFER OF POWER IN INDIA

مسٹر مینن کی یہ دونوں ضخیم کتابیں اگرچہ ہندوستانی زاویۂ نگاہ کی حامل ہیں، تاہم اس شخص نے ان پر جو محنت کی وہ قابلِ داد ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا شمار ہندوستان کے ان چند ممتاز مسلم رہنماؤں میں ہوتا ہے جنھوں نے برِصغیر کی تقسیم کی آخری وقت تک مخالفت کی، لیکن جب تقسیم ناگزیر ہو گئی تو انھوں نے اُسے تسلیم کرنے میں تامل نہ کیا۔ ان کی وفات (۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء) سے چند ہفتے پہلے اخبارات میں اس قسم کی خبریں شائع ہوئیں کہ وہ اپنی سوانح حیات قلم بند

کر رہے ہیں۔ ان خبروں کی اشاعت کے کچھ عرصے بعد مولانا انتقال فرما گئے۔ کتاب کا معاملہ کچھ دب سا گیا، یہاں تک کہ ان کی پہلی برسی آگئی۔ اس موقع پر ایک انگریزی کتاب منظرِ عام پر آئی جس کا نام INDIA WINS FREEDOM تھا۔ اس کے مصنف مولانا آزاد اور مترجم پروفیسر ہمایوں کبیر تھے۔ ۲۵۲ صفحات کی ضخامت پر مشتمل اس کتاب میں پوری دیانت اور دلیری کے ساتھ ہندستان کے سیاسی رہنماؤں کے کردار کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اور ان کی کمزوریوں کو بے نقاب کیا گیا تھا۔ مولانا کے قلمی احتساب سے گاندھی جی محفوظ رہے اور نہ پنڈت نہرو۔ سردار پٹیل اور کرشنا مینن کا ذکر کرتے ہوئے ان کے قلم کا لب ولہجہ تند و تیز ہو گیا اور ہندستان میں مسلمانوں کے قتلِ عام کا ذمے دار انھوں نے سردار پٹیل کو ٹھہرایا۔ آل انڈیا مسلم لیگ پر بھی انھوں نے تنقید کی۔ اس کتاب کی ابتدا ۱۹۳۷ء میں کانگرس وزارتوں کی تشکیل کے زمانے سے اور انتہا ۱۹۴۸ء کے آغاز میں گاندھی جی کی موت کے سانحے پر ہوتی ہے اور اس میں اندرونِ خانہ کے کچھ ایسے حقائق پر سے پردہ اٹھایا گیا ہے جن سے ہم ابھی تک بے خبر تھے۔

تحریکِ پاکستان اور پاکستانی مصنّفین

ہمارے ہاں شائع ہونے والی اہم کتابوں میں چودھری خلیق الزمان کی کتاب PATHWAY TO PAKISTAN ایک باوقار کتاب ہے۔ چودھری خلیق الزماں کے سیاسی افکار سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، تاہم یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ ایک پرانے سیاسی رہنما ہیں اور انھوں نے اپنی تمام عمر دشتِ سیاست کی سیاحی میں گزاری ہے۔ وہ ایک بڑی مدت تک انڈین نیشنل کانگرس، تحریکِ خلافت اور آل انڈیا مسلم لیگ سے وابستہ رہے اور آزادی کی ان تحاریک میں ان کا کردار ہمیشہ اہم اور جاندار رہا ہے۔ انھوں نے اپنی اس خود نوشت داستانِ حیات میں بڑی تفصیل کے ساتھ متحدہ ہندستان میں آزادی کی تحریکوں کا ذکر کیا ہے اور ان میں مسلمانوں کے طرزِ عمل پر دلچسپ انداز میں بحث کی ہے۔ چودھری صاحب کی اس انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ "شاہراہِ پاکستان"

بھی دیر ہوئی، شائع ہو چکا ہے "شاہراہِ پاکستان" میں خاصے اضافے کیے گئے ہیں اور اس لحاظ سے وہ ایک علاحدہ کتاب بن گئی ہے۔

ظہورِ پاکستان

چودھری محمد علی سابق وزیر اعظم پاکستان، قیامِ پاکستان سے قبل سرکاری ملازم ہونے کے باوجود قائد اعظم کے معتمد تھے اور یہ انھی کا مشورہ تھا کہ متحدہ ہندوستان میں آل انڈیا مسلم لیگ نے وزارتِ خزانہ قبول کر لی تھی۔ چناں چہ مولانا ابوالکلام آزاد نے INDIA WINS FREEDOM میں ایک مقام پر ان کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور اُن کی قابلیت اور خدمات کو سراہا ہے۔ چودھری صاحب نے قیامِ پاکستان کے موقع پر جو کچھ دیکھا اُس کا تذکرہ اپنی کتاب EMERGENCE OF PAKISTAN میں کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء کے دو برسوں کے حالات پر مشتمل ایک اہم سیاسی دستاویز ہے۔

سید نور احمد نے اپنی کتاب "مارشل لا سے مارشل لا تک" میں بڑے دل چسپ انداز میں مارشل لا ۱۹۱۹ء سے لے کر مارشل لا ۱۹۵۸ء تک کے چالیس برسوں کی سیاسی داستان پیش کی ہے۔

سید رئیس احمد جعفری نے پانچ چھے سال ہوتے اپنی کتاب "حیاتِ محمد علی جناح" پر نظرِ ثانی کی اور اس کا ایک نیا ایڈیشن "قائد اعظم اور ان کا عہد" کے زیرِ عنوان شائع کیا۔ اُنھوں نے قائد اعظم کی تقریروں کا ایک مجموعہ "خطباتِ قائد اعظم" کے نام سے بھی شائع کیا۔ اِن کا ایک اور قابلِ فخر کارنامہ RARE DOCUMENTS ہے جس میں بہت سی اہم سیاسی دستاویزات شامل کی گئی ہیں جو فی زمانہ نایاب ہیں۔ دوسرے الفاظ میں RARE DOCUMENTS ایک ایسی کتاب ہے جس کے اوراق میں ہم لارڈ منٹو کی خدمت میں مشہور شملہ وفد کی معروضات، علامہ اقبال کا خطبۂ صدارت آل انڈیا مسلم لیگ الہ آباد، منٹو مارلے اسکیم، مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم، انڈین نیشنل کانگرس کا "ہندوستان چھوڑ دو" ریزولیوشن، سائمن کمیشن، گول میز

کانفرنس، گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء، نہرو رپورٹ، پیرپور کمیٹی رپورٹ، پاکستان ریزولیوشن اور اسی قبیل کی دوسری دستاویز بیک نظر دیکھ سکتے ہیں۔

پاکستان کے مشہور انگریزی شاعر اور مورخ جی۔الانا نے بھی ایک ضخیم کتاب

PAKISTAN MOVEMENT: HISTORIC DOCUMENTS

ترتیب دی ہے۔ جو ہر لحاظ سے قابل مطالعہ ہے اُن کی دوسری قابلِ ذکر کتاب

QUAID-E-AZAM: STORY OF A NATION

ہے جس میں قائداعظم اور تحریکِ پاکستان کے مختلف مراحل کا بڑے سلیقے اور جامعیت کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ "قائداعظم: ایک قوم کی سرگزشت" منصۂ شہود پر آچکا ہے۔

مسٹر ایم۔اے ایچ۔ اصفہانی نے بھی اپنی کتاب QUAID-E-AZAM: AS I KNOW HIM میں قائداعظم سے اپنے مراسم اور روابط کا ذکر کیا ہے اور ان کی زندگی کے کچھ اہم واقعات پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ اس کتاب کا اُردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے بھی تحریکِ پاکستان کے موضوع پر دو کتابیں لکھی ہیں ان میں سے پہلی کتاب MUSLIM COMMUNITY OF INDO PAK SUBCONTINENT ہے جس کا اردو ترجمہ "پاک و ہند کی ملّتِ اسلامیہ" کے نام سے دستیاب ہوتا ہے۔ اُن کی دوسری کتاب STRUGGLE FOR PAKISTAN ہے۔

ملک سر فیروز خاں نون سابق وزیراعظم پاکستان نے اپنی آپ بیتی FROM MEMORY میں اپنی زندگی کے دوسرے واقعات کے ساتھ ساتھ تحریکِ پاکستان سے متعلق اپنی کاوشوں کا بھی جائزہ لیا ہے "چشم دید" کے زیرعنوان اس کتاب کا اُردو ایڈیشن بھی منظرِعام پر آچکا ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے نقیب روزنامہ "منشور" دہلی کے ایڈیٹر سید حسن ریاض نے

جن دنوں جامعہ کراچی کے شعبۂ صحافت سے منسلک تھے اپنی کتاب "پاکستان ناگزیر تھا" مرتب فرما کر تحریکِ پاکستان پر ہمارے ہاں شائع ہونے والی کتابوں میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔

جناب مختار مسعود کی مرتبہ کتاب **EYE WITNESS OF HISTORY**

ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل قائدِ اعظم کے نام چوالیس خطوط اور چار تار دں کا اہم مجموعہ ہے۔ مکاتیب نگار حضرات میں ہمارے مشاہیر سیاستدان سر آغا خان، نواب صاحب چھتاری، مسٹر سہروردی، سر سکندر حیات خاں، نواب مشتاق احمد گورمانی، میاں احمد یار خان دولتانہ، مسٹر غلام رسول بیرسٹر، ملک برکت علی بیرسٹر، خواجہ حسن نظامی نواب صاحب ممدوٹ، سر شفاعت احمد خان، مولانا احمد سعید، چودھری افضل حق، شیخ صادق حسن، میاں محمد شفیع (م ش) میاں بشیر احمد اور مسٹر راج گوپال اچاریہ شامل ہیں۔

اقبال کے آخری دو سال

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کی کتاب "اقبال کے آخری دو سال" سے اگر چہ یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ کتاب حضرت علامہ مرحوم کی زندگی کے آخری دور کے متعلق ہوگی، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ کتاب آل انڈیا مسلم لیگ کی نشاۃِ ثانیہ کے ابتدائی دو برسوں ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء کے احوال و کوائف پر محیط ہے اور اس میں فاضل مصنف نے اس دور کا بڑی خوبی سے جائزہ لیا ہے۔ ان کی دوسری کتاب "ہماری قومی جدو جہد" میں ان سیاسی واقعات کی نشاندہی کی گئی ہے جو ملتِ اسلامیہ کو ۱۹۳۸ء میں پیش آئے۔

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ان دنوں لندن میں قیام فرما ہیں اور تحریکِ پاکستان پر اپنی دوسری کتابیں مرتب کرنے میں مصروف ہیں۔

پروفیسر جمیل الدین احمد: کچھ اہم کتابیں

ممتاز صحافی اور مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے سابق پروفیسر جمیل الدین احمد نے

جو کسی زمانے میں الحاج خواجہ ناظم الدین سابق وزیر اعظم پاکستان کے پرسنل اسسٹنٹ تھے اور بعد ازاں کراچی یونی ورسٹی سے منسلک ہو گئے تھے، تحریک پاکستان پر گراں قدر تحقیقی کارنامے انجام دیے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی کتاب EARLY PHASE OF FREEDOM MOVEMENT میں مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر سے لے کر ۱۹۱۶ء تک کے دور کا مجمل طور پر جائزہ لیا ہے ان کی دوسری کتاب MIDDLE PHASE OF FREEDOM MOVEMENT ۱۹۱۷ء تا ۱۹۳۷ء کے واقعات پر مشتمل ہے۔ اور ان کی تیسری کتاب FINAL PHASE OF FREEDOM MOVEMENT میں ۱۹۳۸ تا ۱۹۴۷ء کی سیاسی داستان بیان کی گئی ہے۔ اپنی ان تین اہم کتابوں کے علاوہ اُنھوں نے قائداعظم کی تقریروں اور تحریروں کے مجموعے دو جلدوں میں نہایت محنت سے مرتب کیے ہیں جو SPEECHES AND WRITINGS OF QUAID-E-AZAM کے نام سے مشہور ہیں۔

پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی نے بھی HISTORY OF FREEDOM MOVEMENT کے عنوان سے اب سے چودہ پندرہ سال پہلے پانچ چھے جلدوں میں "تاریخ آزادی کے موضوع پر تحقیقی مقالوں کا ایک مجموعہ شائع کیا تھا جو مختلف اہل علم حضرات کے رشحات قلم کا نتیجہ تھا۔

مولانا آزاد کی کتاب INDIA WINS FREEDOM کی اشاعت کے کوئی چھے ماہ بعد لاہور سے ایک کتاب" آزادی ہند" شائع ہوئی جسے مولانا آزاد کی کتاب کا ترجمہ ظاہر کیا گیا تھا اور جس کے مترجم رئیس احمد جعفری تھے" آزادی ہند" کے متعلق ناقدین کی رائے ہے کہ اُسے کسی طور پر بھی مولانا آزاد کی کتاب کا ترجمہ نہیں کہا جاسکتا تاہم یہ کتاب مولانا آزاد کی کتاب کی بگڑی ہوئی تلخیص ضرور ہے۔

INDIA WINS FREEDOM کا مکمل ترجمہ بعد ازاں پروفیسر محمد مجیب شیخ الجامعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے کیا جو" ہماری آزادی" کے نام سے موسوم ہوا۔

"تقسیمِ ہند"

جناب عبدالوحید خان سابق مرکزی وزیر اطلاعات نے مولانا آزاد کی کتاب کا جواب اردو میں "تقسیم ہند" کی شکل میں لکھا اور انگریزی میں **INDIA WINS FREEDOM: THE OTHER SIDE** ترتیب دی جو موضوع پر خاصی کام یاب کوشش ہے۔

چودھری حبیب احمد نے اپنی کتاب "تحریک پاکستان اور نیشلسٹ علما" میں تحریک پاکستان کے مختلف مدارج پر بڑے شرح و بسط کے ساتھ گفتگو کی ہے، لیکن اُنھوں نے اپنی کتاب میں ان علما کے کردار کو بڑی گہری تنقید کا نشانہ بنایا ہے جنھوں نے انڈین نیشنل کانگرس، مجلس احرار اور جمعیۃ العلمائے ہند میں شریک ہو کر تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی۔

جناب عارف بٹالوی کی کتاب "تاریخ مسلم لیگ" اپنے موضوع پر ایک مختصر سی کتاب ہے حالانکہ اس موضوع پر بڑی وسعت سے لکھے جانے کی گنجائش موجود تھی۔

لارڈ منٹو کا عہد

ہندُستان کے مشہور گورنر جنرل لارڈ منٹو کا عہد ہماری قومی تاریخ میں اس لحاظ سے اہم اور مبارک ہے کہ اس میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اگرچہ اس عہد کی یادداشتوں کو لارڈ منٹو کی بیگم صاحبہ اپنی ایک مستقل تصنیف میں قلم بند کر چکی ہیں تاہم ضرورت تھی کہ مسلم زاویۂ نگاہ سے اس دور کا تفصیلی طور پر جائزہ لیا جائے۔ چناں چہ گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبۂ تاریخ کے سربراہ ڈاکٹر سید رضی واسطی نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور

LORD MINTO AND THE INDIAN NATIONALIST MOVEMENT

جیسی معرکہ آرا کتاب پیش کی۔

سیّد شریف الدین پیرزادہ : چند تحقیقی کارنامے

سیّد شریف الدین پیرزادہ سابق وزیر خارجہ پاکستان نے اپنی کتاب EVOLUTION OF PAKISTAN میں جو ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی تھی قدیم ہندوستان کی تاریخ سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کے طویل دور کا جائزہ بڑی محنت اور جانفشانی کے ساتھ لیا ہے اور ان عوامل کی نشان دہی کی ہے جو مسلمانوں کو ہندوؤں سے علاحدہ کرنے کا سبب بنے۔ اُنھوں نے اپنی اس کتاب میں تقسیم ہند کی ان تمام تجاویز پر بھی بحث کی ہے جو وقتاً فوقتاً ہندوستان کے مسلمانوں کی جانب سے پیش کی گئیں۔ پیرزادہ صاحب کی کتاب کا اُردو ترجمہ "پاکستان منزل بہ منزل" شائع ہو چکا ہے۔ پیرزادہ صاحب اپنی بے انتہا مصروفیت کے باوجود تحریک پاکستان پر گرانقدر علمی کارنامے سرانجام دے رہے ہیں۔ جہاں چہ ان کی کتابوں PAKISTAN RESOLUTION AND QUAID-E-AZAM JINNAH'S CORRESPONDENCE اور HISTORIC LAHORE SESSION کی اشاعت کے بعد حال ہی میں ان کی ایک اور ضخیم اور قابل مطالعہ کتاب FOUNDATIONS OF PAKISTAN دو جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ پہلی جلد میں آل انڈیا مسلم لیگ کی دستاویزات متعلقہ زمانہ ۱۹۰۶ء تا ۱۹۲۴ء کو سمیٹا گیا ہے اور دوسری جلد میں ۱۹۲۵ء تا ۱۹۴۷ء کی دستاویزات پیش کی جائیں گی۔

گذشتہ دنوں نیشنل پبلشنگ ہاؤس کراچی نے لطیف احمد شیروانی کی اہم کتاب PAKISTAN RESOLUTION TO PAKISTAN شائع کی ہے تین سو صفحات کی اس کتاب میں فاضل مصنف نے اُن سات برسوں کی مفصل سیاسی رُوداد بیان کی ہے جو ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان سے شروع ہو کر ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان پر ختم ہوئی۔

نامۂ اعمال

آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن اور ہمارے بزرگ سیاست دان نواب سر محمد یامین خان کی ضخیم آپ بیتی "نامۂ اعمال" چند سال ہوئے دو جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ نواب صاحب نے اپنی اس خود نوشت داستان میں متحدہ ہندستان کے گزشتہ نصف صدی کے تمام سیاسی ہنگاموں کا دل چسپ پیرایے میں ذکر کیا تھا۔ چوں کہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کی عاملہ کے ایک سرکردہ رکن تھے اس لیے ان کی کتاب میں اندرون خانہ کی بہت سی کہانیاں شامل ہو گئی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ سب واقعات ایسے ہیں جن کا مجھ کو ذاتی علم ہونے کی وجہ سے اور میری ڈائری، اسمبلی کی مطبوعہ کتابیں، اخبارات کے کٹنگ، خطوط، دعوت نامے، فوٹو گراف، آنکھوں دیکھے واقعات، مسلم لیگ پارٹی کے جلسے اور قرار دادیں میرے پاس ہونے کی وجہ سے میں نے یہ یادداشتیں تحریر کر دی ہیں۔ میری رائے میں "نامۂ اعمال" ایک ایسی سیاسی داستان ہے جس کا انداز بیان ایک دل چسپ ناول کی طرح پر کیف ہے اور اُسے بار بار پڑھا جاسکتا ہے۔ ۱۹۵۵ء میں یوم پاکستان کے موقع پر محکمہ تعمیر نو حکومت مغربی پاکستان نے ایک خوب صورت البم "نمودِ سحر" شائع کیا تھا جس میں تحریک پاکستان کے مختلف ادوار کو یادگار تصاویر کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔

تو یہ تھا تحریکِ پاکستان کی موافقت اور مخالفت میں شائع ہونے والی کتابوں کا تفصیلی تذکرہ لیکن ان کے بعد بھی جو اہم کتابیں اس موضوع پر شائع ہوئیں اُن کا ذکر مجمل انداز میں یوں کیا جاسکتا ہے:

بے تیغ سپاہی (نواب صدیق علی خاں) محمد بن قاسم سے محمد علی جناح تک (شفیق بریلوی) اساس پاکستان (خلیل اللہ) ماڈرن مسلم انڈیا (ایس۔ ایم۔ اکرام) تحریک پاکستان میں اردو کا حصہ (معین الدین عقیل) یاد ایام (میاں امیر الدین) آزادی کی کہانی: میری زبانی (سردار عبد الرب نشتر) تحریک پاکستان کا پس منظر۔ (سید انوار

ہاشمی) تحریکِ پاکستان میں خواتین کا حصہ (نور الصباح بیگم) داستانِ پاکستان (چودھری نذیر احمد) حیاتِ پاکستان (وزیر علی) مطالعۂ پاکستان (ڈاکٹر صفدر محمود) پاکستان کے تیس سال (زاہد حسین انجم) تحریکِ پاکستان اور اُس کا پس منظر (سیّد اصغر علی شاہ جعفری) تصوّرِ پاکستان سے قراردادِ پاکستان تک (سرفراز حسین مرزا) قائدِ اعظم اور تحریکِ پاکستان (ڈاکٹر وحید قریشی) حصولِ پاکستان (پروفیسر احمد سعید) تحریکِ پاکستان میں خواتین کا کردار (شمیم جالندھری) قیامِ پاکستان کا تاریخی و تہذیبی پس منظر (سمیع اللہ قریشی) قائدِ اعظم اور آزادی کی تحریک (جیلانی کامران) تاریخِ پاکستان (محمد علی چراغ) تحریکِ پاکستان میں طلبہ کا کردار (مختار زمن) پاکستان کیوں ؟ (ڈاکٹر صفدر محمود) پاکستان (مغیث خلیلی) پاکستان (سیّد انیس الدین رضوی) پاکستان (سیّد سرور شاہ گیلانی) پاکستان : پس منظر و پیش منظر (حمید انور) پاکستان کی نام ور خواتین (عزیز جاوید) پاکستان کی طرف (مبشر مخدومی فیروزپوری) پاکستان کی مشہور شخصیتیں (نور الصباح بیگم اور پاکستان کی قیمت (منشی عبدالرحمٰن خان)

تحریکِ پاکستان کے موضوع پر حال ہی میں دو قابلِ ذکر اور ضخیم کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں :

عظیم قائد : عظیم تحریک

پہلی اہم کتاب "عظیم قائد : عظیم تحریک" ہے جو حال ہی میں دو ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے جسے ملتان کے معروف ایڈوکیٹ جناب ولی مظہر نے پانچ برسوں کی طویل تحقیق اور محنتِ شاقّہ کے بعد ہمارے علمی، تعلیمی اور سیاسی حلقوں کے سامنے پیش کیا ہے اور تلاش و کاوش کا حق ادا کر دیا ہے۔ "عظیم قائد : عظیم تحریک" میں ایک ہزار بڑے صفحات کے علاوہ سیکڑوں نایاب تصاویر، نادر دستاویزات، برجستہ اشعار، فاضل علما کے کم یاب فتاوے اور برمحل تراشوں کا قابلِ ذکر ذخیرہ موجود ہے جس سے یہ کتاب تحریکِ پاکستان پر ایک مستند انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ اس لحاظ سے اس کتاب کا مطالعہ نہ صرف ہر پاکستانی کے لیے ضروری ہے بلکہ ہر اُس شخص کے لیے بھی جسے پاکستان کی تاریخ اور سیاست

سے کچھ بھی دل چسپی ہے۔

تاریخ کا سفر

دوسری بلند پایہ کتاب "تاریخ کا سفر" ہے جو تیرہ سو صفحات کی ضخامت پر مشتمل دو علاحدہ علاحدہ جلدوں میں بہ زبانِ انگریزی VOYAGE THROUGH HISTORY جناب مسرت حسین زبیری کے قلم سے ہے۔ زبیری صاحب کا شمار ہماری سول سروس کے نہایت ممتاز اراکین میں ہوتا ہے۔ حکومتِ ہند میں وہ پہلے مسلمان اسسٹنٹ سیکرٹری تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ بہاول پور اور پشاور ڈویژنوں کے کمشنر رہے۔ پھر ایک طویل مدت تک اُنھوں نے وزارت مواصلات کے سیکرٹری کے فرائض انجام دیے۔ بعدازاں وہ آر۔سی۔ڈی کے سیکرٹری جنرل مقرر ہو گئے اور اس عہدے کو پوری ذمّے داری کے ساتھ نبھایا۔ ان گوناگوں سرکاری مصروفیات کے دوران ان کے مطالعے اور تجربے نے اُن کو وہ مقام بخشا کہ جب اُنھوں نے اپنی یہ داستان قلم بند کی تو وہ بلاشبہ پاکستان کی تاریخ کا عنوان بن گئی۔ اُن کی اس کتاب کے مطالعے سے بہت سے دبیز پردے اٹھتے ہیں، بہت سے پوشیدہ گوشے بے نقاب ہوتے ہیں اور بہت سے اہم حقائق سامنے آتے ہیں۔

ہم یہاں محترم حکیم محمد سعید صاحب کے بھی بے حد ممنون ہیں جنھوں نے ہماری معلومات کے مطابق جناب مسرت حسین زبیری کو اس اہم تاریخی کتاب کی ترتیب و تسوید پر مائل کیا اور پھر اُسے اپنے گراں قدر ادارے "ہمدرد فاؤنڈیشن" کی جانب سے شائع بھی کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کتاب "تاریخ کا سفر" کو نہ صرف پاکستان میں بلکہ دُنیا بھر میں شہرت حاصل ہوئی اور اُسے ایک کامیاب سیاسی آپ بیتی کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ (ختم شُد)



کوائف نامہ

کتاب: گزرا ہوا زمانہ

موضوع: آپ بیتی / جگ بیتی

مصنف: عبدالمجید قریشی

پتا: "القریش" 48/W، نیو ملتان 60650

فون: 061-222555 - 564060

دیگر تصانیف: (۱) ذکرِ علی گڑھ ناشر مکتبہ اردو ڈائجسٹ، لاہور

(۲) کتابیں ہیں چمن اپنا ناشر ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، کراچی

زیر طبع: (۱) یہ کس کی خاطر خون بہا (فسادات 1947) (۲) تحریک علی گڑھ (شخصیات و واقعات)

(۳) مہرِ گم گشتہ (مشاہیر پاک و ہند کی اہم آپ بیتیاں) (۴) شکاری شکار (شکاریاتی کہانیاں)

مضامین جن کتابوں میں شامل ہوئے:

(۱) یادِ شاہد - مرتبہ مقبول جہانگیر مرحوم - ناشر مکتبہ اردو ڈائجسٹ، لاہور

(۲) رئیس احمد جعفری شخصیت اور فن - مرتبہ ابو سلمان شاہجہانپوری

ناشر رئیس احمد جعفری اکیڈمی، کراچی

رسائل جن میں مضامین شائع ہوتے رہے:

اردو ڈائجسٹ، لاہور - قومی ڈائجسٹ، لاہور - سیارہ ڈائجسٹ، لاہور - سیارہ، لاہور - قندیل، لاہور - چٹان، لاہور - تہذیب، کراچی - کتابی دنیا، کراچی - اسٹیشنرز، کراچی - پولیس میگ، ملتان - ہلال، راولپنڈی - جامعہ، دہلی - الزبیر، بہاول پور - وغیرہ وغیرہ

مقرر:

ریڈیو پاکستان بہاولپور

ریڈیو پاکستان ملتان